فکشن کا صغیر رحمانی

(صغیر رحمانی کے افسانے)

ترتیب و تقدیم

انجم پروین

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

فکشن کا صغیر رحمانی

FICTION KA SAGHEER RAHMANI

Compiled by
Anjum Parveen

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86486-48-6
₹ 300/-

کتاب : فکشن کا صغیر رحمانی (صغیر رحمانی کے افسانے)
ترتیب وناشر : انجم پروین
پتا : شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (ہندوستان)
موبائل نمبر : 0091-9634556558
ای میل : anjumparveen1491@gmail.com
طلوع اول : ۲۰۱۷ء
قیمت : ۳۰۰ روپے
تعداد : ۵۰۰
صفحات : ۲۷۲
کمپوزنگ : محمد وسیم اکرم، رانچی +91-8252169678
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

فکشن کا صغیر رحمانی/انجم پروین

انتساب

والدین کے نام

فہرست

☆	فکشن کا صغیر رحمانی	انجم پروین	09
1	شہزادے کی پریم کہانی		62
2	واپسی سے پہلے		71
3	چھوتی تی تی تا		92
4	ایک اور وہ		111
5	بو		118
6	حبشی کی آدھی شلوار		130
7	کائی		141
8	مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ		153
9	مونا		166
10	داڑھی		183

11	چائمس	199
12	ناف کے نیچے	213
13	بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں	232
14	میں، وہ اور جہانوی	245
15	پہلا گناہ	256

فکشن کا صغیر رحمانی

کائنات کی ہر شئے خواہ جاندار ہو یا بے جان متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ یہی تحرک انسانی زندگی کا خاصہ ہے چونکہ ادب زندگی کا ایک ناگزیر شعبہ ہے، جس میں انسانی زندگی کی اسی حرکت پذیری کے مختلف اور متنوع شیڈس دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں ادب سے میری مراد اردو ادب ہے جس کا دامن دیگر زبانوں کے ادب کے برعکس متفرق جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ اردو ادب میں جہاں شاعری کی اہمیت و مقبولیت مسلم ہے وہیں اردو نثر کا بھی اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔ نثری ادب میں اردو فکشن اپنی دلکشی ہمہ گیریت، وسعت اور تنوع کے اعتبار سے ہمیشہ ادبی حلقہ کی توجہ کا مرتکز رہا ہے۔ خلط مبحث سے بچنے کے لیے بیشتر ناقدین اردو فکشن میں ناول اور افسانہ کو ہی شامل فہرست رکھتے ہیں۔

اگر ہم اردو افسانہ کی ابتدا اور تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا غالباً ۱۹۰۳ میں ہوئی اور ۲۰۰۳ میں یہ اپنی عمر کے سو سال مکمل کر چکا ہے اور مختلف پیچیدہ مراحل سے گزرتے ہوئے تا حال اس کا سفر پوری قوت سے جاری ہے۔ اس ارتقائی سفر میں اردو افسانہ میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، باد مخالف سے دست و گریباں ہوتے ہوئے اس کی سمت و

رفتار سست تو پڑی البتہ تھمی کہیں نہیں۔راشدالخیری، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند وغیرہ کے خیالات اور قلم کا ساتھ دیتا ہوا یہ بتدریج آگے بڑھتا رہا۔متعدد ادبی تحریکات اور رجحانات کی ہمنوائی بھی کی۔لیکن کبھی بھی کسی ایک حلقۂ اثر میں مقید نہیں رہا۔جب بھی کسی نظریہ یا رجحان نے اس کو اپنے حصار میں جکڑنے کی کوشش کی یہ چھٹپٹا کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔عرض مطلب یہ ہے کہ صنف افسانہ کافی وسعت، ہمہ گیریت اور گہرائی و گیرائی کی حامل ہے۔بدلتے عہد کے ساتھ اس نے بھی بہت سی کروٹیں لیں، یہ تبدیلی کئی سطحوں پر قابل التفات ہے۔موضوع کے حوالے سے بھی، اسلوب اور طرز تحریر کے مطابق بھی، وقوعے اور تکنیک کی سطح پر بھی تنوع کی حامل ہے۔

ہر عہد کے اپنے کچھ لوازم اور اختصاص ہوتے ہیں جس کے نقوش اس عہد کی تخلیقات میں بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔لہٰذا ہر عہد کے عصری رجحانات اور ادبی تحریکات کے زیر اثر اعلیٰ درجے کے افسانے وجود میں آئے۔ابتدائی دور کے افسانوں کو دیکھا جائے تو اندازا ہوتا ہے کہ وہ اصلاح پسندی، حب الوطنی اور رومانیت پرستی جیسے عناصر کے پابند نظر آتے ہیں۔جن میں زندگی کا حسن پوری آب و تاب کے ساتھ کارفرما ہے۔اس کے کچھ عرصے بعد واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری کا آغاز ہوتا ہے اور ۱۹۳۲ میں 'انگارے' اپنی تمام تر شعلہ انگیزیوں اور جولانیوں کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے۔جس نے اردو افسانے کو ایک نئی فکر، نئے وژن سے روشناس کرایا، وہیں دوسری طرف پریم چند ایک لازوال افسانہ 'کفن' بطور شاہکار پیش کرتے ہیں۔ان دونوں اقدام سے افسانے کی ٹھہری ہوئی سطح ایک دم متحرک ہو اٹھتی ہے۔جو بعد کی نسل کے لئے ایک روشن مینارہ کا کام کرتی ہے۔یہیں سے اردو افسانے کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو (۱۹۳۶) 'عہد زریں' کہلاتا ہے۔اس عہد میں ترقی پسندوں نے افسانے کو اتنی وسعت دی کہ یہ دوسری زبانوں کے افسانوی ادب کے مقابل

جا کھڑا ہوا۔ اس دور کا افسانہ سماج میں ہو رہی تبدیلیوں کا بہترین عکاس ہے۔ اس عہد کے ممتاز افسانہ نگاروں میں منٹو، بیدی، عصمت، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، دیویندر ستیارتھی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں فکری وفنی سطح پر بھی تنوع ملتا ہے اور موضوعات و اسلوب کے مختلف شیڈس اور تکنیک میں بھی تجربے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ تک آ کر جب ملکی سطح پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تو سماج و معاشرہ اور انسانی زندگی میں تغیر کیونکر نہ ہوتا۔ لہٰذا تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت نے نہ صرف فرد واحد بلکہ پورے ہندوستانی سماج، تہذیب و معاشرت اور انسانی اقدار کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ تقسیم کو اردو افسانے کا سب سے بڑے محرک اور اہم موضوع کے طور پر برتا گیا۔ ہجرت کے کرب، ناسٹلجیائی فکر، تہذیب و اقدار کا زوال، انسانیت کے فقدان، کرب ذات، شناخت کا مسئلہ، تہذیب کی بازیافت، جیسے مسائل پر اس عہد کے فنکاروں نے شعوری اور غیر شعوری سطح پر بے شمار افسانے صفحۂ ہستی پر منتقل کیے۔ اس ضمن میں ممتاز شیریں کا کہنا ہے کہ:

> ”ہمیں اپنے گرد و پیش کی زندگی میں ہر طرف فسادات کے بھیانک اثرات نظر آتے ہیں۔ فسادات نے زندگی کو تہ بالا کر دیا تھا اس لیے فسادات نے ہمارے ادب پر صرف اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ ادب پر اس طرح چھا گئے کہ عرصہ تک اور کسی موضوع پر شاذ ہی لکھا گیا۔“

سانحۂ تقسیم ہند کے بعد مذکورہ مسائل و مصائب نے اظہار خیال کے لیے افسانے میں مختلف وسائل اور وجودی اسالیب کی اہمیت و ضرورت کو ناگزیر قرار دے دیا۔ اس دور میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، قدرت اللہ شہاب اور حیات اللہ انصاری وغیرہ کے یہاں موضوعات اور اسالیب میں کافی تنوع ملتا ہے۔ اس عہد میں افسانے کی

کرافٹ، ہیئت اور اظہار کی مختلف نوعیتوں اور تجربوں کے لئے راہیں ہموار ہونے لگیں۔ تمثیل، تشبیہ، استعارہ تجرید اور علامت وغیرہ کو افسانے کے فنی لوازم کے طور پر برتا جانے لگا۔ ۱۹۶۰ تک آتے آتے افسانہ نے بغاوت اور انقلاب کی جو مشعل جلائی تھی وہ سرد پڑنے لگی اور اب افسانہ ایسے دوراہے پر ایستادتھا جہاں سے نئے تخلیقی اذہان پس وپیش کی کیفیت سے دوچار ہونے لگے کہ اب افسانہ کون سی سمت اور کس رخ پر سفر کرے گا؟ تجربے اور تبدیلی کی نوعیتیں کیا ہوں گی؟ لہذا یہاں سے افسانے میں جدیدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں افسانہ نگاروں کا نقطۂ ارتکاز اجتماعیت اور خارجی عوامل سے ہٹ کر ذاتی مسائل، داخلی کرب ،خوف، دہشت، تنہائی، بیگانگی، قدروں کی شکست و ریخت وغیرہ کے اظہار تک محدود ہو گیا۔ علامت، تجریدیت، شعور کی رو، آزاد تلازمہ کو وسیلۂ بیان بنایا گیا اور پلاٹ لیس، تجریدی، بیانیہ سے عاری، انٹی اسٹوری کہانیاں لکھی گئیں۔ تجریدی افسانے کے حوالے سے ناقدین کا رویہ کہیں مذمّتی ہے تو کہیں توصیفی۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں ملاحظہ ہو:

> ’’ادھر نیا افسانہ جدید مغربی اور امریکی ادبی تحریکوں کا اثر قبول کر رہا ہے۔ Existentialism کے اثرات عام ہو رہے ہیں۔ سارتر، کامیو، ولیم بروزلرائے جونز کیرو، ایسٹ لیک، ارلین، زیکوسکی اور سٹین لے برن کی تصانیف مقبول ہیں۔ بغیر پلاٹ کی کہانی اور مجرد کہانی بھی لکھی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں رام لعل، بلراج مین رااور سریندر پرکاش کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔‘‘

اس نئی اور علامتی کہانی کے پیرو کار میں قدیم و جدید دونوں ادیب شامل ہیں: انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، جوگیندر پال، غیاث احمد گدی، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، خالدہ حسین، انور سجاد، احمد ہمیش، کلام حیدری، رام لال، اقبال مجید، اقبال متین، رتن سنگھ، جیلانی

بانو،منیر احمد شیخ، غلام الثقلین، حسین الحق،شوکت حیات، عبدالصمد، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، رشید امجد، محمد منشایاد، انور خاں اوران کے بعد کی نسل ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو افسانے کی ایک پوری کہکشاں منظّم ہوگئی۔

اس دور میں بے شمار افسانے لکھے گئے جن میں کچھ ہی بلند پایہ علامتی افسانے مرکز توجہ بن پائے ورنہ زیادہ تر مبہم، غیر واضح متن اور باعث تکثیر پس پشت ڈال دیے گئے۔ جدیدیت کے اس دور میں افسانہ ہیئتی اور معنیاتی سطح پر قابل اہم تغیرات سے روشناس ہوا۔لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس کا المیاتی انجام ایسا سامنے آیا کہ تجربہ برائے تجربہ کی اندھی تقلید، عجیب اور نادر استعاروں علامات اور فنطاسی نے قاری اور نئی کہانی کے مابین ابعاد اور بیزاری پیدا کردی۔تجریدیت کے نام پر ایسے ایسے تجربے کیے گئے کہ افسانہ لاینحل معمہ بن کر رہ گیا۔اور کیوں نہیں بنتا؟ جب اس کی بنیادی ساخت کو ہی تو ڑمروڑ کر پیش کیا جائے گا تو ایسا تو ہونا ہی تھا۔تجریدیت اور جدیدیت کی اس شدت اور انتہا پسندی نے افسانے کی ترسیل اور تفہیم دونوں کو سخت گزند پہنچائی۔اس ضمن میں مجتبیٰ حسین جدیدت کی اس انتہا پسندی کی سخت مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’پہلے تو کہانی میں سے کہانی کو نکالا، پھر کردار کو نکالا، منظر نگاری کو نکالا، نقطۂ عروج کو نکالا، پھر ہوتے ہوتے قاری کو بھی نکال دیا........
> کہانی میں سے اتنی چیزوں کے نکل جانے کے بعد کہانی میں صرف افسانہ نگار باقی رہ جاتا ہے اوراس کے باقی رہنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ہم اس دن کے بھی منتظر ہیں جب کہانی میں سے کہانی کار بھی نکل جائے۔‘‘

(ماہنامہ ’روبی‘ دہلی مختصر کہانی نمبر اپریل۔۱۹۷۸، ص ۷۷)

لہٰذا جب صورتحال اس قدر پیچیدہ اور افسانہ کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی تو،
اسی عہد میں فکشن کے اہم ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ایک مضمون بعنوان ''نیا افسانہ :روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ'' لکھ کر اس افسانوی بحران اور نئی کہانی کے حوالے سے پھیلنے والی تخریب وتفریط کونشان زد کیا۔ چنانچہ ۷۰ کی دہائی سے نئے تخلیقی اذہان افسانے کی صحت مند قدروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۷۰ اور ۸۰ اور بعد کے کہانی کاروں نے علامتیت اور تجریدیت کو تج کر حقیقت نگاری، ترقی پسندی اور جدیدیت سبھی کے امتزاج سے مثبت عناصر اخذ کیے اور افسانے کے گم شدہ خدوخال بحال کرنے کی جانب اہم اقدام اٹھائے۔ اب جو افسانے میں نیا بدلاؤ آیا اس میں فلسفہ بھی ہے اور حقیقت بھی، فن بھی ہے اور فکر بھی حتیٰ کہ سماج اور فرد بھی سانس لیتا نظر آتا ہے۔ ۱۹۸۰ تک آتے آتے فسانہ از سر نو اپنی گزشتہ روایات سے منسلک ہوگیا اور اس انسلاک نے ایک بار پھر قاری اور افسانے کے مابین ہم آہنگی اور استواری پیدا کردی۔ پروفیسر عتیق اللہ کے مطابق:

> ''افسانے کی صنف سیال، بے حد حرکت پذیر اور انتہائی اضافیت کی حامل ہے...اسی لیے یہ صنف مسلسل جدلیت سے گزرتی رہی، کہانی بننے کا کوئی ایک طریقہ معیاری نہیں بن سکا۔ ہر پانچ دس برسوں میں کسی ایک حاوی تجربے یا بہت سے نئے تجربات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس قسم کے تجربات ہی فنی کشادگیوں اور فنی انبساط کی دلیل ہیں۔'' (تعصّبات۔۲۲۰)

۸۰ اور اس کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی اس میں نئے اور پرانے دونوں چہرے شامل ہیں۔ ۸۰ کے بعد جن کہانی کاروں نے اپنی شناخت قائم کر لی تھی ان میں مرزا حامد بیگ، مشرف عالم ذوقی، عبدالصمد، شوکت حیات، بیگ احساس، نورالحسنین،

مشتاق احمد نوری، انجم عثمانی، خورشید حیات، شموئل احمد، نیر مسعود، ساجد رشید، ذکیہ مشہدی، معین الدین جینا بڑے، سید احمد قادری، ترنم ریاض، اقبال حسن آزاد، صادقہ نواب سحر، اسلم جمشید پوری، حمیدہ سالم، پیغام آفاقی، خالد جاوید، غزال ضیغم احمد صغیر، مظہر سلیم فیاض وجیہہ وغیرہ یہاں میرا مقصد فہرست سازی نہیں ہر چند کہ یہ کوشش ضرور ہے کہ نئے ناموں کی شماری سے افسانے کے بدلتے مزاج، نئے مباحث، تقاضوں اور تازہ کاری کا پتہ چل سکے۔۹۰ کی دہائی میں فن کاروں کی جو نسل ابھر کر سامنے آئی ان میں ایک نمائندہ نام صغیر رحمانی کا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف ادبی رسائل و جرائد میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

صغیر رحمانی نے جس وقت افسانہ نگاری کا آغاز کیا اسے مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس عہد میں ۷۰ سے لے کر ۲۰۱۰ کے بیچ تقریباً چار نسلیں ہم آہنگ ہو کر افسانہ نویسی کی جانب مائل ہیں۔ جو بیک وقت کئی ادوار کے مسائل کو عصر حاضر کے تناظر اور معنیات سے آمیز کر کے افسانے کو نئے مدارج اور نئے امکانات سے ہمکنار کرنے میں کوشاں ہیں۔ مابعد جدیدیت کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس میں ہر سطح پر بے شمار موضوعات و مسائل کو جانچا پرکھا جا رہا ہے۔ جس میں ہر شئے اور حقیقت کی گہرائی و گیرائی ماپنے، بنے بنائے مفروضوں کو رد کر کے ان کی تشکیل نو کی جانب توجہ مرتکز کی جا رہی ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں کے دورانیہ میں افسانہ بتدریج اپنے تعمیری و تشکیلی اور تخلیقی عناصر، فکری و فنی نکات، صنفی و ہئیتی ساخت اور عصری و جدلیاتی اختصاص کے ساتھ مستقل ارتقا پذیر ہے۔ نتیجتاً عصر موجودہ کا افسانہ اپنے کہانی پن اور افسانوی شعریات کے حوالے سے یکجا نظر آتا ہے اور کہانی کار اپنے اپنے منفرد لب ولہجہ، تیور، پیشکش اور تخلیقی قوتوں کے زور پر ہر آن افسانے کی صنفی خصوصیات و امتیازات کو منکشف کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ جس

کو بذریعۂ ناقدین سمجھا بھی جارہا ہے، سراہا بھی اور پرکھا بھی جارہا ہے۔صغیر رحمانی نے بھی اپنے مشاہدے، تجربے اور تخلیقی صلاحیت کی بنا پر ایک منفرد شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

صغیر رحمانی کی ولادت ۷رجنوری ۱۹۶۹ میں صوبۂ بہار کے شہر آرہ (بھوجپور) میں ہوئی۔ان کا تعلق ایک مسلم متوسط خاندان سے ہے۔والد کا نام عبدالرحمٰن اور والدہ کا زیب النساء ہے۔ان کا اصل نام محمد صغیر عالم ہے اور قلمی نام صغیر رحمانی۔انھوں نے ۱۹۸۴ میں ماڈل انسٹی ٹیوٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔۱۹۸۹ میں آرہ کے ہی ایچ ڈی جین کالج سے بی۔کام کی ڈگری حاصل کی۔ابھی صغیر رحمانی کی عمر بیس برس ہی تھی کہ والد داغ مفارقت دے گئے اور جلد ہی گھر کی کل ذمہ داریاں ان کے سر آپڑیں۔والد کی وفات کے بعد صغیر رحمانی چند سال تک کلکتہ میں تلاش معاش کی دقتیں جھیلتے رہے، بعدازاں اپنے شہر آرہ واپس لوٹ آئے اور بھور نامی ایک غیر سرکاری سماجی ادارہ سے منسلک ہوگئے۔

صغیر رحمانی اردو اور ہندی دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔انھوں نے ویسے تو پڑھنے لکھنے کا آغاز اردو ادب میں ہی کیا اور اسی کے ذریعہ اپنی ایک منفرد پہچان بنانے کی کوشش کی۔تاہم ان کا شمار اردو کے ساتھ ہندی ادب کے اہم ساہتیہ کاروں میں بھی ہوتا ہے۔ہندی میں ان کی دو کتابیں اشاعت کے مراحل طے کر چکی ہیں۔جن میں ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ بعنوان 'پرانے گھر کا چاند' (اشاعت ۲۰۰۰: دہلی) اور اس کے بعد 'آشیش' (۲۰۰۱: دہلی) ان کا پہلا ناول شامل ہیں۔اردو میں صغیر رحمانی کی پہلی کہانی ''خون بولتا ہے'' دہلی کے اہم رسالے خاتون مشرق میں ۱۹۸۷ میں اشاعت سے ہمکنار ہوئی۔بعدازاں ان کے افسانے ہندو پاک کے بیشتر موقر و معروف رسائل میں شائع ہو

چکے ہیں اور حلقۂ اردو میں داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ایک افسانوی مجموعہ ''واپسی سے پہلے'' (۲۰۰۲) اردو میں اشاعت سے ہمکنار ہو چکا ہے۔اس مجموعہ کے بعض افسانوں نے اپنی منفرد بنت اور موضوع کے اعتبار سے ادبی حلقے میں صغیر رحمانی کی ایک خاص شناخت کا فریضہ انجام دیا۔ان کے افسانے بالخصوص 'واپسی سے پہلے'،'ایک اور وہ'،' کائی'،'حبشی کی آدھی شلوار'،'شاہزادے کی پریم کہانی' اور چھو۔تی ۔تی ۔تی ۔تا' وغیرہ نئے احساس، تازہ کاری اور فنی اعتبار سے افسانے کے روایتی تصور سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

اس دور میں لکھنے والوں کے یہاں موضوعات کی بے حد کثرت ہے۔کل کائنات ایک گلوبل ولیج (Global Village) کی شکل میں سمٹ کر سامنے آگئی ہے۔اس ولیج میں ہونے والے خلفشار، انتشار، ظلم و بربریت، زندگی کی بے ضابطگی وغیرہ سے آج کا انسان نبرد آزما ہے۔لہٰذا نویں کی دہائی کے فن کاروں کے موضوعات کم وبیش یکساں ہی نظر آتے ہیں۔مثلاً سیاسی اتھل پتھل، آج کے نیتاؤں کا سماج پر جابرانہ تسلط، جھوٹ، مکاری، رشتوں میں تناؤ، جنسیت اور جنسی بے راہ روی، خوف و دہشت گردی، مذہبی و نسلی تعصّبات، ماحول سے نا ہم آہنگی، استحصال، تنازعات، علاقائی تعصب، دبے کچلے اور پسماندہ اور دلت طبقے کا استحصال، پچھڑے گاؤں اور پچھڑی ذاتوں کے مسائل، اعلی طبقے کی ذہنی پستی، نفسیاتی الجھنیں، غیر انسانی رویے، اخلاقی تصورات کی پامالی وغیرہ ایسے سیاہ حاشیے اور خوفناک منظر نامے ہیں جن سے کوئی بھی حساس ذہن اور انسانیت کا درد رکھنے والا فنکار پہلو نہیں بچا سکتا۔عہد موجود میں سائنس وٹکنالوجی کی ایجادواختراع اور نئے نئے انکشافات ،انوکھے ذرائع ترسیل وابلاغ نے ہمارے اذہان پر جو یلغار کی ہے اس سے سارا انسانی اور سماجی نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ہر گزرتے شب و روز میں وقوع پذیر واقعات چشم زدن میں ہمارے روبرو آن کر ہمیں متحیر کر دیتے ہیں اور دل و دماغ کو دعوت غور فکر دیتے

ہیں۔یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جو فنکاروں کی روح کو جھنجوڑ کر انھیں ایسے حالات کو اپنے اندر جذب کر کے صفحۂ ہستی پر منتقل کرنے کی اپیل کرتا ہے۔اس پس منظر میں باشعور اور سرگرم عمل فنکار ان موضوعات کو مختلف اظہار بیان اور اسلوب کے ساتھ اپناتے ہیں اور افسانے کو لامحدود امکانات سے روشناس کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔صغیر رحمانی کے ساتھ ساتھ ان کے چند معاصرین پر بھی ایک غائرانہ نظر ڈال لینی چاہیے تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ صغیر رحمانی اپنے ہم عصروں سے کس طرح منفرد ہیں اور کہاں کہاں مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ان کے معاصر کے حوالے سے احمد صغیر کا نام قابل ذکر ہے۔

احمد صغیر ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔اب تک ان کے غالباً تین افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔احمد صغیر نے بھی عصری حسّیت اور عصری آگہی کے حامل افسانے تخلیق کیے ہیں۔ان کے افسانے بنیادی طور پر ظلم و تشدد، استحصال اور ناانصافی کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ترقی پسند سے وابستہ وہ ایک حقیقت پسند کہانی کار ہیں۔اس لیے ان کے یہاں طبقاتی کشمکش، خوف و دہشت، علاقائی تعصب، فرقہ واریت جیسے موضوعات زیادہ حاوی نظر آتے ہیں۔وہ ان تمام شر پسند عناصر کے عمق میں جا کر ان کی اصل وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔احمد صغیر زیادہ طول طویل افسانے نہیں لکھتے مختصر سہی لیکن معنی سے پر ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں میں 'منڈیر پر بیٹھا ہوا پرندہ'، 'سفر ابھی ختم نہیں ہوا'، 'کرفیو کب ٹوٹے گا' اور 'جنگ جاری ہے' اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانہ 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ' میں پرندہ استعارہ ہے۔ایک ایسے ماحول کا پروردہ استعارہ ہے جس میں خوف، دہشت، ذہنی کرب، انسانی بے بسی اور معاشرے کی بے حسی جیسے زہریلے مادے لوگوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے ہیں۔اس میں ایک حساس انسان کے داخلی اضطراب اور انتہائی خوف کے عالم میں پنپنے والی نفسیات کو سامنے لایا گیا ہے۔اس خوف و دہشت اور غیر محفوظ

فضا نے لوگوں کے اذہان کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ذہنی بے چینی، غیر یقینی کیفیت اور عدم تحفظ کا یہ پرندہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر کسی بھی انسان کو نفسیاتی طور پر انتشار کی کیفیت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ احمد صغیر کے افسانے ان حالات اور ان جیسے دوسرے موضوعات کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری جن کا تعلق جمشید پور سے ہے۔ اس کے گردونواح کے علاقوں سے اکثر کمیونسٹ رجحان سازوں کا تعلق رہا ہے۔ لیکن اسلم جمشید پوری کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ ایسے کسی بھی نظریہ یا رجحان کے پابند نظر نہیں آتے۔ 'افق کی مسکراہٹ' اور 'کہانی محل' اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پریم چند کے اسلوب کا ہلکا سا شائبہ اور دیہی زندگی کا گہرا پرتو نظر آتا ہے۔ ان کے نمائندہ افسانوں میں پینٹھ، دھوپ کا سایہ، شبراتی، وہم کے سایے، مشین کا پرزہ، یہ ہے دلّی میری جان اور لینڈرا وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ لینڈرا کو ان کی افسانہ نگاری کا سنگ میل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کے یہاں بھی بیشتر موضوعات اپنے ہم عصروں کی طرح تنہائی، بے گانگی، انسانی سماج اور انسانی زندگی میں رونما ہونے والے بے شمار حقیقی مگر تلخ واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ افسانہ 'یہ ہے دلی میری جان' میں دلی کے فقیروں کی غنڈہ گردی، بے جا من مانی اور بد کرداری کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جبکہ افسانہ 'مشین کا پرزہ' میں ایسے غریب الوطن افراد کی زندگی اور احوال و مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے جو تلاش معاش اور بہتر زندگی کا خواب لیکر عرب ممالک جاتے ہیں۔ وہاں انھیں کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے بڑی مہارت سے اس کو ابھارا گیا ہے۔ اسلم جمشید پوری پہلے واقعات کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں تب کہیں جا کر انھیں اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔

گزشتہ دو تین دہائیوں میں خواتین فنکاروں کی مختلف عصری مسائل و موضوعات پر

ایسی تحریریں سامنے آئی ہیں جنھوں نے فی الفور اردو قارئین کو اپنی جانب مائل کیا ہے۔ان کی تحریروں میں نئے ذائقے اور نئے احساس کا پتا چلتا ہے۔صغیر رحمانی کے ہم عصروں میں غزال ضیغم کی قوی شناخت ان کے تانیثی رجحان کے سبب ہے۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ 'ایک ٹکڑا دھوپ' شائع ہو چکا ہے۔ان کے قابل شمار افسانوں میں بھولے بسرے لوگ، ایک ٹکڑا دھوپ اور سوریہ ونشی چندر ونشی وغیرہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جو ان کے مخصوص اندازِ فکر کے عکاس ہیں۔ان میں افسانہ سوریہ ونشی چندر ونشی بطور تانیثی رویے کی نمائندگی کے زیادہ توجہ کا حامل ہے۔لیکن کہیں کہیں راوی کے بے جا دخیل ہونے سے افسانوی بیان لڑکھڑا گیا ہے۔

اس ضمن میں ثروت خان کو امتیاز حاصل ہے۔ان کا بھی ایک افسانوی مجموعہ 'ذروں کی حرارت' اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ان کے افسانے اختصار نویسی کے حامل ہیں۔نسائی حسیت اور مسائل کی پیش کش پر کافی عبور حاصل ہے۔ترشنا، میں مرد مار بھلی، حسن کا معیار وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔میں مرد مار بھلی کی کردار کیرتی جو کانسٹبل ہے جب وہ اپنی دوست سنبل کو اپنے شوہر کے ہاتھوں پٹتے دیکھتی ہے تو بڑی غضبناک ہوتی ہے اس کو دیکھ کر اس کے اپنے زخم ہرے ہو جاتے ہیں جب اس کا باپ بھی اسی طرح اس کی ماں کو پیٹا کرتا تھا۔''پتی پرمیشور...لاتیں...گھونسے...دہاڑتا باپ، بلکتی ماں ایک کونے میں اس کا ننھا وجود۔''لہٰذا کیرتی ایسے مردوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور اپنے عہدہ کا بھر پور استعمال کرتے ہوئے ایسے مردوں پر اپنا قہر برسا کر انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرتی ہے۔

نگار عظیم بھی اسی دور کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔یہ بھی اپنے ہم عصروں سے متاثر ہیں۔ان کے بیشتر افسانے نچلے متوسط طبقے کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔انھوں نے جنسی موضوعات پر بھی چند قابل بحث افسانے تحریر کیے ہیں۔لیکن ان کے یہاں فنی طور پر

کچھ جھول سا ہے، البتہ موضوعات میں تازہ کاری ہے۔رشتوں کی اہمیت ومعنویت پر ان کے چند افسانے مثلاً گہن، کنفیشن ،فرض ،زہدہ مقدس اور تکمیل توجہ کے حامل ہیں۔ایک عورت رشتوں کے تئیں کس قدر حساس ہوتی ہے اس کی خوبصورت مثال اور رشتوں کے بدلتے معیاران مذکورہ افسانوں میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

صغیر رحمانی کے خواتین ہم عصروں میں ایک نام ترنم ریاض کا بھی لیا جاسکتا ہے۔جو تانیثی ادب کی ایک معتبر آواز ہیں اور مرد کی اجارہ داری کے خلاف احتجاجی رویہ اپناتی ہیں۔ان کے یہاں ازدواجی زندگی کے ساتھ ساتھ رشتوں کی نازکی اور انسانی جذبات کا موثر بیان ملتا ہے۔ان کے افسانوں میں مہمان ، پوتھی پڑھی پڑھی، بجھائے نہ بنے، عکس، ناخدا اورشہر قاری کی توجہ کھینچتے ہیں۔ان کی کہانی 'مہمان' نچلے طبقے کے مسائل، ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات اوران کی نفسیات اور مزاج کی نمائندگی کرتی ہے۔جبکہ افسانہ 'شہر' میں نئی شہری زندگی کی پیچیدگیاں ،مسائل اور فلیٹ کلچر کو اجاگر کیا ہے۔یہ کہانی ایک ماں اوراس کے دو چھوٹے بچوں کی انتہائی تکلیف دہ صورتحال کو پیش کرتی ہے۔کہانی کے شروع میں ہی بنا کسی جواز کے ماں کی موت ہوجاتی ہے اس کے بعد بچوں کی جو بے بسی کی حالت ہوتی ہے قابل رحم ہے۔افسانہ 'ناخدا' میں عورت کی بے بسی ، لاچاری اور کرب و گھٹن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو عملی طور پر معرض تحریر میں لانے کی اس طرح کوشش کرتی ہیں کہ قاری کے ذہن ودل پر گہرے اثرات مرتسم ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر عظیم راہی کا افسانوی مجموعہ 'اگلی صدی کے موڑ پر' توجہ طلب ہے۔اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں عصر حاضر میں پنپنے والے مسائل کی آئینہ داری کرتی ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں سیدھا سادہ بیانیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔موجودہ زندگی کی بھرپور عکاسی ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے اپنے خاص اسلوب سے پہچانے

جاتے ہیں۔

مظہر سلیم کا ایک افسانوی مجموعہ 'اندر کا ایک آدمی' منظر عام پر آچکا ہے۔انھوں نے عصر حاضر میں نئی نسل کی زندگی کی عکاسی شہری زندگی کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔'اندر کا ایک آدمی' جس میں افسانے کا کردار کئی داخلی وخارجی کشمکشوں سے دوچار ہوتا ہے اور 'واگھ مارے نے خودکشی کیوں کی؟' یہ افسانہ فسادات کی روداد پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں ان کے قابل توجہ افسانے ہیں۔مظہر سلیم نفسیاتی اور علامتی کہانیوں پر کافی دسترس رکھتے ہیں۔ابراہیم اشک کے بقول وہ ہمیشہ ایک نئے موضوع کی تلاش میں رہتے ہیں اور کہانی لکھتے وقت اس موضوع کی اہمیت کو سمجھ کر برتتے اور قارئین کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔

نورالحسنین بھی ۸۰ کے بعد ابھرتا ہوا ایک اہم نام ہے۔'بازی گر' 'دستک' اور 'دوسرے کنارے تک' ان کے معروف افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔افسانہ دوسرے کنارے تک میں امیری اور غریبی کی طبقاتی کشمکش کو ابھارا گیا ہے۔جبکہ بازی گر میں موجودہ سیاسی ،سماجی اور معاشرتی پس منظر کو موضوع بنا کر اپنے خیالات کو تقویت عطا کی ہے۔ان کے علاوہ قاسم خورشید اسی دور کے کہانی کار ہیں ان کا افسانہ 'باگھ دادا' علامتی انداز بیان کے اعتبار سے اہم ہے۔اس میں بھوک کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس کے توسط سے معاشرے کی بے حسی اور زوال پر بڑے تیکھے انداز میں سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔

صغیر رحمانی کے ہم نواؤں میں معین الدین عثمانی بھی اہم قلم کار ہیں۔ان کے دو مجموعے 'متحرک منظر کی فریم' اور 'نجات' اشاعت سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ان کے افسانوں کے موضوعات متوسط طبقے کے مسائل کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ان کا ایک افسانہ 'آندھی' مارکیٹ ویلیو کو اجاگر کرتا ہے۔ایک گاؤں جو گاؤں ہی کی طرز کا ہوتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد جب افسانے کا کردار گاؤں واپس جاتا ہے تو گاؤں کی پوری ہیئت اور منظر نامہ

ہی بدل چکا ہوتا ہے۔اس ماحول میں اسے بے حد گھٹن کا احساس ہوتا ہے،لہذا وہ اس ماحول سے اکتا کر واپس لوٹ آتا ہے۔نورالحسنین اپنے ایک مضمون میں معین الدین کے متعلق لکھتے ہیں:''اگر فنکار کی آنکھ کھلی ہو اور احساس بیدار ہو تو اسے افسانوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔'' یہ قول ان کے فن کو سمجھنے کے لیے کافی مددگار ثابت ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے قرب و جوار میں رونما ہونے والے مسائل کو نہ صرف موضوع بناتے ہیں بلکہ فن کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔

شاہد اختر بھی اس عہد کا ایک اہم نام ہے۔یہ بھی اپنے ہم عصروں کی طرح مختلف موضوعات کو اپناتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ایسے موضوعات و مسائل بھی ہیں جن پر عموماً ہر ایک کی نظر نہیں جاتی۔انھوں نے جنسی مسائل،انسانی زندگی کی پیچیدگیوں اور انسانی نفسیات پر بڑے فنکارانہ انداز میں گرفت کی ہے۔

ویسے تو ۸۰ کے بعد منظر عام پر آنے والوں کی ایک پوری کھیپ کی کھیپ ہے۔جن کو یہاں احاطۂ تحریر میں لانا ذرا مشکل ہے ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔تاہم ان میں سے کچھ کے ناموں کا تذکرہ کر کے ان کی موجودگی کا احساس دلایا جاسکتا ہے۔اول الذکر ناموں کے علاوہ بھی کئی افسانہ نگار ایسے ہیں جو عصری تقاضوں کے ساتھ اپنے زمانے کا ساتھ نبھانے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں: مثلاً خورشید اکرم، معین الدین جینابڑے، انجم عثمانی، اشتیاق سعید، شبیر احمد، رفیع حیدانجم، حقانی القاسمی، نفیس بانو شمع، محمود شیخ ،حنا روحی، قنبر علی، تبسم فاطمہ، قمر جہاں، غیاث الرحمٰن، انیس اختر، مجتبیٰ انجم، وغیرہ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

لیکن صغیر رحمانی اپنے ہم عصروں سے قدرے مختلف ہیں۔ان کے یہاں اپنے معاصرین سے کچھ ہٹ کر اور کچھ ان سے مشترک سلگتے موضوعات سے سابقہ پڑتا ہے۔

انھوں نے ایک نئے اسلوب اورلب و لہجے کے ساتھ اس جہان فکشن میں قدم رکھا۔انھوں نے جو کچھ لکھا اور جب سے لکھا وہ نہ تو ہوائی قلعے ہیں اور نہ محض ذہنی اختراع ہے، بلکہ سماج کے ایسے کریہہ پہلو اور تلخ حقائق ہیں اور وہ غلاظت ہے جس کی بساندھ پر لوگ ناک تو بند کر سکتے ہیں اسے وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔صغیر رحمانی کے قلم میں جو نوکیلی دھار ،ذہن میں جو تلملا دینے والا خیال ہے جب یہ دونوں باہم ضم ہوتے ہیں تو ایسی ایسی سفاک سچائیاں اور دلدوز واقعات وحقائق بے نقاب ہوتے ہیں کہ انسانی ضمیر بھی چند ثانیوں کے لیے جھنجھنا اٹھتا ہے۔اپنے خیال کی تصدیق میں ان کی چند کہانیوں 'بو' کائی'،'حبضی کی آدھی شلوار'،'ناف کے نیچے وغیرہ کو پیش کرتی ہوں۔

صغیر رحمانی کا افسانہ 'بو' نہ تو منٹو کی 'بو' کی سلسلہ وار کہانی ہے نہ بین المتونیت پر مبنی افسانہ ہے اور نہ ہی اس میں وہ بو ہے جو رندھیر کے حواسوں پر اس قدر چھا جاتی ہے کہ پھر کسی دوسری عورت کی بو کو وہ کبھی اپنی سانسوں میں نہیں سما سکا۔دراصل صغیر رحمانی نے اپنے افسانے بو میں سماج کی ایسی گندھ کو پیش کیا ہے جس میں گٹر سے بھی زیادہ تعفن اور سڑاند ہے۔یہ افسانہ احاطہ کرتا ہے ہندوستان کے اعلی اور ترقی یافتہ شہر ممبئی کی جھونپڑ پٹیوں میں رہنے والے ان افراد کا جو شرفا اور اعلیٰ طبقہ کی عیاشیوں کا نتیجہ ہیں اور روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور گٹر کی بدبودار فضا میں رہتے ہیں۔یہ گٹر ممبئی جیسے چم چم کرتے شہر کی ہائی سوسائٹی کی ایجاد ہیں۔افسانہ کا کردار بلّا بھگو کو بتاتا ہے''اسی گٹر کے سینے میں تو کالی راتوں کا کالا پن چھپتا ہے۔''

بلّا بھی ایسی ہی کسی کالی رات کا کالا پن ہے جسے اس کی موسی جس کے ساتھ وہ رہتا ہے اسی سڑے ہوئے گٹر کی کوکھ سے نکال کر لاتی ہے۔اس کا یقین ہے وہ کسی بڑے صاحب کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔جو برقی روشنیوں میں عیاشیاں کرتے ہیں اور ان روشنیوں کے

تاریک پہلوؤں کورات کی تاریکی میں گٹر کی گندھ کے حوالے کرجاتے ہیں۔بلاّ اسی بستی میں رہتا ہے جہاں صرف سڑاند ہی سڑاند ہے۔اس دلدوز انکشاف کے بعد بلاّ کے مضطرب دل کو چین آجاتا ہے۔اس لئے کہ وہ آج اپنے آپ سے ملا تھا، یہی گٹر اسکا ٹھکانہ تھا وہ اسی تعفن کا حصہ تھا۔پل پر کھڑے ہوکر روشنیوں کو دیکھتے ہوئے انتہائی بے بسی کے ساتھ سوچتا ہے کہ وہ بھی تو انھیں روشنیوں کا حصہ ہے، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ان روشنیوں میں اسکا اپنا حصہ کتنا ہے؟موسی کا حصہ کتنا ہے؟ جسے بڑھاپے میں حوالات میں بند ہونا پڑتا ہے اور بھگو کی شناسا جمنا کا کتنا حصہ ہے جولال چوڑیوں کی لاج کے لیے اپنی عصمت و جان پر کھیل جاتی ہے۔کیا قصور تھا ان کا اور ان جیسے افراد کا ؟انھیں کیوں زندگی کے لباس میں مستقل عذاب کی بھٹی میں جھونک دیا گیا؟صغیر رحمانی نے اس افسانے کے ذریعہ حساس اذہان کو بیدار اور سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجوڑتے ہوئے ایسے سماجی و معاشرتی مسائل پر غور وخوض کی دعوت دی ہے۔اس میں انھوں نے ممبیا کلچر پر گہرا طنز کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

''شہر کی ایجاد یہ گٹر تھا اور گٹر کی ایجاد ایسی بستیاں۔اگر گٹر نہ ہوتو ایسی بستیاں قطعی آباد نہ ہوں.....یہ مبہم مبہم سے چہرے والے لوگ نہ ہوں...''

اس افسانے میں انھوں نے ممبئی کی بول چال کی زبان اور وہاں کے کلچر کو بڑی عمدگی سے افسانے کے تاروپود میں برتا ہے۔اور ایسے افراد کی بابت بھی گفتگو کی ہے جو تلاش معاش کے لیے وہاں جاتے ہیں اور دردر کی ٹھوکریں اور نامرادی ہی جن کا مقدر ٹھرتی ہے۔

ہمیں آئے دن اخبار ورسائل اور نیوز چینل پر مارکاٹ، قتل وغارت گری، دہشت گردی، عصمت ریزی، اغوا وغیرہ کی سنسنی خیز خبروں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔لیکن زندگی سے متعلق یہ واقعات اور حادثات ہر کو ایک ہی طرح سے متاثر نہیں کرتے، اخبار کی سرخیاں

پڑھ کر کسی کا ردعمل ایک حد تک تحیر آمیز ہو سکتا ہے لیکن صرف وقتی طور پر۔ اسی طرح نیوز چینل پر پیش کردہ خبروں کو کافی حد تک سنسنی خیز بنا کر صبح سے شام تک دوہرایا جاتا ہے۔ اس کا اثر بھی چند ثانیوں کے لیے ہوتا ہے جو کہ چینل بدلتے ہی زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن مذکورہ حوادث اور المیوں سے متعلق ایک حساس دل اور وہ بھی کسی ادیب کا کیا محسوس کرتا ہے؟ کس زاویہ سے وہ اس کو پیش کریگا؟ اگر یہ دیکھنا ہے تو منٹو کے مشہور زمانہ افسانے 'کھول دو'، 'ٹھنڈا گوشت' حیات اللہ انصاری کا 'لہو کے پھول' بلراج مینرا کا 'ریپ' شوکت حیات کا 'گنبد کے کبوتر' سید محمد اشرف کا 'ڈار سے بچھڑے' شموئل احمد کا 'سنگھاردان' وغیرہ کو جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر واقعہ اور حادثہ سے متعلق ان سب کا الگ الگ نظریہ اور اظہار بیان ہے۔ جو دیدہ وروں کے لیے حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم صغیر رحمانی کا افسانہ 'کائی' پڑھتے ہیں تو بے ساختہ منٹو کا افسانہ 'ٹھنڈا گوشت' نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ اس میں بٹوارہ اور فسادات کے دورانیہ میں ہوش وحواس سے عاری اور انسانیت سے بے بہرہ کردار اپنی جنسی ہوس کو مٹانے کے لیے ایک مردہ عورت سے جنسی تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً اس کی مردانہ قوت زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن صغیر رحمانی اسی طرح کے واقعہ کو ایک نئے ٹریٹ مینٹ اور اسلوب کے ساتھ برتتے ہیں۔

کائی میں دو کردار گوسائیں اور بھوپت جو انتہائی غلیظ، سفاک اور وحشی صفت ہیں ایک مردہ گھر میں کئیر ٹیکر کا کام کرتے ہیں۔ لیکن لاش کو اس کے عزیز یا دعوے دار کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے سودہ بازی کرتے ہیں اور تگڑی رقم وصول کر کے شراب و کباب میں اڑا دیتے ہیں۔ جب جب دنگے فساد برپا ہوتے ہیں تو ان کی لاٹری لگ جاتی ہے۔ گوسائیں ہمیشہ ہی بھگوان سے فسادات اور بلووں کی پرارتھنا کرتا ہے تا کہ اس کا دھندا کبھی

مانند نہ پڑے۔لہٰذا جب بلوے اور گہما گہمی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور لاشیں ایک ایک کر کے ختم ہونے لگتی ہیں صرف ایک عورت کی لاش باقی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف مذاہب پر مشتمل کچھ لوگوں کی ایک جماعت وہ لاش طلب کرنے آتی ہے۔ چونکہ وہ عورت ایک سوشل ورکر تھی اور اس دنگے میں لوگوں کی مدد کرتے ہوئے ماری گئی تھی یوں وہ اس کا معاوضہ دینے سے منع کر دیتے ہیں۔تو گوسائیں مارے جھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ کے آدھی بوتل شراب یک بارگی چڑھا جاتا ہے اور اپنی رقم وصولنے کے لیے نشے کی حالت میں لاش کے ساتھ وحشیانہ فعل کر کے درندگی کی تمام حدیں پار کر جاتا ہے،لیکن جب لاش میں کوئی حرکت نہیں ہوتی تو کہتا ہے:

''یہ سالی ہلتی ڈلتی کیوں نہیں...ایک دم لاش کے ماپھک پڑے لا ہے...؟

لاش کا احساس ہوتے ہی اس کا نشہ ایک دم پارہ بن کر اڑ جاتا ہے اور بد حواس ہو کر بے اختیار اپنے ساتھی بھوپت کی جانب دوڑتا ہے جو اپنی باری کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ گوسائیں اسے گالی دیتے ہوئے کہتا ہے:

''تو تو اپن سے بھی بڑا کمینہ نکلا رے....چل ہٹ...جا...لاش ان لوگوں کے حوالے کر دے...''

منٹو اور صغیر رحمانی دونوں کے یہاں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ منٹو اپنے کردار پر شیطانیت طاری کر کے اس کو جنسی عمل سے گزارتے ہیں اور اس کے اندر پوشیدہ انسانیت کو بیدار کر کے احساس جرم اور احساس ندامت پیدا کرتے ہیں۔جبکہ صغیر رحمانی نے گوسائیں کو باوجود نشے اور جنون کے لاش کے ساتھ شیطانی عمل کرنے سے باز رکھ کر یہ ثبوت مہیا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابھی انسانیت کا پوری طرح سے قتل عام نہیں ہوا۔اس طرح لاش کی بے حرمتی ہونے سے بچا لیتے ہیں۔صغیر رحمانی کے اس افسانے (کائی) کے دوران مطالعہ کلیم

الدین احمد کے اس قول کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے کہ:

''اچھے افسانہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہیجان، ایک گہرا تلاطم پیدا کرے
اور حدِ خیال تک پھیلی ہوئی موجویں ابھرتی اور ڈوبتی چلی جائیں۔''

لہٰذا بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ صغیر رحمانی کا یہ افسانہ دل و دماغ میں ایسا ہی تلاطم اور ہیجان پیدا کرتا ہے کہ قاری کچھ لمحوں کے لیے ششدرر ہ جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں !!

آزادی کے بعد ہندوستان میں دنگے فسادات، ہجرت، دہشت گردی، اقلیتوں کے مسائل وغیرہ کافی زور پکڑ گئے۔ اردو افسانہ بھی ان مسائل سے اچھوتا نہ رہ سکا۔ صغیر رحمانی نے ۷۰ کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، مذہب اور دھرم کے نام پر شعبدہ بازی، ذات پرستی، نسلی تعصب اور عقائد کے نازک دھاگوں کو جلتے دیکھا ہے۔ مسلک، مذہب کی آڑ میں ہو رہے سیاسی ظلم و جبر اور اسی قسم کے دیگر مسائل پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کو صغیر رحمانی نے گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور حقیقت نگاری اور حقیقت سے آگہی و ادراک کے امتزاج سے اپنے فن کو جلا بخشی ہے۔ 'جبھی کی آدھی شلوار' 'لیکن یہ' 'داڑھی' 'ناف کے نیچے' وغیرہ افسانے کچھ اسی طرح کے سیاسی شعور، سماجی ماحول، اقلیتوں کے مسائل کا زائیدہ ہیں۔

'جُبھی کی آدھی شلوار' افسانہ قارئین کو لمحۂ فکریہ دیتا ہے۔ یہ افسانہ سن ۷۰ کی جنگ، پاکستان کی سیاسی صورتحال اور سانحۂ بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ جب مشرقی و مغربی پاکستان یہ دو الگ الگ نام وہاں کی عوام کے ذہنوں میں گونج رہے تھے۔ سماجی و سیاسی حیثیتوں اور قدروں کے سبب ایک ہی ملک کے افراد ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ ان نازک حالات میں افسانے کا کردار بدرو جو کہ بہار سے تعلق رکھتا

ہے ایک بنگالی مسلمان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ بدرو اور حبشی کا نکاح وہاں کے لوگوں کے مابین مزید مخاصمت اور منافرت کا شعلہ بھڑکا دیتا ہے۔ پھر یہ شعلہ آگ کی اونچی اونچی لپٹوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہ آگ بجھائی جاتی ہے بنگلہ دیش کے جنم سے۔ اس تنازع، خوں ریزی اور افراتفری کے ماحول میں جان و مال، عزت و آبرو کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں تو تھیں ہی ظالم و سفاک مگر جو محافظ اور مدافعت پر معمور تھے وہ بھی کم وحشی اور شیطان نہیں تھے۔ اس جنگ میں جوان کے ہاتھ آیا بجائے اس کو تحفظ دینے کے مزید عذاب اور کرب میں مبتلا کر کے بے یارو مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آگ زنی میں جب حبشی اور بدرو بھی آگ کی چپیٹ میں آ جاتے ہیں اور یہی مدافعتی دستہ جب ان دونوں کی مدد کو آتا ہے اس وقت کی تمام روداد بدرو کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ''میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ سب تماشا ہوا تھا.... حبشی کی ملائم ریشمی شلوار نے بھک سے آگ پکڑ لی تھی، وہ مدد کے لیے چیخ پڑی تھی اور کئی بھاری بوٹوں کی آواز اس کی مدد کے لیے گونجی تھی اس کی ادھ جلی شلوار بچ گئی تھی مگر۔۔۔ ان چار چار مسٹنڈوں نے۔۔۔ اور تیز گندھ سے اس کی ناک ہی نہیں روح بھی۔۔۔''

انتہائی افسوس اور کرب کا مقام ہے کہ ایسے ہنگامی حالات میں جب کہ جان کے لالے پڑے ہوں انسان کس سے مدد طلب کرے؟ کس کو لائق اعتنا سمجھے؟ یہ افسانہ ہمیں ایک بار پھر سن ۴۷ کے بٹوارہ، فسادات میں ہونے والے غیر انسانی افعال اور ظلم و استبداد کی یاد دلا دیتا ہے۔ اس افسانہ میں حذف کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے ۷۰ کی جنگ اور پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات وغیرہ کی غیر ضروری تفصیلات سے گریز کر کے یہاں صغیر رحمانی نے کمال فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔

صغیر رحمانی نے اردو فکشن کے ہم عصر رجحان کے تحت پسماندہ اقوام، بے بس اور کمزور جماعت کے مسائل، دلت اور اقلیتی طبقے کی نمائندگی بھی کی ہے۔ یہ مسائل دیگر فنکاروں کے یہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ شموئل احمد کا 'القمبوس کی گردن'، سید محمد اشرف کا 'آدمی' عبدالصمد کا 'انہونی'، غضنفر کا 'خالد کا ختنہ' حسین الحق کا 'نیو کی اینٹ' احمد صغیر کا 'مریادا اور پنڈورقص' مشرف عالم ذوقی کا 'بخاری کی نیپکن' اور صغیر رحمانی کا 'لیکن یہ چھو۔تی۔تی۔تی۔تا' اور 'ناف کے نیچے' قابل ذکر افسانے ہیں۔ جو ناقدین افسانے کے موضوعات کے حوالے سے اس واہمہ کی زد میں ہیں کہ "اردو افسانہ بین الاقوامی مسائل سے بے نیاز ہے، اسے میڈیا کے رول کی خبر نہیں، انھیں علاقائی مسائل سے دلچسپی نہیں۔ دلت اور پس ماندہ معاشرے پر نظر نہیں جاتی۔" وغیرہ لگتا ہے مذکورہ افسانوں پر ان کی نظر نہیں پڑی۔ صغیر رحمانی کا معروف افسانہ "واپسی سے پہلے"، "ایک اور وہ" اور "مونا" بین الاقوامی مسائل ، غیر ملکی فضا اور طرز معاشرت کو درشاتے ہیں۔

ناف کے نیچے افسانہ میں سماج کے دبے کچلے اور دلت طبقے کی زبوں حالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پس ماندہ طبقہ کس طرح اپنی گزر بسر کے لیے جدو جہد کرتا ہے، روزی روٹی کے لیے بڑے گھروں میں خدمت انجام دیتا ہے۔ لیکن یہی طبقۂ اشرافیہ، مذہبی ٹھیکیدار اور سیاسی رہنما کس کس انداز میں انکا استحصال کرتے ہیں۔ صغیر رحمانی کے یہاں اس کا بڑا بے باک بیان ملتا ہے۔ اس افسانے میں کہیں احتجاج ہے تو کہیں ان ناگفتہ بہ حالات سے سمجھوتہ۔ جب یہ دبے کچلے افراد ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں یا اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہوتے ہیں وہیں ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ سماج کے مختلف طبقے الگ الگ سطحوں پر ان کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی سیاست کی بساط پر مہروں کا کام انجام دیتے ہیں، تو کبھی فسادات کی آندھیاں چلا کر ان کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی

صورتحال 'ناف کے نیچے' افسانہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں ذات پرستی اور مذہبی تفریق پروان چڑھی ہوئی ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار دلت طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے ملک کے سماجی نظام میں جو برہمن واد، ذاتی تعصب، نسل پرستی اور دھرم واد کا جو Concept ہے اس میں کوئی کم ذات کسی اشراف کے سامنے نہ بیٹھ سکتا ہے، نہ سر اٹھا کر چل سکتا ہے اور نہ ہی ان کی عبادت گاہوں میں عبادت تو دور قدم بھی نہیں دھر سکتا۔ معاشرہ میں ایسے طبقہ کو 'ناف کا نچلہ حصہ' تصور کیا جاتا ہے۔ مرکزی کردار کا باپ اپنے بیٹے کو یہی نصیحت کر کے جاتا ہے جو اتنی قدیم ہے کہ ان کے یہاں پشتینی نصیحت کا درجہ اختیار کر چکی ہے کہ: ''ہم ناف کے نیچے والے ہیں ناف کے اوپر والوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی ہمارا فرض ہے۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ تم ایسی بھول نہ کرنا، اپنی حد عبور نہ کرنا۔'' اس میں انسان کی انتہائی بے بسی و لاچاری اپنی تمام تر 'کراہ' کے ساتھ موجزن ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری کے مطابق:

> صغیر رحمانی کے افسانوں کے عنوان بھی بڑے معنی خیز ہوتے ہیں جو قاری کو چونکانے کے ساتھ ساتھ فوری طور اس طرح متوجہ کر لیتے ہیں کہ قاری افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ان کے افسانوں کے بیانیہ طرز اظہار کی خوبی اس طرح اپنے ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ دھیرے دھیرے قاری افسانے کی سحر میں کھوتا چلا جاتا ہے اور جب افسانہ ختم ہوتا ہے۔ تب وہ جہاں ایک جانب افسانہ کی سحر سے نکلتا تو ضرور ہے لیکن دوسری طرف فکر و احساس کی دنیا میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔''

گرچہ میرا اس مختصر جائزے کا نقطۂ ارتکاز صغیر رحمانی کے افسانوں سے متعلق ہے لیکن دلت موضوع پر گفتگو کے باعث جملۂ معترضہ کے طور پر ہی صحیح، ان کے ناول کا تذکرہ

بھی لازمی قرار پاتا ہے کہ صغیر رحمانی نے دلت طبقہ، اس کی نفسیات، اس کے مسائل اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر ایک بھر پور ناول بھی لکھا ہے۔ ناول ہے ''تخم خوں'' جو حال ہی میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع دلت ڈسکورس سے نئے ذائقے اور نئی عصری حسیت کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ تخم خوں کو اس اعتبار سے اردو کا پہلا ناول ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے کہ یہ ہندوستان کے دیہی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، دلت ڈسکورس، سامنت واد، برہمن واد اور نکسل موومنٹ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے بر سبیل تذکرہ اتنا عرض کرتی چلوں کہ دبے کچلے افراد اور دلت موضوع کو وہی فنکار پوری شد و مد کے ساتھ تخلیقیت کے جامے میں پیش کر سکتا ہے جس نے اس طبقہ کے مسائل، طرز رہائش، کھان پان کا قریب سے مشاہدہ کیا ہو، ان کے درد کو اپنے خون جگر میں انڈیلا ہو، تو بلا خوف یہ کہا جا سکتا ہے کہ صغیر رحمانی نے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے راستے محض اس لیے ناپے ہیں تا کہ دیہی کلچر، دلتوں کے مسائل و مشکلات، بہار کی معاشرتی صورتحال کی تصویر زیادہ مؤثر طریقے سے کھینچ سکیں۔ اپنے ناول تخم خوں کے ضمن میں مصنف صغیر رحمانی خود رقم طراز ہیں:

> ''میرا موقف اس پر ہے۔۔۔ کہ ادب معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے، تو اس آئینے میں تو سب کچھ دکھنا چاہئے۔ تخم خوں ؛ وہی آئینہ ہے۔ جب آپ اس کے روبرو کھڑے ہوں گے تو آپ کو اس میں بہار کے دیہی سماج کا وہ چہرہ نظر آئے گا جو آپ نے ہم عصر اردو ادب میں شاید ہی (یہ میرا دعویٰ نہیں، یقین ہے) دیکھا ہو۔''

اس ناول میں کئی اہم کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ناول کے مرکزی کردار ٹینگر اور اس کی بیوی بلایتی ہیں۔ جو دلتوں کے چمار ٹولے سے تعلق رکھتے ہیں اور زمینداروں کے

کھیتوں پر مزدوری کرتے ہیں ۔ٹینگر نامرد ہے دونوں میاں بیوی اولاد کے سکھ سے محروم ہیں بالخصوص بلایتی بچے کے لیے زیادہ چھٹپٹاتی ہے۔ اولاد سے محرومی ایک عورت کے لیے انتہائی تکلیف دہ بات ہے۔خاص کر ایسی عورت کے لیے جو پورے گاؤں کی زچگی کراتی ہے اور ایسے موقعوں پر بلایتی گاؤں والوں کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ٹینگر کو اپنی نامردی کا ہمیشہ قلق رہتا ہے لیکن کبھی اپنے دکھ کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتا جبکہ بلایتی بچے کے حوالے سے امید کی جوت جلائے رکھتی ہے۔ یہی امید اور ناامیدی کی کیفیت ناول میں بھی ملتی ہے ۔ناول کا بیشتر حصہ بچے کے لیے بلایتی کی جدو جہد کو محیط ہے۔ اپنی اس ازلی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہر حد لانگھنے کو تیار ہے۔لہذا بلایتی ایک جانے مانے گیانی اوجھا جی کے پاس جاتی ہے تا کہ وہ کوئی حل بتا سکیں ،اوجھا جی اس سے کہتے ہیں ''مرد کو ساتھ لے کر آ.... تیری سمسیا کا سمادھان ہو جائے گا۔'' تو وہ اپنے پتی ٹینگر رام کو ان کے پاس لے جاتی ہے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر جو کچھ کہتا ہے اور جو سمادھان بتاتا ہے وہ بلایتی کی زندگی کا المیہ بن جاتا ہے۔وہ کہتا ہے:

> ''کھیت ہی خراب ہے، بیج انکھوا نہیں پا رہا ہے، کھیت کسی برہمن سے شدھ کرانا ہوگا۔''

اس کی باتیں سن کر بلایتی متحیر ہو جاتی ہے لیکن اپنی ممتا کی تسکین کے لیے وہ ہر اقدام اٹھانے کو تیار ہو جاتی ہے اور کسی ایسے برہمن کو تلاشنے لگتی ہے جو اس کے کھیت کو شدھ کر دے۔اس کام کے لیے اسے پنڈت کانا تیواری زیادہ موزوں لگتے ہیں دو چار بار چکر لگانے کے بعد ایک دن وہ اپنی عرضداشت ان کے سامنے بیان کر دیتی ہے:

> ''پنڈت جی میرا کھیت شدھ کر دیجئے .....اوجھا جی نے کہا تھا کسی باہمن سے....

اس کی بات سن کر پنڈت جی تلملاتے ہوئے جواب دیتے ہیں:

''ارے تو کیا چاہتی ہے، میں تیرا کھیت شدھ کروں؟ میں تیرے ساتھ سمبھوگ کروں؟ میں؟ ایک براہمن؟ ارے نیچ ذات کیوں میرا ستیاناش کرنے پر تلی ہے؟ کیوں میرے کل ونش کا ناش کرنے پر تلی ہے؟ میں یہ نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا۔''

ایک برہمن کی منت سماجت کرنا بلایتی کو ذرا بھی معیوب نہیں لگتا کہ وہ ایک غیر مرد کو ناجائز تعلق استوار کرنے پر بضد ہے کیونکہ یہاں اس کا مقصد محض اپنی گود ہری کرنا ہے لیکن یہ بات لوگوں کے اندھ وشواس اور ضعیف الاعتقادی کا مظہر ہے۔ اسے تو وہی کرنا ہے جس کی اوجھا نے قید لگائی ہے۔ اس سے ایک دوسرے پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اوجھا جیسے ڈھونگیئے عوام کو گمراہ کر کے ان پر اپنی برتری کا رعب جھاڑتے ہیں اور خود کو عوام کی خوشیوں، امیدوں اور محرومیوں کا ضامن سمجھنے لگتے ہیں۔ کھیت کی شدھی کے لیے برہمن کی قید لگانے سے جو رعب و دبدبہ بلایتی اور اس جیسے اندھی تقلید کرنے والوں پر پڑا وہ اس بات سے کہ کسی بھی ذات کے مرد سے شدھی ہونی چاہئے، ہرگز نہیں پڑتا۔ آج ہمارا ملک صرف جسمانی غلامی کی بیڑیوں سے تو آزاد ہے لیکن ذہنی اور نفسیاتی طور پر یہاں کے لوگ آج بھی غلام ہیں، اندھ وشواسی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ تعلیمی بیداری سے بے بہرہ ہیں۔

'تخم خوں' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں غریبوں، مزدوروں، جاہل دیہاتیوں اور عوام الناس کی تصویریں اس قدر صاف اور خوف ناک ہیں کہ اس پر ہلکی سے ہلکی نظر ڈالنے والا بھی دہل جائے۔ المناک وارداتوں اور ناقابل بیان کلفتوں سے لبالب بھری زندگی تقریباً ۳۵۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ناول کہیں قاری کو سسکنے پر مجبور کر دیتا ہے تو کہیں زیر لب مسکرانے پر۔ اس مسکراہٹ کا سبب ہے پنڈت کانا تیواری کے توتلے اور معذور بیٹے ''من

جی بابا'' کی زبان سے مکمل توتلے الفاظ کا ادا ہونا جو ناول نگار کی تخلیقی صلاحیت اور زبان و بیان پر مکمل عبور کی واضح دلیل ہیں:

''آدہی آیا ہوں لیتن تو تون ہے؟ تا ہے آئی ہے؟''من جی بابا نے سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔

''بابا۔۔۔میں بلایت۔۔۔۔'' وہ رک رک کر بول پائی۔

''اسے بلائتی تو ہے؟اتنی بلی ہودئی؟ اتھا بول تیا تام ہے۔''[ص ۵۵]

صغیر رحمانی نے کردار نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے توسط سے ناول کی بنت میں جس نہج کی مہارت اور مشاقی کا مظاہرہ کیا ہے اور مکالموں کی مدد سے کرداروں کی سوچ اور فکر تک جس انداز سے رسائی حاصل کی ہے یہ ان کے گہرے مشاہدہ اور تجربے کو ظاہر کرتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کردار تخلیق کرنے سے پہلے ان سے ملتے جلتے کرداروں کی زندگیوں، ان کے مسائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے تب جا کر ان کے ناول کے کردار وجود میں آئے ہیں۔عبدالصمد صغیر رحمانی کو لکھے گئے ایک خط میں ناول 'تخم خوں' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا کچھ یوں اظہار کرتے ہیں:

''مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے جس معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے اس کی اتنی صحیح عکاسی آپ کیسے کر سکے ہیں؟ ان لوگوں کے رہن سہن، بولی چالی، کھانے پینے، مزاج، دیوہار کی ایسی واقفیت آپ کیسے حاصل کر سکے ہیں؟.....آپ نے ناول میں اپنے کرداروں کی زبان ہی استعمال کی ہے جو ظاہر ہے بہت عام فہم نہیں ہے، پھر بھی پڑھنے والے کی دلچسپی اس میں برقرار رہتی ہے۔اس کی وجہ.....کہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو زندہ و آئندہ ہے، ہمارے آس پاس کا

ہے، ہم کسی نہ کسی صورت میں تقریباً روز ہی اس سے نبرد آزما ہوتے
ہیں۔اردو میں اس موضوع پر بہت پہلے لکھنا چاہئے تھا۔میں نے
بھی 'دھمک' میں اس موضوع کو ہاتھ لگایا تھا، مگر آپ نے جس عرق
ریزی اور گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا ہے، وہ صرف آپ کا ہی حصہ
بن گیا ہے۔نہ صرف موضوع بلکہ کہانی کا اتار چڑھاؤ اور کردار نگاری
یادرکھنے کی چیزیں ہیں۔ مجھے خاص طور پر یہ بات بہت اچھی لگی کہ
سب کچھ تباہ ہو جانے کے بعد بھی آپ نے مستقبل کی ایک روشن لکیر
کو بچایا۔میرا ہمیشہ سے یہ ایمان رہا ہے کہ ناول نگار یا افسانہ نگار کو گھٹا
گھور تاریکی میں بھی ایک روشن لکیر کو بچالینا چاہئے۔یہ ایک ناول نگار
کا منصب ہے۔اس کی تحریر ایک خفیہ پیغام ضرور ہونا چاہئے ورنہ پھر
لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔آپ نے ایک ناول نگار کی حیثیت سے اپنے
منصب کو خوب پہچانا ہے۔''

اس ناول میں صوبۂ بہار کے معاشرتی نظام میں رائج توہم پرستی ،روایت پرستی اورغلط مذہبی رسوم کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔سماج کئی ذاتوں میں بٹا ہوا ہے ، برہمن ، کھشتریہ وغیرہ ،اونچی ذات والے خودکو ناف کا اوپری حصہ یعنی سب سے افضل و برتر تصور کرتے ہیں جبکہ اپنے سے نیچی ذات کو ناف کے نچلے حصہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ذات کی یہی تفریق ناول کی تقسیم کو دو طبقاتی حصوں میں منقسم کرتی ہے ایک حصہ میں اعلیٰ وادنی کے مابین پنپنے والے تضادات پر روشنی پڑتی ہے اور دوسرے حصہ میں بلایتی کی جدو جہد اور کشاکش سامنے آتی ہے۔ایک فرقے کی نمائندگی پنڈت کانا تیواری، پاٹھک جی کرتے ہیں دوسرے کی بلایتی۔ یہ لوگ ان پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے سبھی حربے استعمال کرتے ہیں

۔ نچلی ذات والوں پر ظلم و جبر کرنا، استحصال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ اسی لیے پنڈت کانا تیواری کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے اس کی بدنامی اور رتبے میں کمی واقع ہو۔

پنڈت ہونے کے ناتے برہمنوں کا رعب و دبدبہ باقی دلتوں اور شیڈیول کاسٹ کے لوگوں پر جمانے کے لیے سبھائیں کرتا ہے، لیکن دوسری جانب چوری چھپے حیوانوں کی ہڈیوں کا گھٹیا پیشہ کرتا ہے۔ اور اس کاروبار کا بے نامی لائسنس ٹینگر کے نام پر ایک شیڈیول کاسٹ افسر ہی سے ایشو کراتا ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے ٹینگر کی بیوی بلایتی کو استعمال کرتا ہے۔ اپنی غرض کے لیے یہ لوگ ہر طریقے کو جائز سمجھتے ہیں۔

ان کے اس استحصال کا صرف ایک ہی طبقہ ذمہ دار نہیں ہے دیکھا جائے تو یہ لوگ خود بھی اپنے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، اس طرح کہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج نہیں کرتے اور اپنی عزت و بے عزتی کی کوئی پروا نہیں، دوسرے کہ وہ خود ان کے ساتھ ایسے ناجائز کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں جس میں اپنا مفاد شامل ہو۔ تبھی تو انجانے میں ٹینگر اپنی بیوی کو خود شاطر پنڈت کانا تیواری کے ساتھ بی ڈی او کی جنسی تکمیل کے لیے اس کے پاس چھوڑ کر آتا ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ ساتھ پنڈت کے ہاتھوں اپنا بھی استحصال کراتا ہے اس بات کا انکشاف اسے اس وقت ہوتا ہے جب گاؤں کے ہسپتال میں جانوروں کے معالجہ کے لیے جو ٹیکے اور دوائیاں آتی ہیں اور کانا تیواری اپنے منافع کی غرض سے ان میں ہیر پھیر کر کے ٹینگر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کرا دیتا ہے۔ تب ٹینگر ساری صورتحال پر غور کر کے پنڈت کانا تیواری سے دریافت کرتا ہے ''ہجور! آپ کے جانور کیوں نہیں مرے تھے؟'' اس سازش کے ظاہر ہوتے ہی سارے گاؤں میں برہمنوں اور پنڈتوں کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ چمار اور دلت اپنی غربت اور ناخواندگی کے باعث سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر آگے بڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ انھیں منظم کرنے کے

لیے کمیونسٹ خاص کر نکسل وادی کمیونسٹ دن رات لگے رہتے ہیں۔ جو بعد میں ایک سیاسی ایشو بن جاتا ہے، جس کا ناول میں تفصیلی ذکر ہے۔

گاؤں کے حالات ناسازگار ہونے کے باوجود بلایتی پنڈت کا ناتیواری کے گھر کام کرنا نہیں چھوڑتی ۔ کیونکہ اس گھر سے اس کا کافی پرانا رشتہ ہے اور وہ رشتہ من جی بابا سے ہے۔ من جی بابا پنڈت کا ناتیواری کی اکلوتی اولاد تھی۔ پیدائشی معذور۔ چھ، سات سال قبل جب پنڈتائین کا انتقال ہوا تھا، وہ صرف نو سال کے تھے۔ اس وقت بلایتی ہی تھی جس نے ان کا ہر اچھا برا کام کیا تھا۔ پھر وہ اپنی موسی کے یہاں شہر چلے گئے، بس چند دنوں کے لیے ہی بیچ بیچ میں گاؤں کا چکر لگا لیتے تھے۔ اکثر جب بلایتی رات کی تاریکی میں پنڈت سے ملنے آتی تو من جی بابا سے اُس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ۔ بلایتی پنڈت کے گھر کے چکر صرف اپنی مراد پانے کے لیے ہی لگاتی تھی لیکن پنڈت اس کو ایک چال سمجھتا تھا۔ جب بھی وہ کھیت شدھی کی بات کرتی پنڈت ہمیشہ اس کی تذلیل کرتا:

> ''ارے نیچ ذات! اب میں تجھ سے کیا کہوں؟ تم لوگ تو سر پر چڑھ کر موتنے لگے ہو۔ اصل میں قصور تم لوگوں کا نہیں ہے۔ یہ سب 'لال جھنڈ ین' کروا رہا ہے۔ ان ہی سبوں نے تم لوگوں کو ہاتھی کے کان پر چڑھا رکھا ہے۔ کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں رہے ہو تم لوگ ۔ جو منہ میں آ رہا ہے، بول بک دے رہے ہو لیکن میں بھی کہہ رہا ہوں ۔ یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو جس سازش کے تحت یہاں آ رہی ہے، اس میں میں تجھے کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اب تو جا یہاں سے۔''

اس ناول کا مرکزی حصہ یہی ہے کہ پنڈت اس وجہ سے بلایتی کو دھتکار دیتا ہے کہ

ایک شودر کے ساتھ شہوانی عمل کرنے سے وہ حاملہ ہوسکتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ ایک براہمن کنیا یا پتر کو جنم دیگی۔ پھر اسکی شادی اپنی ہی ذات یعنی کہ کسی شودر سے کریگی۔ اس حالت میں اگر کنیا ہوئی تو ایک براہمن کنیا کا بھوگ ایک شودر کرے گا۔ یہ براہمن وادکی انتہا ہے کہ وہ بلایتی کی التجا کو بھی رد کردیتا ہے کہ وہ ایک چمائین ہے لیکن دوسری طرف یہ پنڈت اور برہمن دوغلی زندگی جیتے ہیں۔ منہ میں رام رام اور دلوں میں تعصب، بھرشٹاچار اور لالچ جس کی عمدہ مثال ناول کا اثر انگیز کردار، پنڈت کانا تیواری ہے۔ جو کسی نچلی ذات سے مس ہو جانے کو اپنا دھرم بھرشٹ ہونا سمجھتے ہیں۔ کہانی میں ٹوسٹ تب آتا ہے جب اتفاقاً ایک واقعے میں پنڈت کانا تیواری کا بیٹا من جی بابا بلایتی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتا ہے اور بلایتی حاملہ ہو جاتی ہے۔ جس کام کے لیے پنڈت آخری وقت تک منکر رہتا ہے وہ اس کا بیٹا من جی بابا بلایتی کے ساتھ زور زبردستی کر کے انجام دے دیتا ہے۔ اس طرح بلایتی کے کھیت کی شدھی بھی ہو جاتی ہے اور برسوں پرانی اس کی خواہش کی تکمیل بھی۔ پنڈت اسکا حمل گروانے کے لئے کون جتن نہیں کرتا کہ اس کے حمل میں پنڈت کی اپنی ہار صاف نظر آرہی تھی۔ پنچایت انتخابات میں بلایتی کے مقابلے کسی طور جیت حاصل کر لینے پر پنڈت بڑے غرور سے کہتا ہے کہ ''مجھ سے ٹکرانے چلی تھی، پہاڑ سے ٹکرانے چلی تھی، ہم صرف جیتنے کے لئے ہیں، ہم صرف جیتتے ہیں۔۔۔'' تب بلایتی کا یہ کہنا۔۔۔ ''نہیں مالک، آپکی ہار تو میری کوکھ میں پل رہی ہے۔۔۔'' ایک کھلا چیلینج ہے براہمن وادی اور منووادی نظام پر اور بلایتی کا یہ چیلینج اس نظام کو پوری طرح سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

پہلی نظر میں یہاں کچھ سوال ذہن میں کوندنے لگتے ہیں کہ اب جبکہ بلایتی کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہونے جارہی ہے پنڈت کے معذور بیٹے کے توسط سے ہی صحیح، لیکن وہ اس معاملے کی تشہیر کر کے اس کو زنا بالجبر قرار دے کر تنازعہ کیوں کھڑا کرتی ہے؟ اسے تو اس بات

کو پردۂ راز میں رکھنا چاہئے تھا۔ بلایتی کے بلاتکار کے بارے میں تنظیم کو کس نے مطلع کیا؟ اس راز سے تو صرف بلایتی اور من جی بابا کے سوا کوئی واقف نہیں تھا؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ وہ اپنا کھیت شدھ کرانے پنڈت کے پاس جاتی تھی کہ یہ اسکی اپنی مرضی تھی لیکن من جی بابا نے جو کیا اس میں مرضی کا نہیں زبردستی کا دخل تھا اور ہمیں اثبات ونفی کے اس باریک فرق کو سمجھنا ہوگا۔ اسی طرح قاری ٹینگر کے کردار کو لیکر بھی کسی حد تک بھول بھلیا کا شکار ہوسکتا ہے کہ اتنا سب کچھ ہوجانے کے باوجود کہ اس کی اپنی بیوی انتہائی اذیت میں ہے، خود اپنا ہی چمار طبقہ چاروں طرف سے آفتوں اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ ٹینگر تب بھی پنڈت کی غلامی کرتا رہتا ہے اس کی زیادتیوں اور ناقابل تلافی کرتوتوں کو جان بوجھ کر پوشیدہ رکھتا ہے۔ مزید برآں کہ نکسل وادتنظیموں سے بھی وابستہ رہتا ہے۔ حالانکہ کہ یہ دونوں ہی مرکزی کردار ہیں اور دلت طبقہ کے نمائندہ بھی۔ اگر یہ لوگ اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور جبر کے خلاف مظاہرہ کرتے، سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر اس پر اکتفا کر کے نہیں بیٹھ جاتے تو یوں ساری زندگی ذہنی عذاب اور جسمانی کلفتوں سے دوچار نہیں ہوتے، لیکن چونکہ صغیر رحمانی نے دیہی سماج کی جیتی جاگتی تصویر کی عکاسی کی ہے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ آج بھی اس سماج میں ایسے کردار ہیں جو اپنے مالک کو اپنا خدا سمجھتے ہیں اور اس کے خلاف جانا گناہ کبیرہ سے کم تصور نہیں کرتے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے ''امروز'' کو دئے گئے ایک انٹرویو کے ایک سوال کے جواب میں سید محمد اشرف صغیر رحمانی کے ناول ''تخم خوں'' کے موضوع، پلاٹ اور کردار سے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''۲۰۱۶ میں صغیر رحمانی کا ناول ''تخم خوں'' شائع ہوا ہے جو ایک ایسے موضوع پر ہے جو اردو میں کم لکھا جاتا ہے.... صغیر رحمانی کے ناول تخم

خوں میں بہار کے دلتوں کا ذکر جس انداز میں ہے اور وہاں احتجاج کا
علم اٹھانے والے دیہات کے غریبوں کا جس انداز میں طویل بیانیے
میں ذکر ہوا ہے وہ اس بات کی راہ روشن کرتا ہے کہ اردو فکشن بھی
سمانتر کہانیوں کا جواب رکھتا ہے۔ تھیم، پلاٹ عام اردو داں طبقہ کے
لیے نامانوس کردار اور ان کے نام، مقامی بولی اور بلاشبہ سینکڑوں
اسمائے معرفہ کا فطری استعمال اور ناول کی ہیروئن 'بلایتی' کا
کردار اسے ایک یادگار تخلیق بناتا ہے۔ یادگار بھی اور مختلف بھی۔"

ناول کے دوسرے کرداروں میں مانجھی کا کردار متاثر کرتا ہے جو ابتدا تا آخر اپنے ارادوں کا پابند رہتا ہے اور اپنے ساتھیوں جیسے چندر رام اور سکھاڑی کے ساتھ مل کر تنظیم کے کام انجام دینے میں متحرک رہتا ہے۔ اگھورن کے کردار سے بھی صغیر رحمانی نے بڑی حد تک انصاف کیا ہے۔ وہ تشدد کے خلاف ہے اور نکسلی تحریک کے خلاف مظاہرہ کرتا ہے" کرانتی کرنے والے....؟ تم کب سے کرانتی کرنے والے ہوگئے..؟ کرانتی کا بیسوا کا نتھ ہے جسے کوئی بھی اتار لے...؟ کاہے کھود سے منہ میاں مٹھو بنتے ہو...؟........ "کرانتی کرنے والے ۔کرانتی کاری... کمریڈ... اتنے سالوں میں .... پچھلے لگ بھگ چالیس پینتالیس سالوں میں کھون کھرابا کے الاوا کون سی کرانتی کردی ہے تم نے ...؟ کون سا بھلا کردیا ہے تم نے غریبوں کا...؟" (ص ۳۴۰)

یہ کلمات محض کلمات نہیں ہیں بلکہ اس بات کا اشارہ ہیں کہ ہندوستان میں نکسلی تحریک کے پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے پیچھے بنیادی وجہ اس تحریک کا بے راہ روی کا شکار ہو جانا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بات بلا تردید کہی جاسکتی ہے کہ ناول 'تخم خوں' میں زندگی کے بے رحم پہلوؤں اور عصری تقاضوں کے بدلتے نظام کی پیش کش اور دلت سائیکی، اس

طبقے میں آنے والی فکری تبدیلیوں کو پیش کر کے صغیر رحمانی نے دلت لفظیات اور ترقی پسند جمالیات کا از سرِ نو ترتیب کا جواز پیش کیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہت صاف ،سلیس اور سلجھا ہوا ناول ہے۔ اسی لیے بہاری معاشرہ کی بول چال ،رسم و رواج کے بے حد قریب ہوگیا ہے۔ صغیر رحمانی نے جس مسئلہ کو اٹھایا اور جس معاشرہ کے حسن و قبح کو وہ منظر عام پر لانا چاہتے تھے اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اپنے خیال کی تصدیق کے طور پر دیپک بدکی کا یہ قول نقل کرنا چاہوں گی جس کا اظہار انھوں نے اس ناول کے حوالے سے کیا ہے ملاحظہ ہو:

> ''صغیر رحمانی نے ناول کو بہار کے سیاسی و سماجی تناظر میں پیش کیا ہے اور بڑی دقیقہ شناسی سے نہ صرف موضوع بلکہ کرداروں اور واقعات کو بھی چن لیا ہے ۔ بہار ایک ایسی جگہ ہے جہاں موسم ، قانون اور سیاست پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کب کون کیسا رنگ اختیار کر لے کسی کو نہیں معلوم ۔ ناول 'تخم خون' اسی معاشرے کو آئینہ دکھانے کی کامیاب کوشش ہے۔ ناول، ظاہر ہے ایک بہت بڑا کینواس ہوتا ہے جس میں اگر ناول نگار چستی اور مرکزیت پر دھیان نہ دے ،تو بیانیہ میں جھول پڑنے کا خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے ناول نگار کافی کامیاب رہے ہیں۔ برہمن واد اور سامنت واد پر مبنی یہ ناول دلت ڈسکورس پر ایک اچھا اضافہ ہے حالانکہ بعض جگہ قنوطیت حاوی ہو چکی ہے ۔ ناول میں موجودہ دور کی جمہوریت ، افسر شاہی ، رشوت خوری، پولیس کی زیادتیوں اور تصویری تشہیر کو بڑی ہنر مندی سے بیان کیا گیا ہے۔ ذات پات پر جوڑ توڑ ،غنڈہ گردی ،سرکاری عنانت

وانفعالیت، اگڑوں کی حمایت اور پچھڑوں کی نظر اندازی ، ووٹ کی
سیاست اور میکانیت وخودکاری کے اثر پر بھی خوب روشنی ڈالی گئی ہے
۔ناول کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ہماری دیہاتی زندگی پریم چند
کے زمانے سے زیادہ آگے نہیں بڑھی ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس
وقت بدیشی حکمراں تھے اور اب سودیشی ہیں۔''

چلیے اب ایک بار پھر ہم رخ کرتے ہیں صغیر رحمانی کے افسانوں کی جانب۔

صغیر رحمانی کا افسانہ 'واپسی سے پہلے' جب شائع ہوا تو اس نے جلد ہی اردو داں حلقہ کو اپنی جانب متوجہ کرلیا، ان کے اسلوب اور افسانے کی کرافٹ نے ڈاکٹر محمد حسن کو بھی چونکا دیا اور ڈاکٹر حسن صاحب رسالہ عصری ادب کے اداریہ میں یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''اس بار ہمارا دامن نایاب تحفوں سے بھرا ہے۔خاص طور پر افسانے
ایسے چنے گئے ہیں کہ اس سے قبل ''عصری ادب'' کو شاید میسر ہوئے
ہوں۔ان میں بھی سب سے نمایاں ہے ''واپسی سے پہلے''۔کسی
طرح یقین نہیں آتا کہ روس کی زندگی کے بارے میں ہی نہیں، وہاں
کی عالمگیر معنویت رکھنے والے حالات پر ایسا بھر پور افسانہ
ہندوستان میں لکھا جاسکتا ہے۔کیسا تازہ، کیسا خیال افروز۔۔۔''

صغیر رحمانی کے افسانے بالخصوص 'چھو۔تی۔تی۔تا' اور 'ناف کے نیچے' مذکورہ ناول میں پیش کردہ موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔۱۹۱۷ میں سرمایہ دارانہ نظام، بورژوا اور فیوڈل طبقہ کے خلاف روس میں آنے والے انقلاب عظیم نے ساری دنیا کے استحصالی طبقوں ،بڑے بڑے مفکروں، ادیبوں اور سماجی رہنماؤں کو متاثر کیا تھا۔''واپسی سے پہلے'' افسانے میں روس کے اسی اشتراکی نظام اور کمیونزم کے زوال کو موضوع بنایا گیا ہے۔افسانہ کا

کردار دموع ترقی اور تبدیلی کی بجھتی مشعل کو روشن رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔اس افسانے میں پرانا اگرچہ برا نہ ہو، اسے نئے پر فوقیت دی گئی ہے۔ بقول افسانے کی کردار الیوا:

''جسے ہم پرانا کہتے ہیں اور جس کی بنیاد پر تبدیلی کی مانگ کرتے ہیں، برا بھی ہو، ناکام بھی ہو اور اس بات کو دموع سمجھتے ہوں گے اور ہم اور آپ بھی کہ اسے ناکام نہیں کہا جا سکتا۔''

بعد ازاں الیوا نامی لڑکی بھی اس مشن میں اس کی ہمنوا بن جاتی ہے۔چونکہ تبدیلی کائنات کا فطری معمول ہے، دموع اور اس کے ساتھی موجودہ نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور بنا کسی جارحانہ ردعمل کے تبدیلی کی مانگ کرتے ہیں۔ وہ بورژوا اور سرمایہ دار طبقے کی نئی استحصالی نوعیتوں اور قوتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے آواز اٹھاتے ہیں اور تبدیلی سے متعلق کچھ لازمی امور پر سوالیہ نشان قائم کر کے پورے سماجی نظام کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

''ا۔بھوک سرمایہ داری کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔''

''۲۔اس فرسودہ نظام کی بنیاد آزاد مارکیٹ کے اندھے تقاضوں پر ٹکی ہے۔''

''۳۔کیا انسانی ارتقا محض ایک دھوکہ ہے؟''

''۴۔کیا دبے کچلے انسانوں کی تقدیر میں ایک رات کے بعد دوسری رات لکھی ہے؟''

یہ ایسے سوال ہیں جو ہر اس ملک، ہر اس سماج اور ہر اس نظام میں اٹھائے جاتے رہے ہیں اور اٹھائے جاتے رہیں گے جب جب طاقتور کمزور کو دباتا رہے گا۔اور یہ صرف سوال ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کا وہ کڑوا سچ ہے جسے پینے کی یا اس کا سامنا کرنے کی ہر کسی میں ہمت نہیں۔لیکن ہر ذی حس اور صاحب ضمیر کو بیدار ضرور کر سکتا ہے۔لہٰذا دموع، الیوا اور اس کے ساتھی ان Aspects کے ساتھ ایسی تبدیلی کی خواہش کرتے ہیں جس میں نئے

سے پرانے نظام کی تجدید اس طرح ہو کہ ملک کی کھوئی ہوئی عظیم تاریخ و تہذیب زندہ ہو سکے اور آنے والا کل روشن و تسلی بخش ہو۔

جبکہ کہانی 'مونا' میں ایک طرف ازدواجی زندگی کے مسائل، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت پر روشنی ڈالی گئی ہے تو وہیں دوسری طرف کہانی کے مرکزی کردار مونا کے توسط سے ایسے انسانوں سے ہمدردی اور ترحم کا جذبہ پیدا کیا گیا ہے جن کو غیر تو دور اپنے بھی قابل ترس اور لائق ہمدردی نہیں سمجھتے۔ یہ ہیں ہاتھ پاؤں سے معذور، گلے سڑے کوڑھ کے وہ مریض جنھیں ان کے ہی عزیزوں نے وجود کے کسی ناکارہ حصہ کی مانند اپنی زندگی سے کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ ایسے قابل نفریں لوگوں کے لیے مونا اپنی محبت اور اپنی پوری زندگی وقف کر دیتی ہے۔ ان کی جسمانی کلفتوں اور زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ پوری لگن اور تن من دھن سے ان کی ماں بن کر خدمت انجام دیتی ہے۔ وہ فرانس سے ہندوستان بھی محض اسی مقصد کے لیے روانہ ہوتی ہے جہاں ایسے افراد کی تعداد اور حالت دیگر ممالک کے برعکس دگر گوں ہے۔

افسانہ 'جہاد'، 'لیکن یہ' اور 'داڑھی' وغیرہ خوف و دہشت گردی، مذہبی تعصبات، مسلمانوں کے دینی و دنیاوی اصول وعلوم کا زوال، ماحول سے ناہم آہنگی، تنازعات اور اسلام فوبیا جیسے عناصر کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی اقدار روز بروز مختلف قسم کے مصائب و خطرات کا نشانہ بنتی جا رہی ہیں۔ گزشتہ تمام موضوعات سے متعلق دیگر افسانہ نگاروں نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس ضمن میں طاہر انجم صدیقی کا 'ابلیس اعظم' ایم مبین کا 'نئی صدی کا عذاب' خورشید حیات کا 'انسانیت کے دشمن' اور ارشد نیاز کا 'یہ جہاد نہیں انتقام ہے' افسانے قابل ذکر ہیں۔ افسانہ 'جہاد' ایک ایسے ضعیف الاعتقاد تبلیغی ملا کی کہانی ہے جس کے اندر اسلامی تعلیمات کی بُو باس

ہے اور نہ سمجھ بوجھ۔لیکن وہ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتا ہے ۔بنا علم اور تعلیم کے نہ مسلمانوں میں بیداری لائی جاسکتی ہے اور نہ اسلام کی صحیح شناخت کرانا ممکن ہے اس سے تو مذہب کو نقصان ہی پہنچے گا۔شمس جیسے جہادی مبلغوں کے''جہادٗ'' سے اسلام کی چھوی بجائے درست ہونے کے مزید خراب ہو جاتی ہے،اور ایسے ہی لائق نفریں کرداروں سے مل کر وہ فسادی طبقہ تشکیل پاتا ہے،جو عام مسلموں کو داڑھی یا انکی ظاہری ہیئت کی بنا پر دہشت گرد بنا دیا جاتا ہے۔صغیر رحمانی نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جہاد کی باتیں کر کے تبلیغ اور جہاد کی ترغیب دینا ہی خدا کی خشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ انسانیت کی خدمات انجام دینا،ضرورت کے وقت کسی کی حاجت روائی کرنا بھی جہاد ہے۔افسانہ کی قرأت کے دوران قاری بھاگلپور،میرٹھ،ممبئ، گجرات کے واقعات پر کڑھنے یا ایران،عراق، افغانستان اور پاکستان کے لیے تڑپنے والے جہادی ملا سے ہمدردی رکھنے کے بجائے اس محنت کش درزی کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے جو ایک حادثے میں زخمی ہونے والے اپنے پڑوسی کو خون دینے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اس افسانہ کے وسیلے سے صغیر رحمانی نے مسلمانوں کو اپنے تہذیبی اثاثے کو محفوظ کرنے ،خدمت خلق کی جانب مائل کرنے ،باہم متحد ہونے ،اور عصری تقاضوں کے تئیں احساس بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔محمد حمید شاہد جہادٗ کے معنی و مفہوم کو آج کے تناظر میں پیش کرتے ہوئے صغیر رحمانی کے افسانے''جہادٗ''پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس عہد میں ہم جی رہے ہیں اسے محض حواس باختگی کا زمانہ ہی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں زندگی کے لطف اور اس کے اندر موجود تخلیقیت کو لذت اور افادیت سے بدل لیا گیا ہے۔جی صاف لفظوں میں کہوں تو یوں ہے کہ تخلیقی عمل جو انسانی زندگی کو ایک خاص لطف سے ہمکنار

کرتا تھا وہ آج کے عہد کی بظاہر ترجیحات میں کہیں نہیں ہے۔میڈیا کی
مقبولت اور پھیلاؤ نے جس نمائشی اور لذیذ زندگی کو مابعد جدیدیت
والے جدید تر آدمی کے لیے نمونہ بنا دیا ہے، اس نے تہذیبی اور
اقداری نظام میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ایسی دراڑیں....مثلاً دیکھیے
کہ ''جہاد'' ان دنوں تک کہ جب تک روس افغانستان میں پسپا نہیں
ہوا تھا، سامراجی قوتوں کا محبوب بیانیہ تھا۔ بدلی ہوئی صورت حال
میں، جہادی آدمی مردود ہو گیا ہے مگر اپنے رد کیے جانے تک اس آدمی
نے اس مذہبی اصطلاح کے معنی تک بدل کر رکھ دیے ہیں۔''جہاد''
نامی افسانے کا شمس، دین کے جس تصور کی تبلیغ کر رہا ہے، اس کی
صورت بہت بگڑ چکی ہے، اب تو اس کی نسل بھی اس بگاڑ کا شکار بن
رہی ہے۔اس کے مقابلے میں ہمارے افسانہ نگار نے اس کردار کو
اہمیت دی ہے جو اپنے بچوں کی پرورش اپنی محنت سے کمائے ہوئے
رزق سے کرتا ہے۔''

افسانہ ''لیکن یہ'' دہشت گردی اور آتنک واد جیسے خوفناک رجحان پر مبنی ہے۔طویل عرصہ سے ملک میں ہونے والے دنگوں، دہشت گردانہ حملوں اور فسادات کے لیے اسلام اور مسلمانوں کو براہ راست ٹارگیٹ کیا جاتا رہا ہے۔معاملہ خواہ بھاگلپور، میرٹھ، ممبئی، یا گجرات فساد کا ہو، گودھرایا اکشر دھام کا ہو، ورلڈ ٹریڈ سینٹر، سنسد بھون پر حملوں کا ہو، یا بابری مسجد کا انہدام، جے پور، احمد آباد، کشمیر، یا غیر ملکی سطح پر اسرائیل، فلسطین، بغداد، پاکستان وغیرہ ہی کیوں نہ ہوں ان سب کے لیے مسلم قوم کو ہی نشانۂ ہدف بنایا جاتا ہے۔موجودہ صدی میں ایک اور نام کا اضافہ ہوا ہے وہ ہے 'دہشت گردی خاتمہ مہم' جیسا کہ نام سے ظاہر

ہے کہ اس کا مقصد دہشت گردی کا خاتمہ ہے۔ لیکن اس کے پس پردہ کیا ہورہا ہے غالباً اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں، ہر صاحب بصیرت اس سے ضرور واقف ہوگا۔ اس افسانہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نئی نسل جوان رموز اور سرّیت سے واقف نہیں انھیں کس طرح ان مہم کا شکار بنایا جارہا ہے۔ میڈیا اور محکمۂ پولس کے ذریعہ پھیلائی جانے والی دہشت کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے نئے اور معصوم اذہان میں اسلام کے حوالے سے پیدا ہونے والے استفہام اور الجھنوں کو دور کرنے کے لیے دعوت فکر دی ہے۔ افسانے کے کردار کریم بخش کے ذریعہ مذہب اسلام کی صحیح شناخت کو پیش کیا ہے۔ اور اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی بھی سعی کی ہے جو اسلام کو آتنک واد کا دوسرا نام قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اسلام وحشی ہے....دراصل انسانیت کا دشمن...جو بے گناہوں کا خون بہائے....جو نہتوں پر وار کرے...جو چھپ کر گھات کرے...وہ اسلام نہیں ہوسکتا۔''

صغیر رحمانی نے کمال فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لفظ 'اسلام' کے ذریعہ جو ایہام پیدا کیا ہے اس نے افسانے کو مزید پر کشش اور بامعنی بنادیا ہے۔

افسانہ ''داڑھی'' میں بھی اسی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح مسلمانوں بالخصوص داڑھی والوں کے ذریعہ عوام میں خوف اور سراسیمگی پیدا کی جاتی ہے اور محض داڑھی کی بنا پر انھیں دہشت گرد بنادیا جاتا ہے۔ آج ہم مسلسل خوف، ہراس، نفرت اور سراسیمگی کے سائے میں جی رہے ہیں، اس ہراس اور سراسیمگی نے انسانی اذہان اور قوتوں کو ماؤف کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اس میں سب سے بڑا رول ہے میڈیا کا۔ میڈیا نے ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔ نشہ آور دواؤں کی طرح وہ ہمیں ایسی خبریں سنا کر سلانا

چاہتے ہیں جن سے ذہنوں کو غور کرنے پر زحمت نہ دی جائے۔اس میں سماج کی عام ذہنیت کو پیش کیا گیا ہے۔جس میں ہم خود کسی بھی ایسے شخص کو دہشت گرد سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔یہ افسانہ داڑھی یا دہشت گردی کو ہی موضوع نہیں بناتا بلکہ یہ تو اس دہشت زدگی کو بے نقاب کرتا ہے جو ہمارے وجود میں گھر کیے بیٹھی ہے۔ ہمہ وقت ہم ایک عجب طرح کی بے چینی ،گھبراہٹ اور غیر یقینی سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔چپے چپے پر پولیس ناکے بندیاں ،تلاشی ،سونگھتے کتے ،بندوق سنبھالے فوجی جوان، چلتے چلتے کہیں بھی روک لیا جانا ،سامان کا کھلوایا جانا اور ایک ایک چیز کو باریکی سے دیکھنا، جو انسان کی انا اور روح کو گھائل کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

''داڑھی'' ایک ایسی ہی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے جو دہشت گردی منافقت ،تشدد اور خوف جیسی مشترکہ کیفیات سے عبارت ہے۔اگر کوئی داڑھی والا شخص کسی راستے پر نکل جاتا ہے سفر کر رہا ہوتا ہے تو دوسرے مسافر اُسے مشتبہ و مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں،اس سے بات کرنا یا اس کے قریب بیٹھنا تک معیوب سمجھتے ہیں۔ایسے لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں کہ جس سے داڑھی والا خود کو مجرم تصور کرنے لگتا ہے جیسا کہ مذکورہ افسانے کا بیانیہ ہے۔کہانی ایک عورت اور آٹو ڈرائیور کے باہمی کلام سے آگے بڑھتی ہے۔عورت،عوام کی نمائندہ ہے۔وہ جب اسٹیشن پہنچتی ہے تو ہر کسی کے چہرے سے خوف اور وحشت عیاں ہوتی ہے۔معلوم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ کسی دوسرے شہر میں دہشت گردانہ حملہ ہوا ہے جس نے پورے ملک کو اپنے حصار میں لے لیا ہے اور اسی لیے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر تحفظی انتظامات سخت کر دیے گئے ہیں۔اسی دورانیہ میں کہانی کا ایک کردار مشکوک ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کے چہرے پر داڑھی ہے۔وہ منھ کیوں چھپاتا ہے؟ وہ ادھر ادھر دیکھتا کیوں ہے؟ وہ اٹھ کر کیوں گیا ہے؟ عورت چوں کہ عوام کی نمائندہ ہے اسی لیے وہ بھی

خوف زدہ ہے اور یہ کیفیت اس وقت تک طاری رہتی ہے جب تک وہ سفر ختم نہیں کر لیتی۔ جس مشکوک شخص کی وجہ سے عورت کے دل میں وسوسے گھر کر لیتے ہیں، وہ فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے گویا وہ بھی حالات سے خائف ہے۔ اس وقت کہانی میں ایک موڑ آتا ہے، عورت ٹرین سے اترتے ہی اللہ کا شکر ادا کرتی ہے کہانی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہوتا جیسا کہ سوچتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس حد تک درست ہے؟ ایسے ہی کئی سوال ہیں جو کہانی ختم ہونے کے بعد بھی ذہن کے پردے پر جلتے بجھتے رہتے ہیں۔

اردو میں عرصہ سے جنس کو بطور موضوع برتا جاتا رہا ہے۔ کبھی جنسی نا آسودگی و تشنگی، تو کبھی جنسی مسائل اور پیچیدگیوں نے ادبا کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ صغیر رحمانی کے یہاں بھی چند افسانے ایسے ہیں جن میں جنس کو محورِ توجہ بنایا گیا ہے۔ ''شاہ زادے کی پریم کہانی'' اور ''ایک اور وہ'' افسانوں کی خالص پہچان جنسی عوامل سے ہی ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ان کا مقصود یہاں جنسی تلذذ فراہم کرنا ہرگز نہیں، بلکہ انھوں نے انسانی زندگی میں جنس کی اہمیت و معنویت، نفسیاتی و جنسی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور فرد کی داخلی زندگی کے مہیب گوشوں کو فنی بصیرت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔

'شاہ زادے کی پریم کہانی' میں دو کرداروں عورت اور مرد کے متضاد رویوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ عورت جو مرد کی محبت میں سر تا پاؤں ڈوبی ہوئی ہے جبکہ مرد اس سے اتنا ہی بُعد اور بے رخی اختیار کرتا ہے۔ عورت بے حد حسین اور پر کشش ہوتی ہے کوئی بھی مرد بآسانی اس پر نچھاور ہو سکتا تھا لیکن یہ مرد عورت کے برعکس معمولی شکل و صورت کا ہے اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے عورت کے لیے وہ جنسی اسرار اور لذتوں کا مرکب تھا۔ وہ اس سے روحانی محبت کرتی ہے لیکن اس کا خیال تھا کہ ''جسم کا سفر طے کیے بغیر روح کی منزل تک نہیں

پہنچا جا سکتا۔'' مگر یہ مرد اس کے لاکھ جتن اور ہزار کوششوں کے باوجود رتی برابر بھی نظر التفات نہیں کرتا وہ اس کے گریز پا رہنے کی وجہ نہیں سمجھ پاتی۔ اس کی دل بستگی کے لیے شراب و شباب کی محفلیں آراستہ کرتی ہے، اس کی اداسیوں کو رفع کرنے کے سامان مہیا کرتی ہے ۔لیکن اس کے سارے جتن ساری کوششیں خاک بسر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک روز دوران رقص ہیجانی کیفیت سے مغلوب ہو کر وہ اس کو زخمی کر دیتی ہے۔ اگلے ہی پل میں وہ اپنی وحشتوں سے نکل کر جی جان سے اس کی خدمت کرتی ہے۔ مرد ٹھیک ہوتے ہی وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ بہت تلاش کے بعد کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا تو وہ تھک ہار کر ایک ہوٹل میں آکر کمرہ کرائے پر لیتی ہے اور ایک مرد کی فرمائش بھی کرتی ہے۔ جب وہ اپنے کمرہ میں داخل ہونے والے مرد کو دیکھتی ہے تو حیرت سرائے کا مجسمہ بن جاتی ہے، کیونکہ یہ وہی مرد تھا جس سے اس نے والہانہ محبت کی تھی اور جس کی تلاش میں سر گرداں تھی۔ اور اب وہی مرد'' بطور ایک سیکس ورکر'' اس کے روبرو تھا۔

اب تک تو ہمارا معاشرہ 'طوائف' اور 'کال گرل' جیسے ٹرینڈ سے واقف تھا اور اس میں باقاعدہ ملوث بھی۔ لیکن اب ''سیکس ورکر'' کی اصطلاح بھی رائج ہو گئی ہے جسے آج کی نسل بطور پیشہ اختیار کر رہی ہے۔ اس افسانہ میں ایک 'سیکس ورکر' کی زندگی اور جنسی ضروریات کو فوکس کیا گیا ہے۔ جس طرح ایک طوائف جو نہ کسی مرد سے عشق کر سکتی ہے نہ کسی کی رفیق حیات بن سکتی ہے اس کو صرف مردوں کا جی بہلانے کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جنسی پیشہ ور مرد کے لیے کسی عورت سے محبت یا رفاقت اس پر روزگار کا دائرہ تنگ کر سکتی ہے۔ کیونکہ انھیں کسی بھی وقت طلب کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے اپنے گاہکوں کو بھرپور جنسی تعاون دینے کے واسطے انھیں اپنی تمام جنسی قوتوں اور حرارتوں کو مجتمع کر کے رکھنا پڑتا ہے۔ نیز تکثیر جنسی عمل کے تقاضوں سے بھی احتراز کرنا ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں جنسی عمل

کو بڑھاوا دینے کے لیے 'لائیو شو'، 'بلیو موویز' اور انگریزی اخباروں میں اشتہاری کالم آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ 'ایک اور وہ' میں مغربی طرز معاشرت کی پروردہ اور دلدادہ ایک ایسی بے وفا عورت کی کہانی ہے جو اپنے شریک حیات کو چھوڑ کر غیر مردوں سے جنسی تعلق استوار کرتی ہے۔ دراصل وہ نرگسیت کا شکار ہے، وہ اپنے حسین و گداز، پرفریب اور جنسی لذتوں اور ارتعاشات سے بھرپور جسم کو ہی کل اثاثہ تصور کرتی ہے۔ وہ خود کو نہارتی ہے سراہتی ہے اور کبھی بوڑھی نہیں ہونا چاہتی جوان رہ کر ایک ایک پل کو جینے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ اپنا ایک علیحدہ معیار حسن قائم کرتی ہے اور ہر مرد سے بڑی خوش دلی سے ملتی ہے۔ اس کے اس معیار حسن کی فہرست میں وہی لوگ داخل ہو پاتے ہیں جو کچھ خاص خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن پاوش اس کا ہم سفر ہونے کے باوجود بھی اس کی اس فہرست میں جگہ نہیں پاتا، بس خاموش تماشائی اس کی تمام حرکات وعوامل کو دیکھتا اور اس کی بے رخی اور مستقل جنسی ناآسودگی کا عذاب سہتا رہتا ہے۔ وہ جب بھی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا عورت کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے بڑی سہولت سے اس کو ٹال دیتی۔ وہیں جب اس کا چہیتا مرد اس سے تنہائیوں میں ملتا ہے تو اس پر مکمل نثار ہو جاتی۔ ایک دن وہ اسی طرح کی خلوت میں اس سے ہم آغوش ہوتا ہے اور جنسی تلذذ سے ہمکنار کرتا ہے لیکن جب یہ سرشاری اپنی انتہا کو پہنچنے والی ہوتی ہے تو اسے کسی تیسرے کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ تیسرا شخص اس کا شوہر پاوش ہوتا ہے جو بڑے تحمل اور انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فقط اتنا ہی کہتا ہے "دروازہ تو بند کر لیا ہوتا۔"

اس افسانے میں صغیر رحمانی نے اس تلخ اور ان کہی حقیقت کی جانب توجہ مرتکز کرنے کی سعی کی ہے کہ جب بیوی کسی غیر مرد سے ہم آہنگ ہوتی ہے وہ اسی لمحہ اپنے شوہر کا

قتل کر دیتی ہے۔لیکن اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ خواہ اسے کتنا ہی آزادانہ ماحول اور جنسی آسائش کیوں نہ مہیا ہو جائے، دوران اختلاط جب تک وہ دروازہ بند کر کے اپنے شوہر سے مکمل دستبرداری کا اعلان نہیں کر دیتی جنسی آسودگی حاصل نہیں کر سکتی۔

افسانہ 'پہلا گناہ' میں ایک ایسی عورت کی داستان حیات بیان کی گئی ہے جو بھاگلپور دنگے میں تنہا زندہ بچتی ہے اور قسمت کی ستم ظریفی کہ زندہ بچنے کا معاوضہ اسے اپنی آبرو نیلام کر کے چکانا پڑتا ہے۔ جو بعد میں ایک طوائف کے طور پر مشہور ہو گئی۔اپنے کوٹھے کی شان بان اور اسے آباد رکھنے کے لیے وہ چار بیٹیاں پیدا کرتی ہے۔وہ چاروں کی جبلت اور فطرت سے بخوبی واقف ہے۔لیکن پھر بھی چھوٹی بیٹی ثریا کی انوکھی طبیعت اسے ہر لمحہ پریشان رکھتی۔اس کی رسم نتھ اترائی ہے،خوشی کا سماں ہے۔ایسے میں ایک واقعہ پیش آتا ہے ایک پولیس والا اس لیے کوٹھے کی تلاشی لینے آتا ہے کہ کوئی شخص کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کر کے کوٹھے کی جانب ہی بھاگ کر آیا ہے۔باوجود تلاشی کے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ادھر ساری رسوم کی ادائیگی کے بعد فیروز نامی ایک نوجوان کوٹھے پر آتا ہے کچھ پریشان اور گھبرایا ہوا سا۔اسے ثریا کے پاس بھیج دیا جاتا ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہی نوجوان چیختا چلاتا خون سے لت پت کمرہ سے برآمد ہوتا ہے۔ بعد میں انکشاف ہونے پر پتا چلتا ہے یہی وہ مجرم ہے جس نے ایک معصوم بچی کو اپنی حیوانیت کا شکار بنایا تھا۔اس جرم کی پاداش میں ثریا اپنی ماں کے سروتے سے اس کو شدید زخمی کر دیتی ہے۔انتہائی غصہ اور تنفر لہجے میں کہتی ہے:

> "تھوکنے کے لیے آخر چوک چوراہوں پر کوڑے دان کس لیے ہے۔جو جی کا پانی گرانے کے لیے اتنا ہی بے تاب تھا تو ہمارے پاس چلا آتا،اس بچی کے ساتھ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی....."

یہاں صغیر رحمانی نے برائی میں ایک اچھائی کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی

ہے۔ منٹو کی طرح انھوں نے بھی طوائف کے دل میں جذبۂ خیر و ہمدردی اور بشر دوستی کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

جب کہ ایک دوسرے افسانے ''چانس'' میں صغیر رحمانی نے فرد سے فرد کے تخلیقی رشتے پر جو کہ فطری ہے روشنی ڈالی ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ عورت جب تک ماں نہیں بنتی وہ ادھوری رہتی ہے۔ یہاں نیطشے کا یہ قول گونجنے لگتا ہے کہ عورت میں سب کچھ ایک پہیلی ہے اور پہیلی کا راز ہے بچہ......اور بچہ کی خواہش اور اپنے وجود کی تکمیلیت کے لیے اوہ اپنی جان تک کی پروانہیں کرتی۔ مذکورہ افسانے میں کیرتی سنہا ایک ایسا ہی کردار ہے۔ جو مکمل ہونے کی خواہش رکھتی ہے اور اپنی پیاسی ممتا کے جذبے کی تکمیل اور اپنے ادھورے پن کو پورا کرنے کے لیے وہ ہر جوکھم اٹھانے کو تیار ہے۔ اور وہ ڈاکٹر کے اس لوجک کو بھی نہیں مانتی کہ ''اس کے لیے پر گنینسی خطرناک ہے۔'' بہر حال کیرتی جیسے جیسے تخلیقیت کے عمل سے گزرتی ہے ویسے ویسے قاری کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی اس تخلیق کو جو ابھی صرف چھ ماہ اور چند دنوں کا آدھا ادھورا لوتھڑا تھا، کیرتی کے پیٹ سے باہر نکال لیا جاتا ہے۔ اس نامکمل تخلیق نے کیرتی سنہا کو کتنا مکمل کیا؟ اس کی بے چین ممتا کو کس حد تک تسکین پہنچائی؟ قارئین اس افسانے کو پڑھ کر از خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک عجیب وغریب کہانی ہے جسے مصنف نے خود تخلیقیت کے نشیب و فراز سے گزر کر تخلیق کیا ہے۔

عصر موجودہ میں جہاں زندگی کے دوسرے تمام مظاہر تغیر و تبدل سے ہمکنار ہو کر نئے سیاق وسباق مرتب کرتے ہیں وہیں انسانی زندگی میں بے شمار مسائل، روحانی اضطراب اور اندرونی خلش بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ انسانی رشتوں میں درار، خونی رشتوں کا انہدام، اپنوں سے لاتعلقی اور بے زاری خاندانی اقدار و تہذیب کا زوال جیسی خرابیوں نے

گھر کے کہنہ اور بزرگ افراد کے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ یہ سب موجودہ دور کی ترقیات کی دین ہے جس نے انسان کو Old age homes اور Generation Gap جیسی وبائیں دی ہیں۔ ''مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ''، ''مرتو بابا'' اور ''بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں'' سے معنون افسانے مذکورہ مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہاں کے بوڑھوں کے لیے حکومت نے مفت علاج، ضعیف العمری پنشن، لاوارث بوڑھوں کے لیے لو جنگ وغیرہ کئی اسکیمیں جاری کی ہیں۔ 'مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ' افسانے میں ایک بوڑھا آدمی اپنے ہی گھر میں احساس عدم تحفظ اور ectfulness
Negl کے کرب سے دوچار ہے۔ آج انسان اتنا خودغرض ہوگیا ہے کہ وہ اپنے اجداد کو اتنی ہی دیر برداشت کرتا ہے جتنا اس سے مطلب ہے۔ اس افسانے کے بوڑھے کردار کا بیٹا بھی اس سے مہینے کی پہلی تاریخ کو صرف اس لئے ملتا ہے تاکہ اپنے باپ کی پینشن وصول کر سکے۔

''بابو جی، آج پہلی تاریخ ہے نا.... آپ کی پینشن مل گئی ہوتو....؟'' ہاں ہاں۔'' بوڑھے نے اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ نئے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے تھے۔''

صغیر رحمانی بوڑھے کردار کے وسیلے سے یہ انکشاف کر کے متحیر کر دیتے ہیں کہ ''آپ کو تعجب نہیں ہوتا... اب بوڑھے کہیں نظر نہیں آتے؟.... تصور کیجئے کہ دنیا میں ایک بھی بوڑھا نہیں ہو، تب کیسا لگے گا؟ مصنف نے ان کی بے بسی کا جو نقشہ کھینچا ہے روح کو منجمد کرنے کو کافی ہے۔ آج کل بوڑھوں کی زندگی بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے جو بڑا تشویش ناک نقطہ ہے اور ان کو اس زندگی سے روشناس کرانے والے اور کوئی نہیں ہم خود ہیں۔
جب کہ افسانہ 'بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں' کی کہانی شرما ولا کے اے، پی شرما، ان

کے دو بیٹوں، بہوؤں اور ایک پوتے سونو کے گرد بنی گئی ہے۔اس میں زیادہ توجہ اے پی شرما کو دی گئی ہے جو ایک معمر آدمی ہے اور ملازمت سے سبکدوش ہو چکا ہے۔لیکن ان میں زندگی جینے کی رمق باقی ہے اور وہ باقی ماندہ زندگی اپنی مرضی سے جینا چاہتے ہیں۔ہر لمحہ کو خوشگوار بنانے اور اور ہر لمحہ کو جینے کے لیے وہ مختلف Strategies اپناتے ہیں جو ان کی اولاد کو ایک نظر نہیں بھاتیں۔نوجوانوں کی طرح مارننگ واک، ایوننگ واک، احمد بھائی کی چائے کی دکان پر ماں بہن کی گالیاں دینے والوں کے ساتھ اکثر بیٹھنا، اپنے گاؤں کے دوست گجادھر کے ساتھ دن بھر دھما چوکڑی کرنا اور رات رات بھر لوڈو کھیلتے ہوئے خوب ہلا گلا کرنا، کمپیوٹر پر نیٹ سرفنگ اور چیٹنگ، ٹھٹھرتی سردی میں بنا کوٹ مفلر اور ہیٹ کے ٹہلنے نکل جانا اور بن موسم کے دہی بڑے کھانا، بیٹے کے ٹوکنے پر ان کا سیدھا اور تیکھا جواب ہوتا:

> ''دہی بڑوں کا کوئی موسم ہوتا ہے...؟ ذرا رکے تھے ڈیڈ، پہلے کی طرح پرسکون لہجے میں بولے'' دراصل یہاں تم دہی بڑا اور موسم کی بات نہیں کر رہے، تم ان دونوں کے چشمہ سے میری عمر کو دیکھ رہے ہو ...اکثر دیکھتے ہو....اکثر لوگ دیکھتے ہیں....برخوردار....جیون کا پہیہ عمر سے نہیں من کی طاقت سے چلتا ہے..''

آج کی نسل اپنے بوڑھوں اور بزرگوں کو کہاں اس طرح جینے دیتی ہے۔ان کی ایک ایک حرکت پر ٹوکا ٹاکی، ذرا ذرا بات پر ان کا جھنجلا جانا روز کا وطیرہ ہے۔اس نئی ذہنیت کو بوڑھے بنا چوں چراں خاموش زندگی کی آخری سانسیں پوری کرتے، خرخر اور ہائے ہائے کرتے ہوئے ہی ان کے مزاج کو بھاتے ہیں۔پی کے شرما کی زندگی پر بھی ان کے بیٹے قید و بند لگانا چاہتے ہیں ان کی حرکات سے باز رکھنے کے لیے محلے کے دوسرے بوڑھوں کی مثال دیتے ہیں۔لیکن ایک دن اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور عادتوں سے تنگ کرنے والا یہ

بوڑھا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتا ہے۔افسانہ اپنے خاص رنگ و آہنگ اور اسلوب کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔اور بڑھتی ہوئی عمر سے پیدا ہونے والی انسان کی نفسیات اور اس کے مزاج کو گرفت میں لیتا ہوا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔صغیر رحمانی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے تلخ حقائق کو جو بڑی مشکل سے گرفت میں آتے ہیں بآسانی بیان کرنے پر قادر ہیں۔

بڑے ہی سادہ اور عام فہم انداز میں یہ کہانیاں ان کے قدرت بیان، تخلیقی صلاحیت اور سماجی حسیت کی مظہر ہیں۔کہیں کہیں نادر اور عمدہ تشبیہات سے اپنے فکشن میں دلکشی اور نیا طرز احساس پیدا کیا ہے۔ان کے افسانوں سے چند تشبیہات ملاحظہ ہوں:

''بال پیشانی سے دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے، اس طرح جیسے کانٹوں کے بجائے کاٹھ کی تیلی پر سوئٹر بننا سیکھنے والی گاؤں کی نئی نئی کسی لڑکی نے اُون کو آپس میں الجھا دیا ہو۔'' (مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ)

''سڑک کی اوٹ میں چھپئی دھوپ اس طرح شرمائی کھڑی تھی جیسے پہلی بار سسرال آئے بہنوئی سے شرمائی ہوئی سالی کواڑ سے لگی باتیں کرتی ہو۔'' (ایضاً)

''دھرتی کی کوکھ سے نوزائیدہ بچے جیسی ملائم، گلابی صبح دھیرے دھیرے پاؤں نکال رہی ہے۔'' (چھوتی تی تی تا)

''ایک تو آم کی کھٹائی سی سوکھی، پلپلی ان لڑکیوں میں خاطر خواہ دم نہ تھا........گال گلابی رنگ کے پاؤڈر تھوپنے کے باوجود ادھڑے ہوئے پلستر سے جان پڑتے تھے۔''

(پہلا گناہ)

''وعظ بیان کرنے کے بعد ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے کہ نیک اعمال، جنت، دوزخ اور نجات کا سارا فلسفہ اندھیرے کمرے کے کسی کونے میں منہ چھپا کر دبک

جاتا ہے۔'' (ایضاً)

''عزت وناموس روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی تھی۔'' (ایضاً)

''وہ جائے نماز کی طرح بچھ جاتی تو وہ سجدے میں گر جاتا۔'' (ایک اور وہ)

''ان کی ابھری ہوئی جبینیں دیکھ کر بدرو کے منہ مین اس طرح پانی بھر آیا تھا جیسے اوپر کے دنوں میں املی یا اچار دیکھ کر کسی عورت کے منہ میں رال آجاتی ہے۔''

(حبشی کی آدھی شلوار)

''اس کی نگاہ عورت کے جسم کی تنگ اور ناہموار گلیوں میں آوارہ کتّے کی طرح ہانپنے لگی۔'' (ایضاً)

''ایڈز کے مریض سی پیلی اور بیمار روشنی میں صاف کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔''

(کائی)

''وہ دونوں اسٹریچر کے ساتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے ڈراور سے لاشیں نکل کر ڈیگ بھرنے لگی ہوں۔'' (ایضاً)

''گاما کا خیال آتے ہی گوسائیں کے ہونٹ پھڑ کنے لگے اور گالیاں قے دست کی طرح باہر آنے لگیں۔'' (ایضاً)

''دلکش مناظر کے سینے پر پاؤں پسارے فطرت پوری طرح راج کر رہی تھی۔''

(مونا)

ڈاکٹر اقبال واجد صغیر رحمانی کی تمثال نگاری، استعاراتی انداز بیان اور حسی پیکر تراشی کو سراہتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں جو ہمیں صغیر رحمانی کے فکشن کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوتا ہے:

'''صغیر رحمانی کے یہاں وسیع تخلیقیت کے اسرار موجود ہیں اس لئے

ان کی نثر میں رشید امجد کی طرح استعاراتی اظہار بھی پیدا ہو گیا ہے۔
یہ استعاراتی اظہار صغیر رحمانی کے افسانوں کی شناخت تو نہیں ہے
مگر یہ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس تو ضرور دلاتا ہے۔ اور کہیں کہیں
زبان کے شانہ بہ شانہ چلتا نظر آتا ہے۔ اس استعاراتی اظہار میں
ذوق و عمل کی ایسی ترتیب بھی نظر آجاتی ہے جو صغیر رحمانی کی تخلیقی
دانائی کو چیلنج کرتی رہتی ہے۔ اس عمل میں صغیر رحمانی کے یہاں جو تناؤ
ہے وہ ہر زاویے سے ان کے یہاں اجالے کا سبب ہے۔ ایسی
صورت میں افسانوی عمل اور استعاراتی اظہار میں ایک قربت پیدا
ہو جاتی ہے جو قابل دید ہے ...... صغیر رحمانی اپنے تخلیقی اور تمثالی
پیکریت کی تلاش میں جس جستجو کی طرف گامزن ہیں وہ انہیں ایک
ایسے سفر پر ڈال دیتی ہے جو اپنے آپ میں مکمل اور موثر ہے۔ ایسے
مکالموں کی تہذیب میں کسی ارادے اور عمل سے پرے ایک توسیعی
صورت حال سے خود بخود رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور جو امور اس رویے
میں رکاوٹ بنتے ہیں وہی اس جگہ اس تمثال کا بیانیہ بن جاتے ہیں۔''

صغیر رحمانی کے فکشن کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد بلا تشکیک و تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ان ہی مسائل و موضوعات پر قلم اٹھایا جنھوں نے ان کی حسیت کو بیدار کر کے اظہار خیال پر اکسایا ہے۔ صغیر رحمانی ایک ہمدرد اور بے چین طبیعت قصہ گو واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالباً زندگی کے سبھی پہلوؤں کو واشگاف کرنے کی حد درجہ سعی کی ہے۔ خواہ قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی، صوبہ بہار کا دیہی معاشرہ اور پس ماندہ طبقہ ہو یا جھونپڑ پٹیوں اور تعفن سے بھری فضا میں سانس لینے والے افراد، بوڑھے ہوں یا

عورتیں، چاہے طبقہ اشرافیہ اور بدنام زمانہ افراد ہی کیوں نہ ہوں ان کے فکشن میں ہر کوئی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا نظر آتا ہے۔ صغیر رحمانی کے افسانوں کے موضوعات چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ کسی سیدھی لکیر پر چلنا پسند نہیں کرتے بلکہ متنوع اور متضاد موضوعات کو اکٹھا کر کے افسانے کے قالب میں ڈھالتے جاتے ہیں۔ موضوعات کے انتخاب میں ان کی یہی ہنرمندی ان کو خاص شناخت عطا کرتی ہے۔

بے شک کوئی بھی فنکار معاشرے کو بدل نہیں سکتا اور اس سے کسی انقلاب کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہاں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک حساس اور باشعور فنکار ذہن کی سطحیت کو بدلنے اور روح کو بیدار کرنے، معاشرہ میں پیدا شدہ برائیوں کو اجاگر کرنے اور انقلابی روح پیدا کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرتا ہے۔ اور یہ بات بلا تامل صغیر رحمانی کے متعلق کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے استحصال کے خارجی و داخلی عوامل کو اجاگر کر کے معاشرتی نظام میں تبدیلی کی اپیل کی ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں صوبۂ بہار اور اس کے قرب و جوار کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند فنکار ہیں انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کے انضمام سے اپنی کہانیاں کشید کی ہیں اس لیے ان کی کہانیوں میں زندگی کے کڑوے کسیلے حقائق کا برملا اظہار ملتا ہے۔

صغیر رحمانی کے فن سے متعلق ایک توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے جہاں جنسی عوامل یا کرداروں کی جنسی جبلت پر اظہار خیال کیا ہے وہاں کافی محتاط نظر آتے ہیں۔ وہ ایسی لفظیات برتنے سے احتراز کرتے ہیں جو سطحی ہوں اور جن کے سبب افسانہ اپنی معنویت کھو دے۔ ''ایک اور وہ'' سے معنون افسانہ اس کی مثال ہے۔ بعض جگہوں پر ان سے کوتاہیاں بھی سرزد ہوئی ہیں جو تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ کہیں کہیں پر بیانیہ تھوڑا بہت گڑبڑایا ہے لیکن ان کے اسلوب کی دلکشی اس کو سہارا دے دیتی ہے اور واقعہ کو منتشر ہونے

سے بچالیتی ہے۔کل ملا کر کہا جا سکتا ہے کہ اردو فکشن کی ترویج وارتقا میں صغیر رحمانی کا نام ہمیشہ زندہ تابندہ رہے گا اور آئندہ نسلوں کے لیے متاثر کن ثابت ہوگا!!!

❁❁❁

انجم پروین

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاہ زادے کی پریم کہانی

لڑکی کو لڑکے سے عشق ہو گیا تھا۔

ایسا عشق کہ ایک پل چین نہیں۔ ہر گھڑی نگاہوں کے سامنے رکھنے کی طلب، ہر وقت اس کی قربت کی آرزو۔ رات کو نیند، نہ دن کو قرار۔ بس لڑکا اس کی آنکھوں میں بس کے رہ گیا تھا۔ لڑکی نے جب پہلی بار لڑکے کو دیکھا تھا، اس کی آنکھیں خواب ناک ہو اُٹھی تھیں، گویا اس کی مدتوں کی تلاش پوری ہو گئی ہو اور ایک نئے سفر کے آغاز کی سبیل نکل آئی ہو۔ اُسے دیکھتے ہوئے اس نے اس گھڑی کو یاد کیا جب وہ السائے ہوئے کمرے میں لیٹی ہوتی تھی اور کوئی مرد چپکے سے اس کے قریب آ کر بیٹھ جایا کرتا تھا لیکن وہ اسے دیکھ سن نہیں سکتی تھی کہ وہ کوئی حقیقت نہیں ہوتی تھی صرف اس کے خیالوں کا تانا بانا ہوتا تھا لیکن لڑکے کو دیکھنے کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ یہی، بالکل یہی اس کے دل کا شاہ زادہ ہے، جو اُس کے کمرے میں ایک احساس، ایک خواب کا جسم لے کر داخل ہوتا تھا اور چپکے سے اس کے قریب بیٹھ جاتا تھا۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے وہ بہنے لگی تھی کہ بہنا اسے اچھا لگتا تھا اور اس لمحہ اس نے شعوری طور پر محسوس کیا تھا کہ کوئی اس کے کانوں کے قریب آ کر پھسپھسا رہا تھا....

ساڈے...ساڈے....

لڑکی نے اس لمحہ بے چین نگاہوں سے اپنے آس پاس دیکھا تھا اور لڑکے کا ہاتھ سختی سے بھینچ لیا تھا۔

لڑکی بے حد حسین تھی۔ اس کی نیلی اور گول آنکھیں اور پتلی ناک تھی اور اس کے کاغذ جیسے ہونٹوں کے اوپر مہین نیلے ریشے تھے۔ متحرک کایا تھی اور جنبش کرتے چھوٹے چھوٹے عنابی گال تھے۔ غیر موجودگی کا احساس دلاتی کمر اور رنگت ایسی تھی کہ جیسے نمک اور پارے کی قلعی چڑھی ہو۔

لڑکا اس کے برعکس معمولی نین نقش اور گہرے رنگ کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور بال بکھرے ہوئے رہتے تھے۔ وہ اداس رہتا تھا اور احمق سا دکھتا تھا لیکن اس کے بدن کی ساخت غضب کی پرکشش تھی اور دنیا کی کسی بھی لڑکی کو دعوت نگاہ دینے کی صلاحیت سے بھرپور تھی۔ لڑکی جب لڑکے کے ساتھ ہوتی اور لوگوں کی انگلیاں دانتوں میں دیکھتی تو اسے بڑا لطف آتا تھا اور وہ ایک انتہائی خوشگوار کیفیت میں مبتلا ہو جایا کرتی کہ اسے اپنے معیار انتخاب پر فخر تھا کہ وہ اس کے دل کا شاہ زادہ تھا اور یقیناً بے نظیر تھا۔ وہ اعتراف کرتی تھی کہ قدرت نے اسے ایک دوسری نظر عنایت کی ہے، چیزوں کو دیکھنے کی اور پسند کرنے کی اور وہ دنیا کی نظر کو، پسند کو مطلق رد کرتی تھی اور اس سے انکار کرتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں زمانے کو لے کر، وقت اور حالات کو لے کر، قسمت کو لے کر اور خدا کو لے کر ہمیشہ ہی تضادات محسوس کیے تھے اور وہ ان سبھی کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے بے نیاز رہنا پسند کرتی تھی۔ وہ لڑکے سے والہانہ محبت کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ جب کبھی اسے لڑکے کی قربت میسر ہوئی ہے، اسے، خود پر قابو نہ رہا ہے اور وہ پوری رفتار میں بہنے لگی ہے اور اس گھڑی لڑکے کے جسم میں پوشیدہ ایک پوری کائنات کی سیر کرنے کی اس کی خواہش شدید

ہو جایا کرتی تھی۔اس نے لڑکے کو آگاہ کیا تھا۔

''شاہ! تمہارے اندر اجنتا اور ایلورا کے تمام راز پوشیدہ ہیں۔''

لڑکا گمبھیر ہو گیا تھا۔ کچھ تو وہ اپنی فطرت سے کم سخن اور شرمیلا واقع ہوا تھا۔ دوسرے اس تو بہ شکن حسن کی کشش بھی کم نہ تھی۔ رفتہ رفتہ لڑکی کی محبت میں اسیر ہونے کے باوجود وہ اس احساس سے باہر نہ نکل پاتا تھا کہ وہ لڑکی سے محبت کرتا ہے کہ وہ حسین ہے، قابل توجہ ہے لیکن لڑکی اس سے محبت کرتی تھی، یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ نہایت ہی معمولی اور بدنما شبیہ رکھتا ہے۔لڑکی کا معیار حسن اسے مشکوک کرتا اور وہ مایوس ہو جاتا۔

لڑکی اسے روح سے محبت کرتی تھی لیکن وہ ایسا سمجھتی تھی کہ جسم کا سفر طے کیے بغیر روح کی منزل تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے یا کرنے کا دعوی پیش کرتا ہے تو یقیناً وہ خود کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ وہ اس بات سے واقف تھی کہ اس طرح کے دعوے منتشر کیفیت کے زیر اثر وجود میں آتے ہیں اور یہ کہ انتشار کے بطن میں منزل نہیں پلتی۔ ہر چند وہ کوشش کرتی کہ لڑکا اپنے غیر معمولی جسمانی اثاثے اور خوبیوں کو سمجھے اور ان کا خوش دلی سے اعتراف کرے لیکن لڑکی کو انتہائی رنج ہوتا کہ وہ اس سے قدرے بے نیاز تھا اور کسی دوسری دنیا میں محو رہتا تھا۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی اور بے قرار ہو اُٹھتی کہ نہایت خوش اسلوبی اور مشاقی سے وہ ٹال جاتا تھا اور کسی دوسرے خیال میں مصروف ہو جاتا تھا۔لڑکی نے کہیں پڑھ یا سن رکھا تھا کہ مرد کی محبت اپنی حد کو عبور کر جاتی ہے تو کسی قدر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ سمجھ نہ پاتی تھی کہ وہ صورت کیا ہوتی ہو گی لیکن اسے یقین تھا کہ لڑکا بھی اس سے عشق کرتا تھا۔

تو کیا وہ اس حد کی خواہش کر سکتی ہے؟ لڑکی بے چین ہو اُٹھتی۔ اسے لگتا کہ کسی اونچے ڈھلوان سے اسے بہا دیا گیا ہے اور وہ پوری رفتار سے بہتے ہوئے نیچے گرنے لگی ہے

کہ ٹھہر جانا، سب کچھ جامد اور ساکت ہو جانے کے مترادف ہے۔ بہنا اور بہتے رہنا بھی منزل ہوسکتا ہے...اور وہ پوری رفتار سے بہہ رہی تھی۔

لڑکی ہر جتن کرتی کہ لڑکا خوش رہے۔ ہنسے بولے اور اپنے جسم کی بجلی اس میں منتقل کردے مگر تڑپ کر رہ جاتی کہ لڑکا ہنستا نہ تھا۔ اس کی دل بستگی کے لیے وہ کیا کچھ کرے کہ وہ ذرا سا ہنسے، اس فکر میں غوطہ زن تھی کہ ایک دن ایک ملاقات میں لڑکے نے اسے مژدۂ جانفزا سنایا کہ اب وہ بے روزگار نہ رہا اور اسے کسی ہوٹل میں ملازمت مل گئی ہے۔ لڑکی نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا کہ یہ مژدہ اس کے لیے کسی اہمیت کا قطعی حامل نہ تھا۔ لیکن لڑکے کی اداسی کا راز اس پر منکشف ہو چکا تھا اور وہ ایک گونہ فرحت اور سکون کا احساس کر رہی تھی کہ اس نے اس کے چہرے پر خفیف سی ہنسی کی رنگت دیکھ لی تھی۔ اسے لگا تھا کہ اس کے سفر کا آغاز یہیں سے ممکن ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے گئی تھی اور اس نے اپنے باپ کا کمرہ دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا باپ ایک مذہبی انسان تھا اور اس کے کمرے کی دیواریں اب بھی مندروں اور تیرتھ استھلوں کی تصاویر سے بھری پڑی ہیں اور رہ اپنے باپ کے کمرے میں اب تک ایک یا دو بار ہی جا سکی ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی اور اس کا باپ زندگی بھر منزل کی تلاش میں بھٹکتا رہا اور جو اسے کبھی نہ مل سکی۔ جب کہ اس نے سادھوؤں کے سنگ عمر گزاری تھی۔

اس دن اس نے شہر کے نفیس شوروم سے اس کے لیے دیدہ زیب لباس خریدے تھے اور شاندار کیفے کی شام اس کی نذر کی تھی۔ اس شام کیفے کے کنارے والی میز پر اُن کے عرق عرق ہوتے احساس کا ذخیرہ جمع ہو رہا تھا کہ یک لخت لڑکی نے پھونک مار کر میز کی بتی گل کر دی تھی اور گلاسوں میں شامپین کی جھاگ بیٹھنے لگی تھی۔ لڑکی نے نیم وا آنکھوں سے لڑکے کو دیکھا تھا جو چہرے پر بے زاری کا تاثر لیے خاموش بیٹھا تھا۔ ذرا دیر بعد شامپین کی

جھاگ پوری طرح بیٹھ گئی اور برف کا ٹکڑا تیر رہا تھا۔ گلاس کی دیواریں دھندلا گئی تھیں اور اس کے لبوں پر شبنمی قطرے چمکنے لگے تھے۔

لڑکی نے بڑی نفاست سے شامپین کی چسکی لی تھی اور لڑکے کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئی تھی۔ وہ بے قرار ہو اٹھی کہ لڑکے کی بے اعتنائی اسے بری طرح کھل رہی تھی۔ برف کا ٹکڑا رفتہ رفتہ گھل کو چھوٹا پڑتا جارہا تھا اور لڑکی کی آنکھیں خواب ناک ہوتی جارہی تھیں اور ان میں ایک طرح کی عارضی آسودگی پیدا ہونے لگی تھی۔ لمحہ لمحہ وہ ایک باوقار مسرت کی حد میں داخل ہوتی جارہی تھی کہ کس طرح ایک مسلم اور پختہ حقیقت ایک دوسری حقیقت میں مدغم ہو کر اپنا وجود اور اپنی شناخت کھو دیتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہیں سے کچھ نیا ہوتا ہے۔ وہ اپنے پورے بدن میں ایک حرارت کا احساس کر سہر اٹھی کہ کوئی اس کے کانوں کے نزدیک مسلسل پھسپھسا رہا تھا۔

ساڈے... ساڈے....

برف کا ٹکڑا پوری طرح گل جانے کے بعد لڑکی پُرسکون ہونے لگی تھی جیسے سب کچھ اس کے یقین کے مطابق ہوا ہو۔ وہ مسکرا دی تھی۔ بہت ہلکی سی مسکراہٹ کہ لڑکا متوجہ ہو سکے۔ لڑکے نے اسے دیکھا تھا۔ شاید پہلی بار پوری نظر سے اور لڑکی نے ایک زبردست ہیجانی سوچ سے مغلوب ہو کر اپنی انگلی اس کے بازو میں چبھو دی تھی۔

''شاہ! میں تمہارے ساتھ سونا چاہتی ہوں۔''

لڑکا مضطرب ہو اٹھا تھا کہ اسے لڑکی کی کیفیت کا اندازہ نہ تھا۔

لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

اس رات اس نے گرم شاور چلا کر گھنٹوں اپنے جسم کو بھگویا تھا اور ہاتھ کی رگ کاٹ ڈالی تھی۔ پوری طرح غنودگی سے ہم آغوش ہونے سے قبل اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے

اندر کے بہاؤ کی رفتار دھیرے دھیرے کم ہونے لگی ہے۔

اس کے سفر کا آغاز نہ ہو سکا تھا اور اس کی محبت دن بہ دن شدت اختیار کرنے لگی تھی ۔اس درمیان اس نے سفر کی جستجوں میں اپنی تمام ظاہری اور باطنی حیثیتوں کو خود سے مسخ کیا تھا اور ایک غلام، بندۂ بے دام بن کر رہ گئی تھی اور اسے اس کی اطاعت پسند تھی۔

اسے پسند تھا کہ لوگ اس سے ملیں، اسے اہمیت دیں جیسے کسی خاص چیز کو دی جاتی ہے اور اس خاطر وہ اسے لوگوں سے ملواتی اور محفلوں میں لے جاتی اور اس کا پروقار تعارف پیش کرتی لیکن لڑکا تھا کہ اکثر محفلوں میں جانے سے اور لوگوں سے ملنے سے گریز کرتا تھا اور تب لڑکی اس کے سادہ پن کو سنجیدگی سے محسوس کرتی کہ وہ ذرا بھی اس کی خواہشوں کا احترام نہیں کرتا اور وہ قدرے غیر مہذب بھی ہے۔ باوجود اس کے وہ زیادہ دیر تک اس احساس کو اپنے دل میں جگہ نہ دے پاتی اور بنا تأمل اس کی اداسی کی تہہ میں اترنے کی کوشش کرنے لگتی۔ اس نے جب کبھی اس کے اندر جھانک کر دیکھا تھا اسے ایک دبیز دھند نظر آئی تھی اور وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ یہ درست ہے کہ وہ اس کی محبت میں بے حیثیت ہوکر رہ گئی ہے لیکن کیا اس کی اتنی بھی حیثیت نہیں کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو سکے۔

لڑکی کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی شے تیزی سے، پوری رفتار سے بہہ رہی ہے۔ اس دفعہ اس نے پہلی فرصت میں کوشش کی تھی کہ بہاؤ رک جائے لیکن اسے ناکامی محسوس ہوئی تو اس نے بادل نخواستہ خود کو بہاؤ کے سپرد کر دیا تھا اور پوری رفتار میں بہنے لگی تھی ۔اپنی پوری قوت کے ساتھ اور بہتے بہتے جانے کتنی دور نکل گئی تھی کہ اس کی پلکوں پر آنسو کی بوندیں آکر ٹھہر گئیں اور ہونٹ بے ساختہ متحرک ہو اُٹھے۔

''ساڈے.... عظیم ساڈے....''

لڑکے نے عاری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ لڑکی کی آنکھیں خواب ناک ہوتی جا

رہی تھیں اوراس نے اپنی انگلی اس کے بازو میں گڑادی تھی۔

''شاہ!میں تمہارے ساتھ سونا چاہتی ہوں۔''

لڑکا حسب معمول افسردہ ہوا اُٹھا تھا اوراس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی تھی اوراسے لے کر لمبی سیر کے لیے نکل گئی تھی۔

اس لمحہ اس کی قربت کی آگ سے اس کا پورا وجود تپ رہا تھا۔اس نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔بغل کی نشست پر خاموش لڑکا اس کی زلف عنبریں سے مدہوش ہوا جارہا تھا اور ممکن تھا کہ بے توازن ہوجاتا،اس نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔لڑکی نے گاڑی کی رفتار مزید تیز کردی تھی۔اس کا چہرہ جذبات سے پُر ہورہا تھا اوراس کی آنکھیں خواب ناک ہوئی جارہی تھیں۔کچھ دیر کے بعد اس کی آنکھیں پوری طرح خواب ناک ہو اٹھیں اوراس سے قبل کہ وہ سامنے سے گزر رہے بچے کو اپنی گاڑی سے کچل دیتی،لڑکا ہیبت ناک نگاہوں سے اسے تکے جارہا تھا اور ذرا دیر پہلے کے ہولناک منظر کے تصور سے اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔لڑکی پرسکون نظر آرہی تھی۔

اس عرصے میں لڑکی نے بخوبی محسوس کرلیا تھا کہ اس کے سفر کا آغاز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ لڑکا اپنی اداسیوں کی دھند سے باہر نہ نکل آئے۔کبھی کبھی اسے شک ہوتا کہ کوئی اور زلف گرہ گیر اس کی زنجیر تو نہیں بنی ہوئی ہے۔چناچہ اس کی دلجوئی کے لیے اس نے ایک خوبصورت محفل آراستہ کروائی اوراس میں خصوصی طور پر شہر کے تمام حسین چہروں کو مدعو کیا کہ لڑکے کے اندر سے،اگر ہو تو،ایک دوسرا انسان باہر نکل سکے لیکن محفل شباب پر آنے تک،پیمانے چھلکنے تک اور انفاس میں لغزش پیدا ہونے تک کی مدت میں لڑکا بتدریج اداس رہا۔ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک آئی اور نہ چہرہ بشاش ہوا۔اس انتظار میں رات نصف سے زیادہ بھیگنے لگی تو اچانک لڑکی پر جیسے وحشت سی طاری ہوگئی اور

ہیجان کی شدت میں اس نے روشنیاں گل کروادیں اور تیز خنجر سے لڑکے کو زخمی کرڈالا۔

ذرا دیر بعد سبھی لوگ رخصت ہو گئے اور محفل کا کوئی رنگ باقی نہ رہا تو وہ لرزتے قدموں سے لڑکے کے قریب آئی تھی اور اس نے اس کے زخموں کو چھو کر دیکھا تھا۔ زخم گہرے تھے اور ان کا جلد بھرنا ممکن نہ تھا لیکن لڑکی نے دن رات ایک کر کے اس کی تیمار داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جس کے سبب لڑکا جلد ہی صحت یاب ہو اٹھا تھا۔لڑکی اپنے اصرار پر اُسے ساحل کی سیر کے لیے لے گئی تھی اور اس نے اسے بتایا تھا کہ ان لہروں کو چٹان سے ٹکرانے کا الگ سکھ ہے اور یہ کہ ان کے جوش اور ولولوں کو کنارے پر کھڑا ہو کر نہیں محسوس کیا جا سکتا۔ اس کے لیے سمندر کی تہہ میں اترنا ہوگا اور لہروں کے ساتھ، انہیں کی رفتار میں بہنا ہوگا۔لڑکا بے زار ہو اُٹھا تھا اور جلدی وہ واپسی پر آمادہ ہو گیا تھا۔

اس دن لڑکی اپنے فطری بہاؤ سے پاک ہوئی تھی اور اپنے اندر کچھ کھلا کھلا سا محسوس کر رہی تھی۔ گو کہ وہ شانت تھی لیکن اس کے رگ و پے میں سوئی سی چبھ رہی تھی کہ عورت کو قدرت نے جس روپ میں تخلیق کیا ہے اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر ماہ نئی ہو اٹھتی ہے۔لڑکی ایک دم تازہ ہوگئی تھی اور اس کا رنگ روپ مزید نکھر آیا تھا۔

لڑکی شانت تھی۔ اس نے اپنے کمرے کی چیزوں کو درست کیا تھا اور جسم کو ہلکے لباس سے آراستہ کر کے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ سفر شروع ہونے سے قبل ہی اس میں تھکان بھر گئی ہے۔ اس نے آنکھوں کو بند کر لیا تھا اور لڑکے کو یاد کرنے لگی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اسے آہٹ سی سنائی دی تھی اور لگا تھا کہ کوئی چپکے سے کمرے میں داخل ہوا ہے اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس خیال سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور بک شیلف سے کتاب نکال کر سنسنی خیز واقعات کی ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ اسے شروع سے ایسے قصے پسند تھے جنہیں پڑھ کر انسان کسی دوسری دنیا کی

سیر کرنے لگتا ہے۔اس نے کبھی ایسا ہی کوئی قصہ پڑھ رکھا تھا جس میں خودسپردگی کے ساتھ ساتھ وحشیانہ رویے کا ذکر تھا۔اس لمحہ اسے محسوس ہوا تھا گویا اس کے ساتھ بھی وہی واقعے دہرائے جارہے ہیں۔ایک دم ساڈسٹ...وحشی...وہ ایک طرح کی لذت سے سرشار ہو اٹھی تھی۔کوئی اس کے کانوں کے نزدیک آکر پھسپھسا رہا تھا اور وہ دوسری دنیا سے لوٹ آئی تھی۔اسے احساس ہوا تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل جس قدر وہ شانت تھی اب اتنی ہی تیزی سے بہنے لگی ہے۔اسے کسی اونچے ڈھلوان سے بہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے اور وہ پوری رفتار سے بہہ رہی تھی۔

اس نے کپڑے تبدیل کیے تھے اور گاڑی نکال کر سڑک پر آگئی تھی۔اس نے لڑکے کی تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن لڑکا اسے نہ مل سکا تھا۔شام تک وہ بے مقصد سڑکوں پر دوڑتی رہی تھی۔آخر کار اس نے شہر کے ایک عالی شان ہوٹل کے پورچ میں گاڑی کھڑی کر دی تھی۔اس کی آنکھیں رفتہ رفتہ خواب ناک ہو رہی تھیں اور اس کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔اس نے اپنے نام کمرہ لیا اور مرد کی فرمائش کی۔کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ فتح یابی کے احساس سے مغلوب ہو رہی تھی۔ذرا دیر بعد کمرے میں اپنی فرمائش پر حاضر ہونے والے مرد کو اس نے دیکھا تھا....

...اور اس کے ہاتھ سے شامپین کا گلاس چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا تھا۔وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

واپسی سے پہلے

ان دنوں ایک نیا جوڑا وولگا پر آیا تھا۔

وولگا کے ساحلی علاقوں میں جون کے پہلے ہفتے سے رونقیں بڑھنے لگتی تھیں۔ داچا آباد ہونے لگتے تھے اور رنگین اور خوبصورت چھتریاں چمک اٹھتی تھیں۔ ہر سال دنیا بھر کے خصوصاً ماسکو واسی مچھلی پکڑنے والے شائقین سیاحوں سے یہ ویران اور خالی علاقہ ایک دم سے آباد ہونے لگتا تھا۔ پندرہ پندرہ دنوں کے چار سیزن ہوتے تھے۔ پہلے سیزن میں ندی کا پانی چڑھنے اور آخری سیزن میں اترنے کے سبب ندی کی سطح پر بے حد دباؤ بنا رہتا تھا اور ان دو سیزنوں میں بھیڑ کچھ کم ہوتی تھی۔ مگر بیچ کے دوسرے اور تیسرے سیزن میں یہاں کا ماحول بے حد ہنگامہ پرور ہوتا تھا اور اس ٹھنڈے موسم کی فضا جیسے عرق عرق ہوتی رہتی تھی اور امنگوں کا سیلاب امڈتا محسوس ہوتا تھا۔

بالائی حصے میں جہاں داچا اور باغ تھے، ریستراں اور چھوٹے چھوٹے اسٹال بھی ہوتے تھے جہاں کے ویار، ٹین بند پنیر، خوبانی کے آچار اور نشیلی مشروبات کے علاوہ دوسری غذائیں ملتی تھیں اور ادویات بھی مہیا ہوا کرتی تھیں۔ ویسے وہاں آنے والے سیاحوں کی غذا

عام طور پر اس ساحل سے پکڑی گئی مچھلیوں کا بھنا ہوا گوشت اور مشروبات ہوا کرتی تھی اور وہ انہیں کا لطف اٹھانے وہاں آتے تھے۔ دو مہینے بعد اگست سے جب پت جھڑ شروع ہوتا اور ندی کا پانی نیچے سرکنے لگتا اور مچھلیوں کی قلت محسوس ہونے لگتی تو وہاں آف سیزن کی تختی آویزاں ہو جاتی۔

اور آخری سیزن کے داچا خالی ہونے لگتے تھے۔

یہ جوڑا تیسرے سیزن کے ابتدائی دنوں میں آیا تھا۔

الیوا بھورے بالوں اور چھوٹے چہرے والی ایک خوبصورت نئ عورت تھی۔ اس کی عمر 24-23 سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ وہ زور زور سے ہنستی تھی تو اس کی غلافی آنکھوں میں نمی پیدا ہو جاتی اور پلکوں کے کنارے بھیگ جاتے۔ داشا چوڑے اور جھکے ہوئے کندھوں والا ایک دراز قد مرد تھا اور اسے ہمیشہ گردن اٹھا کر آسمان دیکھنے کی عادت تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے داچا سے باہر آیا تھا اور الیوا کو آواز دے رہا تھا۔

''الیوا، الیوا... سنیے تو.... واپس آجایئے، آگے پانی کافی گہرا ہے۔'' ندی کے شور کے باوجود الیوا کی کھلکھلاہٹ اسے سنائی دے رہی تھی۔ ''الیوا خدا کے لیے جلدی واپس لوٹ آؤ... میں کسی کو ملوانے لایا ہوں۔'' اور تھوڑی دیر بعد الیوا کی کشتی کنارے سے ٹکرائی تو داشا نے خوش ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی مدد کے لیے بڑھا دیا۔ الیوا اس کی مضبوط ہتھیلی پکڑ کر کشتی سے نیچے نرم اور بھیگی ہوئی ریت پر آ گئی۔ اس نے چوڑا اور مہنگا لیس لگا ہوا بڑے بڑے چھاپے کا فراک پہن رکھا تھا اور بالکل جاپانی دکانوں کے شوکیس میں رکھی ہوئی گڑیا لگ رہی تھی۔ اسے ریت پر چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سہارے چل رہے تھے۔ دونوں جب اپنے داچا میں پہنچے، وہاں وہ شخص موجود تھا جسے داشا اس سے ملوانے لایا تھا۔ ''الیوا! ان سے ملو، مسٹر دموع۔ آج کا کھانا انہوں نے ہی مہیا کرایا ہے۔ بڑی عجیب

بات ہے کہ مسٹر دموع اپنے شکار کی مچھلیاں ہر روز دوسروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور انہیں روز نئے لوگوں کا انتظار رہتا ہے۔''

الیوا نے ممنون نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دموع سے ہاتھ ملایا اور کافی بنانے لگی۔ اس بیچ دموع چپ رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی پی کر چلا گیا۔

''یہ پراسرار شخصیت کون ہے داشا؟'' اس کے جانے کے بعد الیوا نے ہول ڈال سے رات کے کپڑے نکالتے ہوئے پوچھا۔

''کون؟ دموع؟ وہ یہاں سے قریب کے گاؤں میں رہتے ہیں اور شہر کے ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں۔ موجودہ انتظامیہ اس کارخانے میں کچھ تبدیلی کرنا چاہتی ہے جس کے خلاف مسٹر دموع اور ان کے ساتھی احتجاج کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی براہ راست لڑائی موجودہ نظام سے چل رہی ہے۔ سعی لاحاصل۔'' وہ گردن ہلا کر ہنسا تھا جب کہ الیوا سنجیدہ تھی۔

''سعئی لاحاصل؟''

''اور نہیں تو کیا؟ ہمیں اپنے سوچنے کا ڈھنگ حالات کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''نئے سے پرانے کی تجدید ضروری ہے۔''

''بشرطیکہ 'وہ' جسے ہم پرانا کہتے ہیں اور جس کی بنیاد پر تبدیلی کی مانگ کرتے ہیں، برا بھی ہو، ناکام بھی ہو اور اس بات کو دموع سمجھتے ہوں گے اور ہم اور آپ بھی کہ 'اسے' ناکام نہیں کہا جا سکتا۔''

داشا نے الیوا کو غور سے دیکھا تھا۔ ''ہم دموع کی بات کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''شاید اس کے دماغ میں خلل ہے۔''

الیوا کو انجانا سا دکھ ہوا۔

''دموع کو جانے کیسا یقین ہے کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہوگا ایک دن۔''

''ایک دن؟''

''ہاں ایک دن۔ وہ ایک کردار بھی ہو سکتے ہیں آپ کے ناول کے۔ مجھے پتا ہے، اسکول میں آپ کا موضوع نفسیات تھا اور آپ نے چند ایک اچھی کہانیاں اور ناولیں لکھی ہیں۔'' داشا کے لہجے میں شکایت تھی۔

الیوا کو شرارت سوجھی۔ ''نہیں، ایک اور اچھا کام کیا ہے میں نے، میں نے آپ سے شادی کی ہے۔'' اس نے جھک کر کورنش کیا۔ داشا اس کی طرف لپکا مگر وہ کھلکھلاتی ہوئی اور قلانچیں بھرتی ہوئی باہر ریت پر بھاگ گئی لیکن وہ جانتی تھی کہ داشا اپنے طالب علمی کے زمانے میں مشہور اتھلٹ رہ چکے ہیں اور وہ ان سے بھاگ نہیں پائے گی۔ لہٰذا اس نے بہت جلد خود کو اس کے سپرد کر دیا لیکن اس کی آنکھوں میں عاجزی مچل رہی تھی کہ وہ اسے زیادہ نہ ستائیں، وہ تھکی ہوئی ہے۔

دوسری صبح وہ گہری نیند میں تھے کہ کسی کے چلاّنے سے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ جلدی جلدی اٹھ کر باہر آئے تو آواز صاف سنائی دینے لگی۔ دموع اونچی آواز میں کہتا پھر رہا تھا۔ ''آج موسم ٹھیک نہیں ہے، طوفان آ سکتا ہے۔ کوئی اپنی کشتی ندی میں نہ اتارے۔''

''دموع آپ بہت اچھے ہیں۔ میری بات سن رہے ہیں دموع۔ آپ بہت اچھے ہیں۔'' الیوا اپنے پاؤں کے پنجوں پر اچک اچک کر بولتی رہی۔

داشا دوبارہ بستر پر گر گیا اور الیوا کے بہت چاہنے اور کوشش کرنے پر بھی نہیں اٹھا تب الیوا جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ اس نے رات کے کپڑے اتار کر علیحدہ رکھ دیے اور سلیٹی رنگ کے جینس کی اسکرٹ پر گہرے اسکوائر چیک کا بلاؤز پہن کر اور سر پر کھجور کی پتیوں کا بنا ہوا

ٹوپ لگا کر اس نے داشا کو پیار کیا اور باہر نکل گئی۔ وہ کافی دیر تک ریت پر چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد بڑے بڑے پتھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اُسے دموع نظر آیا۔ وہ ایک سپاٹ پتھر پر ٹیک لگائے اپنے اسکارف سے منہ ڈھانپے لیٹا تھا۔ اس کے کپڑے گندے ہو رہے تھے اور داڑھی کے بال بڑے بڑے۔ الیوا نے اسے آواز دی تو اس نے چہرے سے اسکارف ہٹا دیا۔

''آپ یہاں کیا کر رہے ہیں مسٹر دموع؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''انتظار.....''

''کس کا؟''

''وہی جو آئے گا۔ انہیں پتھروں میں سے اور اس سمندر کے بیچ سے۔ کہیں سے بھی۔'' وہ زور زور سے اپنی داڑھی نوچنے لگتا تھا۔ الیوا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے من میں آیا کہ کیا اس آدمی سے کبھی کسی عورت نے پیار کیا ہوگا جب کہ دموع سندر بھی ہو سکتے ہیں، اگر ان کی داڑھی ترش جائے اور بال سنور جائیں۔

دموع ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ الیوا سمجھ رہی تھی کہ ان کی نظریں داشا کو تلاش رہی ہیں۔

داشا بڑے اچھے ساتھی ہیں دموع۔ آپ نے دیکھا نہیں ان کی پیشانی کافی چوڑی اور بال لمبے اور چمکدار ہیں۔''

موسم بدلنے لگا تھا، گرمی بڑھ گئی تھی اور ریت اڑنے لگی تھی۔

''ہاں، ہمارے اپنے وچاروں کا فرق ہو سکتا ہے، یہ میں مانتی ہوں۔'' اس نے اپنا ٹوپ اتار لیا تھا اور ہوا کرنے لگی تھی۔

''داشا ہمیشہ آسمان دیکھتے ہیں اور انہیں زمین کی نا برابری کا احساس نہیں ہے شاید اور یہ ایک بڑی عجیب بات ہے۔'' دموع نے دور کہیں خلا میں گھورتے ہوئے اپنی بات کہی۔

''آپ سچ کہتے ہیں دموع، آپ سچ کہتے ہیں۔ طاقت والے لوگ، عجوبے لوگ

ہمیشہ داشا کے آدرش رہے ہیں۔ وہ سماج میں اپنے سے بڑوں کی قدر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میخائل کل بھی کامیاب مرد تھے اور آج بھی ہیں۔ آپ سچ کہتے ہیں۔''

''بات آئیڈیالوجی کی نہیں ہے اچھی الیوا، بات ہے اپنی ذہنیت کی، اپنی اس سوچ کی جس کی لکڑ مٹے جیسی شاخ پر انسان بیٹھنا چاہتا ہے۔ سچ، یہ بہت عجیب بات ہے۔''

دموع کا اسکارف ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور وہ اپنی داڑھی نوچ رہا تھا جس سے الیوا کو الجھن ہو رہی تھی۔

''میں بھی چاہتی ہوں، میں بھی چاہتی ہوں کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے لیکن، ایک دم سے الٹ پلٹ کیسے ہو؟ آج بھی لوگ مصلحت پسند ہیں، سوچتے ہیں اچانک بجلی لہرائے گی اور کچھ ہو جائے گا۔۔ ایک دم سے ہو جائے گا، جیسے عجوبہ ہو۔''

دموع نے پہلی بار الیوا کی طرف دیکھا تھا۔

''آیئے میرے ساتھ۔''

دونوں چلنے لگے اور قریب کی کھلی سڑک پر آ گئے جو گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ دموع اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے ہوئے چل رہا تھا اور اس کے گلے کا اسکارف ابھی بھی ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی داڑھی نوچتا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دموع کا گاؤں دکھنے لگا تھا۔ گاؤں سے پہلے لکڑی کی بڑی بڑی باڑیں نظر آ رہی تھیں جو کافی وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں اور شالی بھوج اور لنڈن کے پرانے درختوں کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ 1917ء سے پہلے وہاں کوئی بہت بڑا فارم ہاؤس رہا ہوگا جس کا مالک کوئی زمین دار رہا ہوگا یا اس کا کوئی قریبی۔ اس سے لگ کر ہی مٹی اور لکڑیوں کی مدد سے کھڑی کی ہوئی گھاس کے چھپر والی جھونپڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان سے لگے سپاٹ اور بے ترتیب کھیتوں کا سلسلہ جن کے کناروں پر بید اور بکائن کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور چتکبرے گھوڑے چر

رہے تھے۔

ایک جھونپڑی کے پاس دموع ٹھہر گیا تھا اور الیوا کی طرف دیکھا تھا۔

''کون؟''

''یہ میرے بابا ہیں۔'' اندر جا کر اس نے کہا تھا۔ کمرے میں بید کی دو تین پرانی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور دیواروں پر کئی طرح کے پوسٹر سٹے ہوئے تھے۔

• بھوک سرمایہ داری کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔

• اس فرسودہ نظام کی بنیاد آزاد مارکیٹ کے اندھے تقاضوں پر ٹکی ہے۔

• کیا انسانی ارتقا محض ایک دھوکہ ہے؟

• کیا دبے کچلے انسانوں کی تقدیر میں ایک رات کے بعد دوسری رات لکھی ہے؟

پوسٹروں کے کئی بوسیدہ بنڈل ایک طرف اس کونے میں بھی رکھے ہوئے تھے جہاں اونچا، دبلا اور دمے کے مرض سے پیلا پڑ گیا ہوا بوڑھا ایک کھاٹ پر پڑا ہوا تھا اور اس کے منہ سے اخ...اخ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پہلی ہی بار میں الیوا کو اس بوڑھے آدمی سے ہمدردی ہونے لگی۔ وہ اپنے من میں اس کی مدد کے لیے سوچ ہی رہی تھی کہ دموع نے اسے بید کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور وہ بیٹھ کر سوچنے لگی کہ سچ، وہ کتنی انہونی بات سوچ رہی تھی۔ دموع بھلا ایسا کب چاہیں گے؟

اس کے سامنے کی کرسی پر کئی مڑے تڑے کاغذ کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا ان کاغذ کے ٹکڑوں پر یونہی اسکیچنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لگتا تھا نرسری کے کسی بہت چھوٹے بچے نے ڈرائنگ کے پنوں پر شاید وولگا کے، ندی کے، دو کناروں کو بار بار بنانے کی کوشش کی ہو۔

دموع بتا رہا تھا کہ اس کے بابا کسان تھے اور وہ خود ایک کارخانے میں مستری ہے

اور یہ کہ وہ یونین کرتا ہے اور احتجاجی پارٹی کا لیڈر بھی ہے۔اس نے کہا ہمارے کارخانے کے سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ پیداوار کے لیے 'بورژوا' حکمت عملی کو کارگر بنانے کی غرض سے کارخانے کے ہزاروں مزدوروں کی تعداد کم سے کم کر دینا چاہتے ہیں اوران کی یہ استحصالی نوعیت ہزاروں مزدوروں کے مستقبل کو کھا جائے گی۔زندگی ایک طویل سفر ہے اوراس سفر میں مسلسل لڑائی ہے اور لڑنے کے لیے، مرنے کے لیے یہ مزدور ہی جاتے رہے ہیں اور انہیں ہی جانا ہوگا جن کا سماج میں کوئی مقام نہیں کوئی قدر نہیں۔کتنا عجیب ہے یہ سب؟''

دموع تھوڑی دیر اپنے بابا کے پاس اس کی کھاٹ پر بیٹھا رہا اوراس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتا رہا، پھراس نے الیوا کو آواز دی۔

''الیوا! یہاں آیئے اور میرے بابا سے ان کے ایک عظیم کسان دوست شین کی نظم سنیے۔''

الیوا اٹھ کر دموع کے بابا کی کھاٹ تک پہنچی۔اس نے دیکھا وہ بوڑھا آدمی بیماری سے کھاٹ میں ہی جیسے سٹ گیا تھا اوراخ...اخ سے ایک دم سے بے سدھ ہوکر ہانپنے لگتا تھا اور پھر پیلی آنکھیں موند کر غنودگی میں ڈوب جاتا تھا۔الیوا کو مایوسی ہوئی کہ ایسے میں وہ دموع کے بابا سے ان کے عظیم کسان دوست کی نظم شاید ہی سن پائے گی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر چمک آگئی۔دموع کے بابا نے دھیرے دھیرے نظم سنانا شروع کی۔پیلی آنکھیں کھل گئیں اور چھپر کی گھاس میں کہیں اٹک گئیں۔

''تم

وچرتے رہو

سپنوں کی دنیا میں

لال، پیلے، نیلے، ہرے، سنہرے

خوابوں کے دھاگے بنتے رہو

ایک دن

وہ سمے آئے گا

جب تمہاری روٹی

چھوٹی

بہت چھوٹی ہو جائے گی۔''

ندی میں طوفان زوروں کا تھا اور تیز ہوا کے جھونکوں سے چھپر کی گھاس گرنے لگتی تھی۔

نظم سننے کے بعد الیوا کے چہرے پر چمک کی جگہ اداسی چھا گئی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ آج وہ ایک نئی دنیا سے متعارف ہو رہی تھی۔ اس کا من کر رہا تھا کہ وہ اپنا سر کھاٹ کے پوے سے ٹکرا کر پھوڑ لے۔ دموع بکھرے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کو سمیٹنے لگا تھا اور اپنی آستین میں منہ چھپا کر سسکیوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔''ان کی مورتیاں چوراہوں اور لائبریریوں سے اٹھا کر کوڑے کے ٹرنک میں پھینک دی گئیں اور سارے طالب علم اور فنکار خاموش تماشائی سے بنے رہے۔ اسی دھول میں کہیں روس کی اپنی تہذیب چھپی ہے، اور وہ یہیں سے کہیں سے آئے گا، یہ بتانے کہ موقع پرستوں سے کیسے لڑا جاتا ہے؟'' وہ امید بھری نظروں سے الیوا کو تاک رہا تھا۔ الیوا نے کھونٹی پر ٹنگا دموع کا کئی رنگوں والا کوٹ جس کے فلیپ میں یوم مئی کا سرخ بیج لگا ہوا تھا اور جس میں سے مردانہ پسینے کی گندھ پھوٹ رہی تھی، اتار کر اسے پہنا دیا اور اس کے ساتھ گاؤں میں چلی آئی۔ گاؤں میں سرو کے پیڑوں پر پت جھڑ کا اثر شروع ہو گیا تھا اور مٹی خشک ہو گئی تھی۔

دموع نے کہا کہ آج اس کے ساتھی ڈراما پیش کریں گے۔ ان کے ساتھ کچھ ایسے

طالب علم بھی ہیں جو اسی گاؤں کے ہیں لیکن شہروں کی یونیورسیٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس وقت گاؤں آئے ہوئے ہیں۔ اس دن الیوانے دموع کے ساتھ گاؤں کے تھیٹر میں ناٹک بھی دیکھا۔ اسے یہ سب بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ تھیٹر کی معمولی نشست پر بیٹھی ناٹک کے ایک منظر کو دیکھتے ہوئے وہ پہلو بدل رہی تھی۔

ایک ماں جس کا بیٹا مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کی رہبری اور سربراہی کرتا ہے اور اشتراکیت کا علم بردار مانا جاتا ہے وہ صرف اس بنا پر منافع خوری، افسر شاہی اور کرپشن کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کے اشتراکی اصول اسے سوکھی روٹیاں، موٹے کپڑے اور معمولی چھت تو دے سکتے تھے مگر اعلا قسم کی مصنوعات اور اعلیٰ طرز زندگی فراہم نہیں کر سکتے تھے اور جو اپنے یہاں رات کے کھانے پر تھانے کے داروغہ اور تحصیل کے بابو کو مدعو کیا کرتا ہے....

....اس ماں کو یہ احساس ہے کہ اس کا بیٹا ضرور کسی سازش کا شکار ہو گیا ہے اور وہ نائٹ کلب اور ڈرگ کے عادی اپنے بیٹے کو سمجھانا چاہتی ہے کہ نجات اسی میں ہے کہ معیشت کی اجتماعی اور سماجی نوعیت ہو اور اس کی بنیاد انفرادی منافع خوری پر قائم نہ ہو۔ جب تم ہی موقع پرستوں کا چشمہ اپنی آنکھوں پر چڑھا لو گے تو انفرادی آزادی کے مسئلے کا حل اور معاشی آسودگی کی راہ ڈھونڈ نکالنا تو دور ان بھوکے اور ننگے لوگوں کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھکنے کے لیے کپڑا کیسے ملے گا؟

اس کا بیٹا کہتا ہے کہ تم کس اشتراکیت کی بات کرتی ہو؟ جس میں انسانوں کو گونگا بنا دیا گیا تھا، ان کی خودمختاری چھین لی گئی تھی۔ کیا تم نے سول زے نت سن اور پاسترناک کے ناول پڑھے ہیں؟ کیا تم نہیں جانتیں کس قدر گھٹن تھی اس سماج میں آج سے پہلے۔''

''کتابوں اور ناولوں کی بات میں کیا جانوں؟ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میں نے کبھی

روس کی سڑکوں پر بھکاریوں کو نہیں دیکھا۔ ڈرگس اور سمیک کے نشے میں دھت نوجوان نظر نہیں آئے۔ ملازمت کے دفتر کے دروازے پر بے روزگاروں کی لمبی قطار نہیں دیکھی۔ جہاں عورت کو برابری اور احترام کی نظر سے دیکھا گیا اور جس روس کو عورتوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا وہ آج کی طرح ٹکڑوں میں بٹی روس کی سرزمین نہیں تھی۔''

ماں چیختی رہی، اپنے بے آبرو ہونے کی دہائی دیتی رہی مگر بیٹا گونگا اور بہرا بن گیا۔

ناٹک ختم ہونے پر دموع نے ناٹک کے فنکاروں سے الیوا کا تعارف کرایا۔ ان میں سنہرے بالوں والی چھوٹے قد کی وہ لڑکی بھی تھی جو ناٹک میں ماں کا کردار ادا کر رہی تھی۔ الیوا نے محسوس کیا کہ وہ لڑکی اب تک خود کو نارمل نہیں کر پائی ہے اور اس کی آنکھیں اداس ہیں۔

اس نے گاؤں کی دکانوں سے داشا کے لیے کئی نایاب چیزیں جیسے مٹی کی مورتیاں اور کئی رنگوں والے لباس خریدے جنہیں یقیناً داشا نے کبھی دیکھا نہیں ہوگا۔ جب وہ داچا کی طرف لوٹے اور بڑے بڑے پتھروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس وقت سورج کافی نیچے جھک گیا تھا اور پنچھی خلاؤں میں چھپنے لگے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد تربوز کی قاش کی مانند سرخ ہو کر سورج سیاہی میں بدل گیا تو ہر طرف سائے سائے سے دکھائی دینے لگے اور ہوا گرم ہو گئی۔

''اب مجھے جلدی چلے جانا چاہیے۔'' الیوا نے کہا اور تیز تیز چلنے لگی۔ ''داشا کیا سوچ رہے ہوں گے اور میں ان سے کافی دیر سے الگ ہوں، اور ایسا بہت ہی کم ہوا ہے۔''

''الیوا.....''

جب تک وہ مڑی، دموع اس کے شانے پر سر رکھ کر سسکنے لگا تھا۔

''اوہ دموع! آپ بہت اچھے ہیں۔'' الیوا بولی۔ ''آپ مضبوط، ایماندار اور غیر معمولی ہیں اور ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔'' اس نے دموع کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے

اپنے سے الگ کیا اور بے تحاشا اپنے داچا کی طرف دوڑنے لگی۔ ایسے میں اس کا ٹوپ اور داشا کے لیے خریدی ہوئی چیزیں گر کر اندھیرے میں جانے کہاں گم ہو گئیں۔ بس وہ ایک تیز ہیجان کے دباؤ میں بھاگتی رہی اور اپنے داچا میں پہنچ کر دم لینے لگی۔ اس نے پہلے کھانے کے کمرے میں جھانک کر دیکھا مگر وہ خالی تھا۔ سونے کے کمرے میں داشا اکیلے تاش کھیل رہا تھا۔ وہ ابھی تک انہیں کپڑوں میں تھا جو اس نے پچھلی رات پہنے ہوئے تھے۔

الیوا کو ایک دم سے اس پر ترس آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو داشا نے تاش بند کر کے رکھ دیا۔ ظاہر تھا کہ وہ ناراض تھا اور الیوا سے فی الحال بات کرنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔

'اوہ میرے اچھے، پیارے داشا۔ آپ اس طرح اپنی بے رخی سے مجھے دکھی نہ کریں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ مری وجہ سے آپ کو آج پورے دن بھوکے رہنا پڑا۔'' وہ اس پر لیٹ سی گئی۔ داشا نے اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ کراہ اٹھی۔ اس نے اسے نیچے گرا کر اس کے ہونٹوں کو اپنے پورے منہ میں بھر لیا اور اسکرٹ نیچے سرکا دی۔

''خود غرض ہیں آپ۔' الیوا نے اس کے گال پر طمانچہ جڑ دیا اور تڑپ کر بستر سے نیچے آ گئی۔ داشا سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ الیوا نے اسکرٹ اتار کر داشا کی نیکر چڑھا لی اور کافی بنانے لگی۔ اس نے دموع کے ساتھ گزرے وقت، ناٹک کے کرداروں اور گاؤں کے پڑھے لکھے لوگوں کی پوری روداد کافی پینے کے دوران داشا کو سنا دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس دلکش ماحول میں، اس کبھی نہ بھولنے والی جگہ پر داشا اداس ہو جائیں۔ اس نے سوچا زندگی میں نہ بھولنے والے لمحے کتنے کم ہوتے ہیں؟ پھر دونوں نے مل کر رات کا کھانا کھایا، کھانے کے بعد پھر کافی، اور تب دونوں نے شب بخیر کہا اور سو گئے۔

دن کے گیارہ بجے تک الیوا سوتی رہی۔ اٹھی تو داشا خط لکھ کر اور اپنی ڈوری والی بنسی لے کر کشتی میں جا چکا تھا۔ اس نے خط پڑھا۔

''پیاری اور دنیا میں سب سے اچھی الیوا''

دکھ ہے کہ میں تمہیں جگا کر صبح بخیر نہیں کہہ سکا۔ بغل کے داچا میں کریمیا کے فنکار ہیں اور جن کی باہری ملکوں میں بھی تصویروں کی نمائشیں لگا کرتی ہیں، ان کی دعوت نہ ٹال سکا اور مچھلیاں پکڑنے جا رہا ہوں اور آپ کے لیے ان کی پینٹنگس چھوڑے جا رہا ہوں۔

میں ایک بار پھر اپنے عظیم پیار کو یاد کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ دنیا میں جتنی عورتیں ہیں آپ ان سب میں اچھی ہیں۔

آپ کا اپنا.....داشا۔

الیوا نے آنکھیں موند کر داشا کو یاد کیا اور بدبدائی۔ ''اوہ داشا، میں انتظار کر رہی ہوں اس اچھی گھڑی کا جب آپ لوٹ کر آئیں گے اور ہم دونوں ہنس ہنس کر کافی پئیں گے اور ادب، آرٹ اور موجودہ سیاست پر سنجیدگی سے باتیں کریں گے۔ پیارے داشا، آ جایئے۔''

وہ کریمیا کے فنکار کی پینٹنگس دیکھنے لگی مگر چند ساعتوں میں اوب سی گئی۔ چاندنی رات، خوبصورت عورت، پرندوں اور پہاڑیوں سے گرتے ہوئے جھرنوں کے علاوہ ان تصاویر میں ایسا کچھ نہیں تھا جن میں زندگی کے معنی تلاش کی جا سکیں۔ ایک تصویر میں وولگا جم کر برف کا میدان بن گئی تھی اور اس کی سفید چادر پر سفید ہی مگر اس برف کی رنگت سے مختلف کسی دوسری دنیا کی مخلوق جیسے بچے اسکیٹنگ کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ اس نے گہرا سانس لیا اور تصویروں کو بند کر کے رکھ دیا۔

تقریباً دو بجے دموع آیا تھا۔ پہلے کی طرح وہی ربر کا بوٹ اور کرمچ کی پتلون پہنے ہوئے۔ اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ پوری رات سویا نہیں ہے۔ وہ خاموش دھوپ میں کھڑا تھا۔

''آپ کیسے ہیں دموع؟'' اسے چپ دیکھ کر الیوا نے پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں۔

انقلاب کب آئے گا؟

میری پتلون کی جیب میں پڑی

ہلتی ڈلتی

میری یہ پانچ انگلیاں

پوچھتی ہیں

''انقلاب کب آئے گا؟''

کل رات میرے بابا نے اپنے عظیم کسان دوست شین کی نظم پھر سنائی۔ سچ، میں رات بھر سویا نہیں ہوں۔'' اور تھوڑی دیر بعد داشا بھی لوٹ آیا تھا اپنے کندھوں پر دو بڑی بڑی ہیرنگ مچھلیاں لادے ہوئے، جن کی جڑوں سے خون رس رہا تھا اور ان کی آنکھیں ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ اس نے ڈوری والی بنسی کھانے کے کمرے میں رکھ دی تھی اور مچھلیوں کو الیوا کے سامنے فرش پر پٹک کر مسکراتے ہوئے فخر سے بولا۔

''پچیس پونڈ کی ایک۔''

''اوہ عجوبے داشا، آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ دیکھیے دموع ہے نا یہ عجوبہ؟''

''ندی میں جہاں تک پانی بہتا ہے اور جہاں تک یہ تیر سکتی ہیں، وہاں تک ان کی حکومت قائم رہے اس کے لیے انہوں نے نہ جانے کتنی چھوٹی مچھلیوں کا نشانہ بنایا ہوگا۔ اس بھیتر کی دنیا میں جہاں ہماری اور آپ کی معمولی نظر نہیں پہنچ سکتی، بڑا ہونے کے لیے، ننگے پاؤں اوپر پہنچنے کے لیے استحصال کی سیڑھی کا سہارا لیا جاتا ہے اور وہاں دوسرے کی ایڑی کی بدولت اپنا قد ناپنے کی اور کسی دوسرے کی بیساکھی کے سہارے رینگنے کی کوشش کی جاتی ہے اور آج یہ مچھلیاں مسٹر داشا جیسے شکاری کے ہاتھ آ گئیں تو عجوبہ ہو گئیں، پچیس پونڈ کی۔''

دموع نے مچھلیوں کے شلک تراشنے اوران کے دانت نکالنے میں داشا کی مدد کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے... یہ ٹھیک ہے۔'' داشا کے ساتھ آیا ہوا کریمیا کا فنکار پہلی بار بولا تھا۔وہ بھری آنکھوں اوراکہرے بدن کا چالاک مرد تھا۔وہ دولت مند تھا اوراس کی انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں اور کوٹ میں مہنگے کلیپ لگے ہوئے تھے مگر وہ اپنی حرکت سے بے وقوف لگتا تھا جیسے اس کے اپنے نام کی کوئی شے نہیں۔نہ اصول، نہ سوچ اور نہ کوئی نظریہ۔وہ ہمیشہ سامنے والے کے من کی بات کرتا تھا اور اسے خوش رکھنا چاہتا تھا اور ایسے خوشامدی لوگوں سے الیوا کو ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔جن کے پاس اپنی زندگی کا کوئی بنیادی جواز نہیں ہوتا اور جن کے پاس کچھ کہنے کو اپنے الفاظ نہیں ہوتے، وہ شاید ہاں یہ ٹھیک ہے، ہاں یہ ٹھیک نہیں ہے، کہہ لینے بھرہی سے اکتفا کرتے ہیں۔جن کے پاس اپنا کچھ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر اپنا اعتماد جب اپنے پاس ہوتا ہے تو وہ کسی سے ریت مستعار لے کر محل کھڑا نہیں کرتے۔ جزوی طور پر بھی نہیں۔الیوا نے سوچا، پتا نہیں یہ آدمی ایزل، برش اور کینوس سے کس طرح رشتہ قائم کرتا ہوگا۔اس نے ڈچ فن کارواں گوگ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ تمام عمر اذیتوں میں جیتا رہا اور جو رنگوں کے حوالے سے اپنے عہد کو زندگی کی سچائیوں سے روشناس کرانے کا کرب جھیلتا رہا اور جس کے برش نے رنگوں کے امتزاج سے کیسے کیسے جہان معنی کینوس کے حوالے سے پیدا کیے تھے۔

الیوا نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ فنکار ہیں اور آپ اس بات کو اچھی طرح، ہم سب سے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

داشا نے ہیرنگ کی دم الیوا کے منہ پر رگڑ دی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔اس کی

آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور کنارے بھیگ گئے تو وہ بہت ہی کم سن، پیاری اور معصوم لگنے لگی۔ پھر داشا اور کریمیا کا فنکار بہت دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ان کی بات چیت مصوری اور موسم پر ہو رہی تھی۔ کریمیا کا فنکار جلدی جلدی اپنی گردن ہلاتا تھا اور وہ دموع اور الیوا کی موجودگی کو تقریباً بھول گئے تھے۔ گرمی بڑھ گئی تھی اور شام کے جھٹ پٹے میں باغ کی جھاڑیوں سے بکائین کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ دموع خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد کریمیا کا فنکار بھی۔

الیوا نے ہاتھوں میں منہ چھپالیا اور سسکنے لگی۔

''آپ چپ ہو جائیے الیوا!!! اور رونے کی وجہ بتائیے؟'' داشا نے بے چین ہو کر اپنی نیک ٹائی نوچ ڈالی۔

''میں دکھی ہوں داشا، آپ چاہیں تو میری مدد کر سکتے ہیں۔'' اس کی سسکی ہچکیوں میں بدل گئی تھی۔

'اوہ اچھی الیوا، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں پھر اس طرح رونے کی کیا وجہ ہے؟''

''میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی کہ آپ کا سلوک غیر مہذب ہوتا جا رہا ہے۔ اب آپ میں وہ بات، وہ خوبی نہیں پائی جاتی جس سے ہمارے مہمان متاثر ہوا کرتے تھے۔ ہمیں ہمیشہ لوگوں کو یاد آتے رہنا چاہیے۔'' وہ پھر سسکنے لگی اور مچھلی پکڑنے والی نپکین سے اپنی گیلی ناک صاف کرنے لگی۔

''لیکن میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے اچھی الیوا؟'' اس میں بے کلی بھر گئی تھی۔

''آپ نے مسٹر دموع کو، اس اچھے اور نیک آدمی کو یکسر نظر انداز ہی کر دیا۔ نہ جانے وہ کیا سوچتے ہوں گے؟ آپ نے انہیں مخاطب تک نہ کیا۔ اوہ میرے داشا، یہ آپ نے کیا کر دیا۔ اب میں ان کے سامنے کیسے جا سکوں گی؟''

''الیوا میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سچ مچ میں پاگل ہو جاؤں گا اور شاید اسی وولگا پر میری قبر بن جائے۔ میں کل صبح ہی مسٹر دموع سے معافی مانگنے جاؤں گا۔ سچ، میں یقین دلاتا ہوں۔''

دوسری صبح دونوں گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر دموع سے ملنے گئے تو وہ اپنی بید کی کرسی پر بیٹھا کاغذ کے ان ٹکڑوں پر جن پر وولگا کے، ندی کے دو کناروں کو اسکیچ کیا گیا تھا، گہرا سرخ رنگ بھر رہا تھا۔ ایک رات میں ہی وہ پیلا اور بہت بیمار ہو گیا تھا اور ممی سا دکھ رہا تھا۔ کوچی پھنسی ہوئی انگلیوں کی رگیں جیسے کیکڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ اپنی آنکھیں بار بار موند تا اور کھولتا تھا جیسے ان میں شدید درد ہو اور وہ پوری رات کام کرتا رہا ہو، اسی بید کی کرسی پر بیٹھ کر، انہیں کاغذی جھنڈوں اور پوسٹروں کے بیچ۔

دموع کے بابا، وہ بوڑھا اور بیمار آدمی پہلے سے زیادہ بیمار ہو گیا تھا اور کھاٹ سے سٹ گیا تھا۔ اب اس کے منہ سے اخ...اخ کی دبی دبی آواز نکلتی تھی اور بڑی مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ اب وہ اپنے عظیم کسان دوست کی نظم سنانا بھی چاہتا تو وہ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

اس کی خواہش ہوئی کہ وہ دموع سے کہے کہ وہ اس کے بابا سے پھر نظم سننا چاہتی ہے مگر اس بوڑھے آدمی کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ داشا سر جھکائے کھڑا تھا۔ الیوا کو اور بھی دکھ ہوا۔ اس نے جیسے سرگوشی میں کہا۔

''داشا بہت شرمندہ ہیں۔ کل آپ کو اس طرح چپ چاپ نہیں چلے آنا چاہئے تھا۔''

دموع نے کہا۔ ''کل کارخانے کے مزدور انتظامیہ کے آگے اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مظاہرہ کریں گے۔''

''مسٹر دموع آپ بیمار ہیں۔''

''ہاں، شاید۔''

''لیکن...''

''لیکن ان کی طرح... ہماری سوچ... ہمارا ارادہ... شاید بیمار نہیں۔''

''پھر بھی...''

''ہمیں بہت کام کرنا ہے ابھی۔ کل تک کوئی زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کل گرفتاریاں بھی ہوں؟''

''مسٹر دموع آپ کی پیلی آنکھیں دیکھ کر ہمیں دکھ ہو رہا ہے۔''

''کل ہمارے ساتھ بابا بھی ہوں گے....''

اس بوڑھے آدمی کی اخ اخ سنائی دی تھی تب۔

''کل میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گی۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے میں ہر پل چھوٹی ہوتی جا رہی ہوں۔ ایک نقطے میں میرا قد سمٹنے لگا ہو جیسے....''

''دموع آپ تبدیلی میں یقین رکھتے ہیں؟'' پہلی بار داشا نے دھیرے سے کہا تھا۔

''ہاں لیکن...'' اس نے اپنی داڑھی بے دردی سے نوچی اور درد سے بلبلا اٹھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

اس نے کہا۔ ''لیکن ایسی تبدیلی میں نہیں کہ ماسکو کے چوراہوں پر زندہ گوشت بکنے لگے اور دکانوں میں آگ۔ کیا تبدیلی کی یہی مانگ ہے؟ کون جواب دے گا؟'' اس نے باری باری الیوا اور داشا کو دیکھا۔

''مہربانی کر کے میری بات سنیے، آپ کی سوچ ہیجانی ہو سکتی ہے۔''

''اسی مٹی میں عظیم لیکن بدقسمت روس کی اپنی تہذیب کہیں چھپی ہے جس کے سینے پر مغربی تہذیب ننگا ناچ کر رہی ہے۔ اس کو کون دیکھ رہا ہے؟ کیا کوئی نہیں؟ کوئی بھی

نہیں؟ ماں کہاں ہو...؟''

الیوا اور داشا لوٹ آئے تھے اور ایک ریستراں میں بیٹھ گئے تھے۔

''جیسے سب کچھ ہونے میں بھی کچھ بھی نہ ہونا ہے۔''

''مگر فطرت تو ہر وقت کچھ ہوتے رہنے کی مانگ کرتی ہے۔'' الیوا کے رگ و پے میں ایک سیلن بھری گھٹن سماتی محسوس ہوئی۔

''ہاں، جیسے اپنے نہ ہونے پر بھی ہونے کا گمان خود پر غالب کرنا۔''

''سچ یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل لڑائی ہے۔''

ویٹر کریم والی کافی رکھ گیا۔

''دموع چند کو پیک کے لیے محتاج ہیں۔''

''داشا... داشا... اوہ داشا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانی سماج میں انسان کی قدر اس کے مقام سے ہوتی ہے اور جن کے لیے دولت اور عہدہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔''

''جبھی تو...۔''

''میں سمجھنا چاہتی ہوں داشا۔''

''آسمان میں چمکتے تاروں کو ہم گن سکتے ہیں لیکن توڑ نہیں سکتے۔ کیا یہ حد انسانی ارتقا کو شو بھا دیتی ہے؟ کیا یہ انصاف کی مانگ نہیں کرتی اور کیا یہ فکر کا موضوع نہیں جس پر دانشور سوچیں۔''

''تب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے، اپنے بوٹ کے اندر بدبو میں اڑسے پاؤں کو دھونے اور بدبو دور کرنے کی بجائے بیوی کو 'تو' کہنا اور اس کی بے عزتی کرنا شاید وہاں سکھایا جاتا ہے یا خود ہی سیکھ جانا پڑتا ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے بہرحال معیار اور عہدے کا حق دار بلکہ حصہ دار ہوا جا سکتا ہے۔''

''فطرت بھی تغیر کا ایک روپ ہے۔ اگر ترقی پسند انسان تغیر کو اپناتا ہے اور سوچ کو سمت دیتا ہے تو اس میں جواز تلاشنے کی کیسی گنجائش ہونی چاہیے؟ اور یہ کیا صحیح ہے، گنجائش نہیں بھی ہو اور ہو بھی؟''

''لیکن اسے اس سمت کو طے کرتے وقت اس کی نوعیت اور اقدار کا بہر حال جائزہ لینا ہوگا اور اگر دانشور طبقہ بھی اس رجحان کی قیادت نہیں کرے تو پھر...امیدیں تو شاید یا پھر ہر حال میں کرنی چاہیے اور اس کی مانگ بھی ورنہ اس سے کس کی صحت متاثر ہوگی؟ کیا کریمیا کے فنکار جیسے لوگوں کی؟ جب کہ دموع مزدوروں، محنت کشوں کے بیچ کا ایک محنت کش مانگ کرتا ہے اور کل اس کی مانگ کرے گا۔ کسی بیساکھی کے سہارے تیز تیز چلنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے پاؤں پر رہیں اور زمین کی سطح پر رینگیں۔ اور یہی سمت معیشت اور اخلاقیات کی معیار بلند کرتی ہے۔ ورنہ کریمیا کے فنکار کے مطابق یہ سب ٹھیک ہے اور جو شاید ضروری نہیں سمجھا جاتا۔'' الیوا کے چہرے پر تھکان کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔

داشا نے جھنجھلا کر اس کا دھیان اس طرف مبذول کرایا کہ اب تک اتنی دیر سے ان دونوں کے بیچ کتنی غیر اہم، غیر دلچسپ اور اکتا دینے والی بات چیت ہو رہی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے بارش ہونے کے بعد کی گرمی۔ اس نے کہا کہ انہیں ابھی کچھ دیر کے لیے الگ ہونا ہوگا بلکہ اسے وہاں سے چلے جانا ہوگا تاکہ دونوں ٹھیک طرح، ایک نئی طرح پھر سے سوچ سکیں۔

''ہاں شاید یہی ٹھیک ہوگا۔''

داچا میں آ کر داشا اپنا سامان باندھنے لگا اور الیوا نے باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ بکائین کی جھاڑیوں سے آنے والی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوا اس سے ٹکرائی تو اسے لگا، سیلن بھری گھٹن کا احساس جیسے ایک دم غائب ہو گیا ہو اور اس نے منہ کھول کر ہوا کو پینے کی

کوشش کی تو لگا اس کے پھیپھڑے میں اچانک حرکت پیدا ہوگئی ہو اور وہ جی اٹھی ہو۔ وہ دیر تک کھڑکی کے پاس ٹھہری ہوا کے تھپیڑوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی رہی۔ داشا تیار ہو کر جانے لگا تو اس نے کہا۔

''ہمیں بہر حال بہتری کی امید کرنی چاہیے اور اس کے لیے آزاد ذہن سے سوچنا چاہئے۔'' داشا سر جھکائے باہر نکل گیا اور وہ کمرے میں تنہا رہ گئی۔ اچانک وہ اچک کر دروازے پر پہنچی اور اونچی آواز میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''داشا، داشا ہمیں پریکٹیکل ہونا چاہیے۔ اچھا الوداع داشا۔''

داشا چلا گیا۔

اور دوسرے دن شام کو الیوا اسے خط لکھ رہی تھی۔

''آج دموع اور ان کے بابا ایک حادثے میں مارے گئے۔ میں اگلے ہفتے لوٹ رہی ہوں۔ میں گزارش کروں گی اور آپ اجازت دیں (یہ لکھتے ہوئے اسے وہ لڑکی یاد آئی جس نے ناٹک میں ماں کا کردار ادا کیا تھا اور جس کی آنکھیں بہت دیر تک، ناٹک ختم ہونے کے بعد تک اداس تھیں۔ اس نے خود پر بھی ویسی ہی اداسی کا کہرا چھاتا ہوا محسوس کیا) تو میں مرحوم کامریڈ دموع کے بنائے ہوئے پوسٹر اور ان کا کئی رنگوں والا کوٹ جس کے فلیپ میں یوم مئی کا سرخ بیج لگا ہوا ہے اور جس میں سے مردانہ پسینے کی بو، پھوٹتی رہتی ہے، لیتی آؤں؟''

سدا آپ کی،

............الیوا............۔

چھوتی تی تی تا

اراؤں ۔ وسطی بہار کا ایک گاؤں اور اس کی ایک صبح ۔ ادھر، جدھر آسمان جھکا ہے، دھرتی کی کوکھ سے نوزائیدہ بچے جیسی ملائم، گلابی صبح دھیرے دھیرے پاؤں نکال رہی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ریڑھ کی ہڈیاں اکڑ گئی ہیں مجری کی۔ جسم کے ایک ایک حصے میں درد چبھنے لگا ہے۔ ہاتھ کی دسوں انگلیاں پھنسا کر جسم کو اینٹھتی ہے۔ چرر...ر....انگ انگ سے رس ٹپکنے لگا تھا لاج کا۔ چہرہ سرخ ہو اُٹھا تھا۔ دھت...جھینپ جاتی ہے۔ زور پڑنے سے پچھے پر قمیص کی کئی کئی برسات کھائی سلائی بھسک گئی تھی۔ انگلی بھر چاک کے اندر سے گوری چمڑی لجائی لجائی جھانکنے لگی تھی۔

صبح کاذب سے قبل۔ ابھی صبح پوری طرح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ کونے کھدرے سے کھدبدی چڑیاں کھلی ہوا میں نکل آئی تھیں اور چھت اور اس کی ریلنگ پر پھدکنے لگی تھیں۔ دیکھتی ہے انہیں مجری اور پھدکتی ہے من ہی من اور چہچہاتی ہے پھر شانت ہو جاتی ہے۔ زور زور سے جماہی لینے لگتی ہے۔ رات بھیانک تھی۔ پوری رات اس نے چھت پر بیٹھے بیٹھے گزاری ہے۔ سونا تو دور چارپائی پر لیٹنے تک کی خواہش نہیں ہوئی تھی اس کی۔ بنا اس پوری

رات بہتی رہی تھی بلکہ رات اس کا بہاؤ کچھ زیادہ ہی تیز تھا۔ رہ رہ کر اس کی دھار سے ایک عجیب طرح کا شور پیدا ہوتا تھا۔ پوری رات اس نے خوف اور دہشت کے بیچ گزاری ہے۔ رات کا ایک ایک منظر اَب تک اس کی آنکھوں میں کسی خوفناک ڈراؤنے خواب کی طرح گھوم رہا ہے۔ ریت کی طرح گڑ رہا ہے چبھ چبھ، جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی بے شمار بتیاں... بڑے بھیا کا کھیت خالی ہو چکا ہے۔ بوجھے ڈھوئے جا چکے ہیں۔ عجیب ہے۔ رات کی سیاہی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا، صبح کے اجالے میں کچھ بھی نہیں۔ سوالیہ نشان لگ گیا تھا اجالے پر۔ اٹھ کر ریلنگ تک آتی ہے۔ پیپل کا درخت پہاڑ کی طرح کھڑا ہے۔ عرصہ پہلے بندھی ہوئی سوت کالی پڑ چکی ہے۔ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر لٹک رہی ہے۔ بناس اب بھی بہہ رہی ہے۔ برسوں سے بہتی آ رہی ہے۔ جن دنوں وہ تین ربر والی جانگیا پہنا کرتی تھی اور دو دو چوٹیاں آگے پیچھے لٹکائے نو گھروں میں سے ایک گھر میں غوٹی ڈال چھوتی تی تی تا کا کھیل کھیلا کرتی تھی، بناس کو تب سے بہتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ ضرور بناس میں اور اس کے کنارے پر کھڑے پیپل کے درخت میں کوئی گہرا رشتہ تھا۔ گاؤں میں کئی پیپل ہیں، بوڑھے بوڑھے اور کسی میں کوئی سوت کیوں نہیں لپٹتا؟

چھوتی تی تی تا.....

نو گھروں میں سے ایک گھر۔ یہ گھر میرا ہے۔ پورے حق کے ساتھ اس میں نشان لگا دیا کرتی۔ گویا خواب دیکھنا اس کا حق ہو۔

''اماں، بناس والے پیپل میں سوت کیوں لپیٹتی ہیں؟''

''یہ جان کر تو کیا کرے گی؟''

''میں بھی لپیٹوں؟''

''تیرا بیاہ ابھی نہیں ہوا ہے۔''

یہ گھر میرا ہے۔ چھوتی تی تی تا۔ برسات کے دنوں میں بناس جب پوری طرح بھر جاتی، وہ اپنے کھیت میں کام کرنے والی بنیہار عورتوں کے ساتھ گھاٹ پر چلی جاتی۔ یہ صرف بہانا ہوتا۔ دیکھنا تو ہوتا تھا پیپل کو۔ کیسے لپیٹتی ہیں سوت؟

چانچر پر بیٹھ کر دونوں پیر پانی میں لٹکا دیتی۔ ڈرپوک پر تھا تھا۔ پانی اسے کاٹتا تھا کئی کئی دنوں پر نہاتا۔ کلوٹا۔ ''تم جانتے ہو، پیپل میں سوت کیوں لپیٹتی ہیں؟''

وہ 'نا' میں سر ہلاتا۔ دور سے ہی تاکہ اس کی چھپر چھپر سے بھیگے نہیں۔ کھل کھل ہنس دیتی وہ۔ ''بدھو... تم بھی نہیں جانتے۔ ابھی میرا بیاہ نہیں ہوا ہے۔ بیاہ ہو جائے گا تو.....''

بھیگ بھاگ کر گھر لوٹتی تو اماں ڈانٹتیں۔

''تو لڑکی ذات ہے۔ وہ بھی بڑے گھر کی۔ بنیہاروں (مزدوروں) کے ساتھ تیرا میل جول ٹھیک نہیں۔ بڑے بابو کو پتا چل گیا تو...؟'' اماں کی صرف دھونس ہوتی تھی، ڈرانے کے لیے۔ بیٹی کے باپ کا پورا جسم آنکھ اور کان ہوتا ہے۔ انہیں پتا تو ہوتا ہی تھا لیکن انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ بس گود میں لے کر سمجھا دیتے۔ ''تم کوندی میں نہیں جانا چاہیے۔ کچھ ہو ہوا گیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم تو خوب روئیں گے۔ اوں...اوں...اوں۔'' بڑے بابو رونے کا ناٹک کرنے لگتے۔ تبھی وہ زور سے چھینکتی اور بڑے بابو سچ مچ رونے رونے کو ہو جاتے۔ فوراً آرہ، فاروق حسین کے دواخانہ، مٹھیا والے ڈاکٹر کے یہاں لے جاتے۔ بڑے بابو کافی پڑھے لکھے تھے۔ پہلے زمانے کے بی اے تھے۔ انگریزی فرفر بولتے تھے لیکن انہوں نے کبھی انگریزی دوائی نہیں دلوائی۔ کچھ ہوا نہیں کہ مٹھیا والے ڈاکٹر کے یہاں پہنچ جاتے۔ مٹھیا والے ڈاکٹر پہلے اسے دلارتے پھر اس کے منہ میں دو چار بوند دوائی ڈال دیتے۔ اتنی کسیلی کہ منہ کھرا ہو جاتا۔ پھر میٹھی گولیاں کھانے کے لیے دیتے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہو گئی۔ پہلے ہی میٹھی گولیاں ہاتھ میں لے لیتی اور دوائی پینے کے بعد فوراً منہ میں

ڈال لیتی۔ چلتے وقت وہ بھی تنبیہ کرتے۔

''ندی کے پانی میں مت کھیلنا۔''

''میں تو کھیلوں گی۔'' وہ من ہی من ضد کرتی۔

بڑے بھیا کو تو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا تھا اس کا ندی پر جانا۔ اس کے کان اینٹھے جاتے لیکن وہ مانتی کب تھی۔ اس کا کان کئی کئی دنوں تک ٹس ٹس دکھتا رہتا لیکن وہ وہی پر تھا، وہی اور ندی کی چھپر چھپر وہی۔

اماں نے ہمیشہ لڑکی ہونا سکھایا بڑے گھر کی۔ وہ سمجھ نہیں پاتی، لڑکی ہونا کیا ہوتا ہے؟ لیکن گھر سچ مچ بڑا تھا۔ سولہ کمرے تھے۔ بڑا سا آنگن تھا اور اس میں ڈھیر ساری دھوپ تھی۔ بڑا سا دالان جس میں بڑے بابو ہمیشہ مجمع لگائے رہتے۔ گرام وکاس سمیتی کے مکھیا (صدر) تھے بڑے بابو۔ مکھیا جی۔ ''جواہر روزگار یوجنا'' اور ''سماجک سہاتا یوجنا'' کی باتیں ہوتی رہتی تھیں دالان میں۔ چوسر بچھا ہوتا تھا اور بہاری حقے کی آگ کو تاڑ کے پنکھے سے جھل جھل کر سلگاتا رہتا تھا۔ دالان کے آگے ایک طرف گوشالہ تھی جہاں سیمنٹ کی بنی ناد پر گائے، بھینس اور بیل بندھے ہوتے تھے اور بالکل پھاٹک کے پاس ہرن کے چھوٹے چھوٹے دو بچے کان کھڑا کیے ہمکنے کے لیے بے چین رہا کرتے تھے۔ وہ ان کا گھر تھا۔ میرا گھر؟ چھوتی تی تی تا۔ پچھلی بار جب گاؤں میں ''اندرا آواس'' کے مکان بن رہے تھے، بی ڈی او صاحب آئے ہوئے تھے۔ بڑے بابو کے نہ چاہتے ہوئے بھی ہرن کے بچوں کو اٹھا لے گئے تھے۔ ان کا گھر بدل گیا تھا۔

اندر زنانہ قطعہ۔ صرف اماں اور وہ۔ اور تھا ہی کون؟ لگتا ہی نہیں گاؤں کا پریوار ہے۔ لیکن گاؤں کا پریوار بھی صرف بڑے بابو کی پرانی باتوں میں دیکھنے کے لیے ملتا تھا۔ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ لوگوں کا پریوار۔ عورتیں آٹا گوندھنے اور روٹی سینکنے بیٹھتی تھیں تو

بانہیں چڑھ جاتی تھیں۔ بہتوں کے یہاں تو روٹی بنتی ہی نہیں تھی۔ دس سیر اتسلے میں چاول کھدکتا تھا۔ لیکن اب گھر گھر میں روٹی بننے لگی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پتیلی میں آرام سے گوندھا جاتا ہے آٹا لیکن بڑے بابو کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ چار جنوں سے اوپر بڑھا ہی نہیں پریوار۔ بڑے بابو اِکلوتے تھے۔ بابا آئی کے گزرنے کے بعد وہ اور اُن کے بدن سے دو اور ایک تین ۔اتنا بڑا گھر بھائیں بھائیں۔ بھائیوں کی شادی ہوئی تو خوب خوب رونق بڑھی۔ پورا گھر رنگا پتا کر دلہن بن گیا۔ بنیہاروں میں دھوتی ساڑی بٹی اور پوری رات ڈوم کچ ہوا۔ خوب مزہ آیا۔ ہائے ہلا پسند نہیں تھا بڑے بابو کو، لیکن اماں نے ان کی ایک نہ سنی۔ ایک ایک کور کسر نکالی جی بھر کر۔ کہیں سوتیلی نہ کہہ دے کوئی۔

جب ماں مری تھی وہ تین سال کی تھی اور بڑے بھیا پانچ کے آس پاس۔ اماں آئیں تو چھوٹکا بھیا آیا۔ کیسا تھا لال لال۔ چھوٹی چھوٹی بھینچی آنکھیں۔ دیکھنے میں سرکنڈے جیسا لخ لخ۔ بچپن میں ہی اس کا سر ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ پہلا بچہ، اماں بھی اناڑی تھیں۔ کنواری آئی تھیں۔ خود تو سنبھلتی نہ تھیں بچہ کیا سنبھلتا۔ زیادہ تر سوتا رہتا۔ ایک کروٹ۔ بس ایک طرف سے پچک کر سر ٹیڑھا ہو گیا۔ جوان ہوا تو ایک دم گبرو نکلا۔ بڑے بھیا بھی اس کے سامنے ہیچ۔ "یہ بڑے بھیا کا حصہ..... یہ بڑے بابو کا حصہ...اور...اور یہ چندا ماما کا حصہ....." اماں نوالوں کا حصہ لگا کر کھلاتیں۔

جوان تو وہ بھی ہوئی تھی۔ پہلے پہل جب شلوار گندی ہوئی تھی، اماں نے پرانی ساڑھی پھاڑ کر کئی تہہ کر کے اس کے اندر لنگوٹے کی طرح کس کر باندھ دیا تھا۔ بڑا پراسرار تھا سب کچھ۔ جانے کیسے سن لیا تھا اس نے اماں کو بڑے بابو سے کہتے ہوئے۔ "اب اس کی شادی بیاہ کی چنتا کرو..." چھوتی تی تا....تی تی تی تی تا...یہ گھر.....

بڑے بابو نے کہا تھا۔ "پہلے گھر میں گھر کرنی آ جائیں، پھر میاں کو وداع کریں گے

لیکن اماں تنکا تنکا جمع کرنے لگی تھیں اسی دن سے۔ تب اس کا بناس پر جانا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ بہت ضد بھی کی اس نے۔ صرف ایک بار جانے دو بناس پر۔ ایک بار بھی نہیں جا سکی تھی۔ لیکن اس نے اتنا پوچھا تھا، اماں لڑکی ہونا کیا ہوتا ہے؟ اماں کو جواب ہی نہیں ملا تھا۔ دیر تک سوچتی رہی تھیں۔ پھر جیسے کھوئی کھوئی بولی تھیں... ''جیسے دھرتی...'' اوراب چاہ کر بھی وہ ضد نہیں کر سکتی۔ نہیں جا سکتی بناس پر۔ بوند بوند کچھ بھرنے لگا تھا اس کے اندر۔

کچھ ہی دنوں میں سب کچھ بدل گیا۔ پر تھا گاؤں چھوڑ کر آرہ چلا گیا۔ پر تھا ہی کیا گاؤں کے بہت سارے لوگ آرہ چلے گئے۔ کچھ تو وہیں بس گئے اور کچھ ادھر ادھر مزدوری کرنے لگے اور جو بچے ہیں....

ایک دم کاٹھ مار گیا مجری کو۔ جلدی سے جھک کر ریلنگ کے نیچے ہو گئی۔ آنکھیں نکال کر باہر دیکھنے لگی۔ دکھن ٹولہ کی خلیج میں پرچھائیاں کانپ رہی ہیں۔ اندر ہی اندر کانپنے لگی وہ بھی۔ دھک دھک اتنی تیز کہ دل چھاتی پھاڑ کر باہر آ نکلے۔ آنکھوں کو پھیلا کر صاف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک دو تین پانچ، کئی کئی سانس حلق میں کہیں پھنسی رہی تھی۔ پگڈنڈی پر ان کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ رینگتی ہوئی پرچھائیاں ایک ایک کر پگڈنڈی پر آئیں تو اُس کی جان میں جان آئی۔ ''وہ نہیں تھے۔'' دکھن ٹولہ کی عورتیں 'فراغت' کے لیے نکلی تھیں۔ دھم سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ جیسے کئی بار سیڑھیوں پر چڑھی اتری ہو، زور زور سے سانس لینے لگی۔

آسمان تھوڑا صاف ہوا تھا۔ پیپل دکھ رہا تھا اور بناس کی دھار بھی۔ پھر اندر بوند بوند کچھ... پورا منہ کھول دیتی ہے جیسے پوری صبح اتار لے گی اپنے اندر۔ بناس پی جائے گی پوری کی پوری۔ شمال جانب چھٹی گھاٹ اور جنوب کی طرف مشان گھاٹ۔ ہلکا ہلکا دکھائی پڑ رہا تھا۔ درمیان میں اس طرف جانے کے لیے بانس کا چانچر۔ پیپل کی ایک شاخ جھک کر پانی میں ڈوب گئی ہے۔ جس کی آواز سے خوفناک ڈر پیدا ہو رہا تھا۔ اس طرف ٹیلے کے اوپر پولیس

کی کیمپ۔ سناٹا ہے وہاں۔ کیمپ کے اندر لالٹین کی دھیمی بتی جل رہی تھی ابھی۔ نیچے سوروں کے چھوٹے چھوٹے کھوباڑ۔ ان سے لگی درجنوں جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کا سلسلہ۔ دھوئیں میں لپٹی ہوئی دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں جھونپڑیاں اور لرز رہا تھا وقت....

بناسی ٹولا۔

''لڑ یکے لڑائی اور پائی نا جھگروا ای ،بیٹھی کے لنا پھر پائی ہو سنگھتیا۔

بھئیلے مسنوا انگوا سنگھتیا۔''

اس طرف املی کے درخت کے نیچے بہاری مسہرالاپ رہا تھا۔ پاگل۔ دو ہی تو پاگل ہوئے گاؤں میں۔ ایک یہ دوسرے کوی چاچا۔ کوی راجہ رام پر یہ درشی۔ لمبا قد، اکہرا بدن، الجھی الجھی داڑھی اور سر کے بال۔ آنکھیں چھوٹی ،ٹھہری اور سوچتی ہوئی۔ شاہ پور کے ٹھاکر کے یہاں اس کا رشتہ لگایا تھا انہوں نے۔ لڑکا آرہ مہاراجہ کالج میں وکالت پڑھ رہا تھا اور اس اکیلے پر بیس بیگھے کی جوت تھی۔

''اماں میں بھی لپیٹوں...؟''

''تیرا بیاہ....۔''

چھوتی تی تا....۔''

بڑے بابو کلف لگی اڈّھی کی کھر کھراتی دھوتی اور کرتا پہن کر کوی چاچا کے ساتھ جیپ میں چیوڑا اور گنے کا نیا گڑ لے کر دن تاریخ پکی کرنے گئے تھے۔ واپسی میں گاؤں کی سرحد پر کسی نے ایک چٹھی پکڑا دی تھی۔ گھر پہنچے تو کسی سے کچھ نہیں بولے۔ کوی چاچا کے ساتھ دونوں بھائیوں کو لے کو چھت کے اوپر چلے گئے۔ اماں کو بھی پاس نہیں بلایا۔ اماں بڑے بابو کے مزاج سے واقف تھیں اچھی طرح۔ آدرش وادی، اصول اور آدرش کی خاطر نہ کہیں جھکے اور نہ کبھی ٹوٹے۔ 74ء میں جیل گئے تو جے پی کے آدرشوں کی گرہ ہی باندھ لی۔

وہ بندھی تو بجر جیسی، آج تک نہ کھلی۔ اسی بڑے بابو کے چہرے پر پسری ہوئی ضد دیکھ کر خیر منا رہی تھیں، اماں من ہی من، ضرور کچھ برا ہوا ہے۔ ’نگدی اگدی‘ کو لے کر بات اٹکی ہوگی اور انہوں نے انکار کر دیا ہوگا۔ لڑکا سستے میں کہاں ملتا ہے؟ لاکھ کا تلک چڑھاؤ، ہزاروں کا سروسامان دو، تب کہیں بیٹی کی مانگ میں سندور بھرتا ہے۔ کیسی ہوتی ہیں بیٹیاں بھی۔ چھی!!! لیکن لڑکا اچھا تھا اور کھاتا پیتا بھی تھا۔ آج کے زمانے میں کسی اکیلے کی دس بیس بیگھے کی جوت ہوتی ہے کیا؟ نا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اب پہلے جیسا وقت بھی تو نہیں رہا۔

نہیں رہا گیا اماں سے۔ سیڑھیوں پر جا کر اُن کی باتیں سننے لگیں، ان کے پیچھے پیچھے وہ بھی۔ سن کر ششدر رہ گئیں۔ نہیں سنبھلتیں تو بھربھرا کر سیڑھیوں پر گر جاتیں۔ ’’دستہ‘‘ نے چٹھی بھجوائی تھی۔ پچیس ہزار نقد اور چاول کے دس بورے چندہ دینے کے لیے کہا تھا۔ دستہ؟ اس گاؤں میں تو کوئی ’’دستہ‘‘ یا ’’سینا‘‘ وینا نہیں تھی اور نہ ہی کسی طرح کی مرمجوری کا جھگڑا۔ کسان یہیں کے اور مزدور بھی یہیں کے۔ بڑے بابو نے خود کتنوں کو اپنی زمین میں بسایا تھا اور کچھ پورب کی طرف جدھر سے سڑک گاؤں میں داخل ہوتی ہے اس کے کنارے لبسے ہوئے تھے۔ کبھی کچھ بھی تو نہیں ہوا یہاں۔ البتہ قرب وجوار کے گاؤں میں....

کوی چاچا کی سوچتی ہوئی آنکھیں سنجیدہ تھیں... ’’بچالو مکھیا جی... اس گاؤں کو بچا لو....‘‘ شاید کوئی بیماری تھی۔ اتنا ہی بولتے بولتے کوی چاچا کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں اور آنکھیں لت پت ہوگئی تھیں۔ اماں جلدی سے گلاس میں پانی لے آئیں۔ ایک ہی سانس میں غٹ غٹ۔ ’’تم کیوں آئیں یہاں؟‘‘ بڑے بابو نے گھور کر دیکھا اماں کو۔ اماں پاس ہی کھڑی ہوگئیں، ڈر اور ضد میں جیسے۔ ’’صرف سبقت... دیدو چندہ... اور بندوقیں آئیں گی اور لاشیں گریں گی....‘‘ چپ ہو گئے۔ اماں سے اور پانی مانگا۔ اماں گئیں آئیں۔ خلا میں دیکھ رہے تھے کوی چاچا۔ ’’بندوق کی اپنی مجبوری ہوتی ہے۔ سب کچھ اسی کے ذریعے

طے ہونے لگتا ہے۔ مقصد پیچھے کسی اندھیرے گڈھے میں پڑ جاتا ہے، غیر اہم ہو جاتا ہے۔ کھیتی کرنے والے مزدوروں کے حق اور دلتوں کے سمان کے نام پر شروع ہو کر پورے ملک میں انقلاب لانے کے عظیم مقصد کے تحت شروع ہوا یہ آندولن آج کہاں پہنچ گیا ہے...؟

نہیں نہیں مکھیا جی، اسے کلاس اسٹرگل نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں تو ذات اہم ہو گئی ہے... کاسٹ اسٹرگل... نہیں، کاسٹ وار..." بڑے بابو بے چینی میں ٹہل رہے تھے۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا کوی چاچا کو۔ بول رہے تھے اور جانے کتنا کچھ اور بولنا چاہتے تھے۔ "سامنت واد؟ جسے اس نسل نے دیکھا ہی نہیں۔ جس کے قلعے مسمار ہوئے زمانہ بیت گیا۔ کھنڈر رہ گیا ہے باقی۔ زمین بوس، دھول چاٹتا ہوا۔ صرف دکھنے کی چاہ اور للک....

تم اسے مانو مکھیا جی، یہ سب ووٹ کی سیاست ہے۔ کچی عمر میں سماج کو اس کی جگہ سے آگے لے جانے کی کوشش آندولن کو الٹی سمت دے گی ہی۔ بندوق اور ووٹ، کوڑھ میں کھاج ہو جائے، زخم ناسور بنے گا ہی بنے گا نا۔ کتنا عجیب ہے اور کیسا المیہ؟ جتنا ہے اس سے زیادہ، جیسا ہے اس سے الگ، جانتے ہیں لوگ اس لڑائی کو...." چارپائی پر سر جھکائے الغم بلغم گراتے رہے کوی چاچا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کوی چاچا کی باتیں اکثر سمجھ میں نہیں آتیں۔ بڑے بابو کی سمجھ میں کچھ آیا ہو تو آیا ہو شاید۔

سورج کی پہلی کرن مجری پر پڑی ہے۔ بڑے بھیا کی فصل کٹ چکی ہے۔ بتاس بہہ رہی ہے۔ پیپل ہری ہری پتیوں سے لدا دکھ رہا ہے۔ نیچے جانے کی طبیعت نہیں ہوتی۔ کافی اندر تک امس بھر گئی تھی اس میں۔

بڑے بابو اجتماعی طور پر جینے اور سوچنے کے عادی تھے۔ یہ مسئلہ ان کا ہوتے ہوئے بھی گاؤں کا مسئلہ تھا اور اس کا حل بھی ممکنہ طور پر گاؤں کے پاس ہی تھا۔ لیکن کتنی مایوسی ہوئی تھی پنچایت میں بڑے بابو کو۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا جیسے۔ کسی کی زبان نہیں ہلی تھی۔ پہلی

بار لگا تھا، اعتماد کا قتل ہو گیا ہے، بے اعتمادی پھیل گئی ہے۔

اس دن کے بعد عجیب تبدیلی آئی گاؤں میں۔ گھنٹوں ساتھ بیٹھ کر شیوئیشر رائے اور لوچن کہار کا تاش کھیلنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ خوف اور اندیشہ کسی چھوت کی بیماری کی طرح پھیل گیا تھا پورے گاؤں میں۔ اب رانا جی کے دروازے پر رات رات تک محفلیں نہیں لگتی تھیں اور نہ ہی تڑ بنے میں تاڑی پینے والوں کا جم گھٹ لگتا تھا۔ طوفانی درزی، جس کے متعلق عام تھا کہ اس کے ریڈیو میں صرف گانا ہی گانا ہے اور کچھ نہیں۔ وودھ بھارتی ہو یا شیلانگ، صبح ہو، دوپہر ہو یا شام ہو، اس کے دو بینڈ کے ریڈیو میں صرف گانا ہی گانا بجتا تھا اور جو چھ وولٹ کی بیٹری چارج کرا کر صرف دوسروں کو سنانے کے لیے فل ساؤنڈ کیے رہتا تھا، اس کے ریڈیو نے گانا، گانا بند کر دیا تھا۔ سب مشکوک، دہشت زدہ، اجنبی اجنبی چہرہ لیے اپنے ہی خول میں سمٹ گئے تھے۔ لیکن بڑے بابو... جانے کیسے تھے بڑے بابو۔ انکار کر دیا تھا انہوں نے چندہ دینے سے۔ جرم کر دیا تھا بڑے بابو نے۔ فیصلہ تو ہونا ہی تھا۔ دستہ نے لگائی 'جن عدالت' آخری صف میں بیٹھنے والے جلسے کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ آرتھک ناکہ بندی لگا دی گئی تھی بڑے بابو پر۔ ''مکھیا جی کے کھیتوں میں کوئی کام نہیں کرے گا۔'' حکم صادر فرما دیا گیا تھا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا، احتجاج کی کوئی آواز نہیں۔ کسی کے اندر کوئی بے چینی نہیں۔ صرف بہاری نے کہا۔ ''ہمنی کے کام نا کرب تہ کھائب کا...؟'' یہ اس کا اپنا مسئلہ تھا اور اس جیسوں کے ایسے مسئلوں پر غور و فکر کرنا کہیں سے شامل نہیں تھا ان عدالتوں کے آئین و قانون میں۔

تھکے تھکے لوٹ آئے تھے بڑے بابو۔

گاؤں کے لہلہا رہے کھیتوں کے درمیان بڑے بابو کا کھیت خالی رہ گیا تھا۔ ہری مخملی چادر پر ٹاٹ کے پیوند جیسا۔ میڈھ پر کھڑے سونی آنکھوں سے دیکھتے رہتے تھے بڑے بابو

۔ بنیہار کام کی تلاش میں ادھر ادھر نکلنے لگے تھے۔ پرتھا بھی آرہ جا کر رکشا چلانے لگا تھا۔ بہاری رہ گیا تھا بلکہ وہ جا ہی نہیں سکا تھا کہیں۔

بڑے بھیا غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ چھوٹا بھائی چندہ دے دینے کے حق میں اپنی دلیلیں دے رہا تھا۔ ''پچیس ہزار کی تو بات تھی... یہ سب تو نہیں ہوتا۔''

حیران رہ گئے تھے بڑے بابو۔ پوری رات سوئے نہیں تھے۔ اٹھ اٹھ کر دیکھتی رہی تھی انہیں وہ۔ آرام کرسی پر ٹانگیں سیدھی کیے چھت کو گھورتے رہے تھے پوری رات اور پوری رات وہ کسی انہونی کی غیبی آہٹ سنتی رہی تھی۔ پہاڑ سی پوری رات۔

چھوٹا بھائی رات کو دیر سے لوٹتا۔ اماں تو اماں تھیں۔ کھول دیتی تھیں خود کو دروازے کی طرح۔ ''چل کھانا کھالے۔'' پوچھتی بھی نہ تھیں، کہاں رہتا ہے اتنی اتنی رات تک۔ جب پوچھنا چاہا، دیر ہو چکی تھی۔ گرہن لگ چکا تھا۔ ''مجھے میرا حصہ چاہیے۔'' ماں باپ کے زندہ ہوتے اس نے زمین جائداد میں اپنا حصہ مانگا تھا۔ اماں کے چہرے پر سناٹا پھیل گیا تھا۔ ''یہ بڑے بھائی کا حصہ... یہ بڑے بابو کا حصہ...'' ٹکر ٹکر دیکھتی رہ گئی تھیں بڑے بابو کو۔ پھر کئی کئی رات بڑے بابو آرام کرسی پر ٹانگیں سیدھی کیے چھت کو گھورتے رہے تھے۔ کئی ایک دنوں تک گھر کے کونے کونے سے خاموشی کے سسکنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ بربادی گھر کی دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگ رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوگا؟ نہ جانے کیا ہونے والا ہے؟ جیسے گھر میں کوئی گھس آیا ہے۔ کوئی کچھ چرا رہا تھا۔ دیوار میں بڑی سی نقب لگا دی ہو کسی نے۔ اس کے راستے کسی کے دونوں پیر اندر آئے ہیں۔ ذرا دیر میں پورا کا پورا وہ اندر آجائے گا۔ اسے کوئی پکڑنا چاہے تو نہیں پکڑ سکتا۔ اس کے پورے جسم سے تیل چورہا ہے۔ پکڑتے ہی چھپٹ سے چھٹک جائے گا۔ لاکھ جتن کرو ہاتھ نہیں آئے گا، پھسل جائے گا۔ پھسل گیا تھا سب کچھ۔ بڑے بابو نے خاموشی توڑی تھی۔ دونوں بھائیوں کو ساتھ بیٹھایا تھا ایک دن اور

بانٹ دیا سب کچھ۔ یہ تمہارا اور یہ تمہارا۔ الگ الگ ہو گئی تھی ایک چنے کی دو دال۔ ادھر گھر چھوٹا اور ادھر گاؤں۔ پورب کی طرف جدھر سے سڑک گاؤں میں داخل ہوتی تھی، اس کے کنارے بسی ہوئی جھونپڑیاں ایک ایک کر بناس اس پار جا لگیں اور آباد ہوا بناسی ٹولہ۔

''جتیا کے بتیا میں متیا مرائل کا ہے، سبے لا انیر در گیتا سنکھتیا۔

گنواں کے نواں ہنساؤ جن سنگھتیا۔''

چمپئی دھوپ میں بہاری مسہر کا جسم تانبے جیسا چمک رہا تھا۔ سور باڑے سے نکل کر تازہ ٹٹیوں پر تیزی سے تھوتھنا رگڑ رہے تھے۔ ٹیلے کے اوپر کیمپ کا سپاہی منہ میں داتون پھنسائے ترکاری کاٹنے والی چھری سے بندوق کی نال پر لگی زنگ کھرچ رہا تھا۔ دور تھا لیکن عجیب طرح کی آواز آ رہی تھی مجری کے کانوں تک۔

عجیب آواز تھی۔ گاؤں کے منہ منہ ہوتے گھر تک پہنچی تھی۔ چھوٹکا ''دستہ'' میں چلا گیا۔ نکسلائٹ بن گیا۔ کانوں پر یقین نہیں ہوا تھا۔ بڑے بابو کا وہ سبق جو انہوں نے بکسے پر رکھے لالٹین کی روشنی میں آدھی آدھی رات تک طوطے کی طرح رٹایا تھا، بھول گیا تھا چھوٹکا بھائی۔ اماں چپ۔ بڑے بابو چپ۔ گونگے بہرے گاؤں کے منہ میں اچانک زبان اگ آئی تھی۔ ''کہیے مکھیا جی، گاؤں بچانے کی بات کر رہے تھے آپ؟''

نہیں بچا پائے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بچا پائے تھے بڑے بابو۔ کئی چیزیں ایک ساتھ ٹوٹ گئی تھیں، جس میں ایک بیٹی کا رشتہ بھی تھا۔ چھوتی تی... یہ گھر... گھر اجڑا تھا، بسا کہاں تھا۔ بانس کے کونپل بانس کی کوٹھی میں ہی بوڑھے ہو گئے تھے۔ صرف پھلمی بیاہی گئی تھی۔ وہ بھی آرہ مندر میں جا کر۔ اس سال اس کی باری تھی... تجھے یہ دوں گی... تجھے وہ دوں گی... تنکا تنکا جمع کرنے والی اماں کی آنکھیں رو بھی نہ سکی تھیں۔ البتہ بڑے بابو کی آنکھیں خوب روئی تھیں۔ رو کر ایک دم ہلکا ہو گئے تھے بڑے بابو۔ اتنا کہ اس کا اندازہ اُن کی ارتھی کو کندھا

دینے والوں کو بھی ضرور ہوا ہوگا۔

بڑے بابو نہیں رہے۔ تھے بھی، تو نہیں ہی تھے۔ لیکن ان کا ہونا صرف، کچھ نہ کچھ تو تھا ہی۔ جب بالکل ہی نہیں رہے تو جو کچھ تھا وہ بھی نہیں رہا۔

جنوب جانب شمشان گھاٹ۔ بناسی ٹولہ سے چند گز کی دوری۔ سب کو پتا تھا، اس پار ہیبر کی جھلاس اور اس پار بناس کے ارار پر ہر وقت مور چہ لگا رہتا ہے۔ بندوقیں تنی ہوتی ہیں۔ پتا کھڑکا، ہوا سرسرائی، دونوں طرف سے دھائیں دھائیں۔ ادھر جانے کی ہمت کسی کی نہ ہوسکی۔ بڑے بابو کی چتا کو آگ گاؤں سے لگے کھیت میں دی گئی۔ پہاڑ ایسا شریر مٹھی بھر راکھ بن کر مٹی میں مل گیا۔ ایک جگہ خالی ہوگئی۔ کسی کا ہونا یا نہ ہونا کس طرح اثر پذیر ہوتا ہے، یہ منظر ابھرا جب چھوٹے بھائی نے ایک بار پھر راگ چھیڑا..."حصہ پھر سے لگے گا۔ مجھے بنجر زمین ملی ہے۔" بڑے بابو کہا کرتے تھے...."عمل ایک حد کو پار کر جانے کے بعد ردعمل کو جنم دیتا ہے جو زیادہ بے رحم ہوتا ہے۔"

"تجھے اب ایک دھور زمین نہیں ملے گی۔" بڑے بھیا...بڑے بھیا، سینا میں چلے گئے تھے۔

سولہ کمروں کے درمیان دیوار کی سرحد کھڑی کر دی گئی تھی۔ ناد پر بندھی گائے، بھینس کی طرح بانٹ دی گئی تھیں اماں اور وہ۔ ایک اس کھونٹے، ایک اس کھونٹے، اماں چھوٹے بھائی کے حصے لگیں اور وہ بڑے بھائی کے حصے۔ وہاں پہلے سے ہی بھابھیاں ایک ایک کھونٹے بندھی ہوئی تھیں۔ ان کی صورت حال اور بھی مختلف تھی شاید۔

بڑے بابو یاد آرہے ہیں اور یاد آرہی ہیں ان کی باتیں۔ عمل ایک حد کو پار کر جانے کے بعد ردعمل کو.....

بناسی ٹولہ کو لاشوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ تم ایک تو ہم دس۔ "سینا" نے بڑے فخر کے

ساتھ اس واقعے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ پورے اکیس لوگ۔ نصف سے زیادہ عورتیں۔ بہادروں نے شیر خوار بچے تک کو.....

''دستیہے میں خونوا کچو نوابہاوَ جنی، ماٹی میں ملاوَ جنی جنگیا سنگھتیا۔

کُفتے میں بہریلا چھتیا سنگھتیا۔''

اپنے پریوار میں بہاری بچ گیا تھا۔ بچا کہاں تھا، پاگل ہو گیا تھا۔ دن دوپہریا املی کے پیڑ کے نیچے پڑا رہتا۔ کوی چاچا، جن کے گیت گاتا تھا بہاری مسہر، زار و قطار روتے۔ باڑھی گرام میں نوسینا حمایتوں کا قتل، گاؤں کے کھیتوں میں دھان کے بچڑوں کی بے رحمی سے روندائی، سانجھ سویرے نکلنے والی بہو بیٹیوں پر چھینٹا کشی۔ ایک طرف دہشت گردی، ایک طرف غم وغصہ۔

کوی چاچا کے دماغ میں بے اطمینانی کی گھنٹی بج رہی تھی۔ انہوں نے انتظامیہ کو اطلاع کی تھی لیکن انتظامیہ، اس کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ''کیا کیا جائے؟ فورس کی کمی ہے اور ویسے ہتھیار بھی نہیں۔''

کچھ نہیں کیا گیا اس وقت، بعد میں قافلہ پہنچا۔ اخبار میں بیان اور چناؤ کے لیے مدعا ہاتھ آیا۔ نیتاؤں نے بھاشنوں کی برسات کی، منتریوں نے اعلانات کیے۔ بناسی ٹولہ جل تھل ہو گیا۔ کچھ تیرنے لگے، کچھ غوطہ لگانے لگے۔ ''نیتا کے.....اب سب آوترن...کال تک کونو پوچھے والا نا رہے...(نیتا کے...اب سب آ رہا ہے...کل تک کوئی پوچھنے والا نہیں تھا) نفرت اور غصہ۔ اخبار والوں نے فوٹو کھینچے۔ ''رویئے نا...نہیں نہیں، ایسے نہیں.....ذرا سینہ پیٹ پیٹ کر۔ ہاں پلیز ویپ، کلیک۔'' راتوں رات بناسی ٹولہ دنیا جہان میں مشہور ہو گیا۔

غریبوں کے ایک مسیحا نے نعرہ دیا۔ ''خون کے بدلے خون۔'' کسی نے نہیں کہا، اب اور نہیں۔ سب آئے اور گئے۔ کرمچ کے کپڑوں اور بھاری بوٹوں والے گاؤں گاؤں

سونگھتے پھرے۔ گھر گھر چھانا پھٹکا، برہنہ کیا اونچی ذات کی عورتوں کو، بے رحمی سے پیٹا۔ ''بول تیرا بھتار کہاں ہے؟'' کئی کئی گاؤں کی مسہر ٹولیاں حاملہ ہوگئیں۔ ایک آندھی آئی اور گئی۔ نتیجہ؟ بے قصور پکڑے گئے قصوروار چہرہ بدل کر گھومتے رہے۔ کچھ کو آرہ شہر نگل گیا، کچھ سون ندی کی تلہٹی میں سما گئے۔ بھابھی کو میکے پہنچا کر بڑے بھیا نے تو پہلے ہی گھر چھوڑ دیا تھا۔ کندھے پر لوہا اٹھائے کبھی اس گاؤں، کبھی اس گاؤں۔ پورے گرام پنچایت کا بھار تھا ان پر۔ جس گھر میں رات ہوتی، گھر والا باہر سوتا اور وہ اندر.... ''بھیا... بھیا۔ آپ کی بھی ایک بہن ہے بھیا۔''

نہیں جانتی، یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ سنتی تھی، طبقاتی سنگھرش ہے۔ وچار دھارا کی لڑائی ہے۔ تبدیلی نظام کی تحریک ہے۔ سیاست کا کھیل ہے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور برتری حاصل کرنے کی جنگ ہے۔ باپ رے باپ۔ اسے کیا معلوم، اتنی بڑی بڑی باتیں۔ اگر اُن بڑی باتوں کا مطلب یہ لاشیں ہیں تو اسے نہیں جاننا ان باتوں کو۔ وہ تو بس اتنا جانتی ہے، خواندگی مہم میں گھر گھر حرف کی جیوتی جلانے والی مدھو جس کا اس کے پتا کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا اور جسے ذات کی بنیاد پر ''دستہ حمایتی'' قرار دے کر پولیس نے اپنے فریضے سے منھ موڑ لیا تھا۔ اس مدھو کا کسی دستہ یا سینا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ڈومن بہو، جس کی قتل عام کے دوران فرج میں گولی ماردی گئی تھی، وچار دھارا لفظ کے معنی نہیں جانتی ہوگی، بھیکھنا کے دو ماہ کا شیر خوار بچہ جس نے ماں کی چھاتی سے ابھی منہ بھی نہیں ہٹایا تھا اور جسے بھالے کی نوک پر ٹانگ دیا گیا تھا، طبقاتی جدوجہد یا کسی تبدیلی نظام کے آندولن میں شامل نہیں رہا ہوگا۔ پھر کیوں، کیوں....؟

جیسے ہوا میں تیزاب گھل گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بڑے بابو، کہاں چلے گئے آپ؟ بڑے بابو یاد آ رہے ہیں.... ''کسی ایک انسان کا قتل، اس میں چھپے

بے شمار امکانات کا قتل ہے۔'' لیکن یہاں تو چھوٹا بھائی اکیس کے بدلے اکیاون طے کرنے میں مصروف تھا۔گاؤں گاؤں دستہ کی نشستیں ہو رہی تھیں، اور آج کی رات....

.....جانے کہاں سے آئے تھے یہ لوگ۔ یہاں کے نہیں تھے۔ پورے گاؤں کی گھیرا بندی کی گئی تھی۔ پوری رات کاٹی گئی تھی بڑے بھیا کی فصل، پوری رات جنگوؤں کی طرح بھک بھک بتیاں جلی تھیں اور پوری رات رو کے رہی تھی وہ اپنی سانس۔

دھوپ تیز ہو گئی ہے۔لہرانے لگا تھا مجری کا جسم۔کھیتوں سے نظریں ہٹا کر دور سڑک کی جانب دیکھنے لگی۔آٹھ بجیا بس آکر رکی ہے۔گاؤں کا کوئی اترا ہے۔اٹیچی نیچے رکھ کر بالوں میں کنگھی کرتا ہے۔بیل باٹم اور چھاپے کا کرتا۔آنکھوں پر کالا چشمہ۔اٹیچی سر پر اٹھا کر گاؤں کی طرف چلنے لگتا ہے۔قریب آتا ہے تو دیکھتی ہے مجری اور پہچان جاتی ہے۔پرتھا؟ ارے یہ تو ایک دم شہری بابو بن گیا۔

''جانتے ہو پیپل میں سوت کیوں لپیٹتی ہیں؟''

مچل اٹھی من ہی من۔''میں چلی'' اس کے اندر سے وہ نکلی اور سیڑھیاں پھلانگتی چوکھٹ سے باہر۔وہ بناس میں اور بناس اس میں۔

پرتھا گاؤں کی طرف آنے کے بجائے بناسی ٹولہ کی طرف مڑ گیا۔''ارے ارے ادھر کیوں نہیں آرہا۔'' شانت پڑ گئی مجری۔ ہاں ادھر کیوں آئے گا؟ اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر کہاں کوئی آتا جاتا ہے۔گاؤں کی گلیاں سنسان رہتی ہیں۔ کتنے ہی گھروں میں تالے لٹک رہے ہیں۔اب کوئی پیپل میں سوت لپیٹنے بھی نہیں جاتا۔

بچپن میں پوچھتی رہ گئی اماں سے...''اماں بتاؤ نا، کیوں لپیٹتی ہیں پیپل میں سوت؟'' اماں نے بتایا ہی نہیں۔ ہمیشہ ایک ہی جواب۔''تو کیا کرے گی جان کر۔'' آج تک یہ سوال بنا جواب کے ہی رہ گیا جیسے اپنے آپ میں بنا جواب کے رہ گیا تھا یہ سوال کہ لڑکی ہونا

کیا ہوتا ہے؟

''اماں میں بناس پر جاؤں؟''

''نہیں تو لڑکی ذات ہے۔ جیسے ...جیسے دھرتی ....دھرتی صرف سنتی ہے۔ دھرتی صرف دیکھتی ہے۔ دھرتی چپ رہتی ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہے۔ دھرتی صرف سہتی ہے۔'' بنا جواب کے ہی تو تھا اماں کا یہ جواب۔

گویا نیند میں چلنے لگی وہ۔ سیڑھیوں سے نیچے آئی۔ جیسے اماں کہہ رہی تھیں، دھرتی کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، اس نے پاؤں چوکھٹ سے باہر نکالا۔ بیچ کی دیوار کا حصہ طے کر کے دوسری طرف چھوٹکا بھائی کے گھر پہنچی۔ اماں نے دیکھا تو پیلی پڑ گئیں۔ لرزنے لگی سوکھے پتے کی طرح چھوٹکی بھابھی۔ جلدی سے کواڑ اڑھکایا۔

''اماں، پیپل میں سوت کیوں لپیٹتی تھیں؟'' اماں نے منہ میں آنچل ٹھونس لیا۔

''بھابھی، اب پیپل میں سوت لپیٹنے کیوں نہیں جاتیں؟ کیا آپ کو اپنے پتی کی لمبی عمر نہیں چاہیے؟''

اس نے کواڑ کے دونوں پٹ کھول دیے۔

گھر گھومن چاچی، کملا کی عمر بیت رہی ہے۔ اس کا بیاہ کب ہوگا؟ تمہارے بچے اسکول نہیں جا پا رہے ہیں مونا کو بھوجی۔ ان کا مستقبل کیسے بنے گا؟ تمہارے کھیت بوئے نہیں جا رہے ہے۔ اناج کا ایک دانا نہیں۔ دھرم کرم کیسے چلے گا بھاگ منی کا کی؟

اس گھر سے اس گھر۔ تھک کر چور ہو گئی تھی مجری۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں چھلچھلا آئی تھیں اور آنکھیں موندی جا رہی تھیں۔ غروب ہو رہے سورج کی رفتہ رفتہ زائل ہوتی سرخی شام کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی تھی۔ مجری کو فکر ہوئی۔ ابھی اسے بناسی ٹولہ جانا تھا۔ اوپر سے ٹھہری کی ٹیہہ ٹیہہ۔ نہ جانے کیوں، کب سے بولے جا رہی ہے؟ اماں ہوتیں تو خوب

خوب گالیاں دیتیں۔ ''رانڈی، نا جانے اب کس کو نگلے گی؟'' اس نے زور لگا کر بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔ اس نے محسوس کیا، اسے کافی قوت لگانی پڑی ہے۔ اب انہیں کھول رکھنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر سنسان گلیوں اور بند ہو چکے دروازوں کو دیکھا۔ آدم زاد کا سایہ تک نہیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں گلیوں میں کھڑی ہے جہاں اس کا پورا بچپن گزرا ہے اور جہاں بسنت نے پہلی بار دوشیزگی کی کنڈی کھٹکھٹائی تھی۔ توے کی کالک کی مانند اندھیرا گھپ ہوتا جا رہا تھا اور ہوا سائیں سائیں کرنے لگی تھی۔ اس کی رفتار میں قدرے تیزی آ گئی۔ ڈھن ٹولہ کی خلیج میں آئی تو اندر تک سہر گئی۔ لگا ریڑھ کی ہڈیوں کے راستے اچانک کچھ اوپر تک چڑھ گیا ہو جیسے ڈر۔ کشمکش کی حالت میں کھڑی رہی کچھ دیر۔ بناسی ٹولہ دکھائی دے رہا تھا۔ اوبڑ کھابڑ ٹیلوں کی مانند۔ اندھیرے میں اور اندھیرا۔ عجیب سا۔ اندر سے کسی نے روکا... ''مت جا اُدھر۔'' ضد سے بھر گئی... ''جاؤں گی۔'' اور بناس کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، ذرا دیر قبل پہاڑ سے بھاری ہو رہے اس کے پاؤں میں غیر معمولی تیزی آ گئی تھی۔ چاپخر تک پہنچی تو خود بہ خود اس کے پاؤں رک گئے۔ بناس کل کل بہہ رہی تھی۔ اندر کی گانٹھ بھر سے کھل گئی۔ ہری ہو گئی ایک دم سے وہ۔ خواہش ہوئی، سما جائے پانی میں۔ بھگودے پر تھا کو۔ کلوٹا... کئی کئی دنوں پر نہاتا۔ پھر کچھ سوچ گہری سانس خارج کر، سامنے دیکھنے لگی۔ ہیہر کا جنگل۔ جنگل میں... سانس رک سی گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کوئی نہیں، کئی لوگ۔ کاٹھ بنی کھڑی رہی۔ ٹکٹکی لگائے ٹوہتی رہی۔ کچھ دیر گزر گئی تو من نے کہا، وہم ہے۔ من کو ٹٹولنے لگی۔ سچ مچ لگا، وہاں کوئی نہیں، مٹی کا تودہ ہے یا پھر اندھیرے کا گولا۔ من کو ذرا اطمینان ہوا۔ ہمت یکجا کر کے آگے بڑھی۔ چند قدم۔ پھر رک گئی۔ اس بار وہم نہیں ہو سکتا۔ اس نے من کو لعنت ملامت کیا۔ پیچھے سے بالکل صاف آواز آئی ہے۔ کچھ لوگوں کی پھسپھساہٹ۔ جسم بے

حرکت ۔ گردن گھما کر اس نے پیچھے دیکھا ۔ او بڑکھا بڑ ارار کے علاوہ یہاں سے وہاں تک سناٹا دکھائی پڑ رہا تھا ۔ بڑے بابو.... بڑے بابو.... بڑے بابو.... اماں......۔ اس کی خواہش ہوئی، چیخ چیخ کر رونے لگے ۔ تکلیف اتنی شدید کہ رونے کے باوجود آنکھوں سے آنسوں نکل پڑے ۔ سِکنے لگی ۔ بڑے بابو کہاں ہیں آپ؟ اسے لگا، کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہو ۔ جیسے کسی نے کہا ہو.... ''آؤ چلو، میں ہوں تمہارے ساتھ ۔'' اس نے حیرت سے دیکھا ۔ اسے محسوس ہوا، اچانک ایک نئی طرح کی قوت اس کے اندر داخل ہو گئی ہو ۔ وہ آگے بڑھی ۔ اس نے سنبھل کر چانچر پر پاؤں رکھا ۔ چرر....ر....کی آواز دور تک گونجی اور ساتھ ہی ایک دھماکہ ہوا ۔ پیپل کے درخت پر بیٹھے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑے اور آسمان میں کھو گئے ۔

صبح بناس کے بیچ چانچر کے بانس پر مجری اور پرتھا کا جسم جھول رہا تھا ۔

سورج نکل آیا تھا ۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب تک، سورج چڑھنے تک، اس واقعے کی ذمہ داری نہ ''سینا'' نے قبول کی تھی اور نہ ہی ''دستہ'' نے ۔ بھیڑ جمع تھی ۔ اس پار اور اس پار ۔ خاموشی تھی، جھکی ہوئی آنکھیں تھیں اور ایک سوال تھا......!!!!

❀❀❀

ایک اور وہ

اور اس نے بے قابو ہو کر سارے دروازے کھول دیے۔

جب اسے پیاس کی شدت محسوس ہوئی تو اس نے ٹھنڈے پانی کی پوری بوتل حلق میں انڈیل لی اور شاور چلا کر اس کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ اس کے سارے کپڑے بھیگ گئے تو وہ انہیں ایک ایک کر کے جسم سے الگ کرنے لگی اور جب ایک دھاگا بھی نہ بچا تو وہ آئینے کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اسے شروع سے اپنی کمر کا کٹاؤ پسند ہے۔ ایک خاص مرکز سے اس کی مٹی مختصر ہونے لگی ہے اور ایک خاص مرکز سے ایک خاص مقدار میں بڑھنے لگی ہے۔ گویا جس وقت وہ چاک پر چڑھی تھی خمار کی غنودگی میں اس کے خالق کے ہاتھ وہاں کس گئے ہوں گے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے پورے بدن کی رنگت بدلنے لگی ہے۔ اس نے ناف کے نیچے ہاتھ پھیرا تو جیسے نیلا سمندر ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے تڑپ کر پاوش کا ریز را اٹھا لیا اور بڑی بے دردی سے اس انگ کو زخمی کرنے لگی جس نے سمندر پینے کی جستجو کی تھی۔ کچھ لمحہ درد میں تڑپنے کے بعد وہ شانت ہوگئی لیکن اسے لگ رہا تھا، ماہواری کے کپڑے کی طرح اب بھی کوئی چپچپی اور غلیظ شے اس کے اندر کہیں چپکی ہوئی ہے۔

کیا اس نے اسے پوری طرح حاصل کرلیا ہے...؟ شک کے کیڑے کلبلاتے تو وہ بے چین ہو اُٹھتی۔

'وہ' اپنے حریف کے مقابل نہیں آنا چاہتا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے اندر داخل ہوتا۔ ''ہائے سویٹ ہارٹ۔'' ایک عجیب مقناطیسی کشش ہوتی اس کی آواز میں، جیسے کہیں دور گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کی لامتناہی پرواز کا محض ایک پڑاؤ بھر ہے لیکن یہاں ٹھہر کر وہ کس قدر سرشار ہوتی۔ اس کے لمس کی حرارت اس کے جسم کے سنسان جزیرے میں بوند بوند ٹپکتی تو اس کی روح کی سرسبز وادیوں میں دھواں سا اٹھنے لگتا اور اس کے صندلی بدن پر اس کی انگلیوں کے سانپ رینگتے تو وہ بے ساختہ اکڑ جاتی۔ مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے۔ زبان انگار کو چاٹنے سے کب باز رہتی ہے۔ حقیقی لذت کا یہ لمحہ انہیں اسی طرح اپنی گرفت میں لیے لیتا ہے جیسے سجدے میں گرا بندہ صرف اپنے معبود کو اپنے سامنے محسوس کرتا ہے اور اپنے کو سمیٹنے کی کوشش میں اس حد کو پار کر جاتا ہے جہاں اس کی خودی زائل ہو کر رہ جاتی ہے اور منزل کا ایک ایک زینہ بڑے انہماک سے عبور کرتے ہوئے ایک نقطے پر پہنچ کر وہ مرکوز ہو جاتا ہے جہاں دوسرا کچھ نہیں رہ جاتا۔ لیکن اس نقطے کو پانے میں ان دروازوں کا بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانی رنگ محل میں موجود ہیں اور جنہیں بند کر کے ہی اس مقام کو محفوظ کیا جاسکتا ہے اور ایک بھی دروازہ وارہ گیا تو وہ لذت نہیں میسر آنے والی، اور یہی لمحہ سخت امتحان کا لمحہ ہوتا ہے۔ محسوسات کے اس بھنور میں جب وہ غوطے لگاتی تو اسی امتحان سے دوچار ہوتی۔

وہ جائے نماز کی طرح بچھ جاتی تو وہ سجدے میں گر جاتا اور وہ جیسے جیسے ایک ایک دروازے کو مقفل کرتی اسے محسوس ہوتا کہ اس کی منزل کے سامنے سے دھند کا بہ تدریج چھٹتا جا رہا ہو اور آخری دروازہ بند ہونے تک.... عبادت کی اس گھڑی میں اس کی والہانہ سپردگی

جو سفر طے کرتی ہے بظاہر اپنے پیچھے کوئی نشان تو نہیں چھوڑتی مگر جانے کیوں اسے ایک خلا کا احساس ہوتا۔ اس کا سفر مکمل ہوتا ہے یا نہیں، یہ وہ نہیں جانتی۔ اسے صرف اتنا احساس رہتا ہے کہ اس نے سمندر کو جذب کرنے میں کچھ قطرے باقی چھوڑ دیے ہیں۔ پھر اس کی آنکھوں کی مچھلیاں تیرتے تیرتے ڈوبنے لگتیں تو وہ اپنے جسم کو ڈارمیٹری میں بغیر برف کی رکھی لاش سی ڈھیلا چھوڑ دیتی۔

ایلیٹ سوسائٹی کی زندگی کا ایک الگ انداز ہوتا ہے۔ جہاں کچھ بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں فرد کو ذہنی اور جسمانی آزادی میسر ہوتی ہے اور جہاں سب کچھ چلتا ہے لیکن وہاں بھی جینے کے لیے ایک ایک پل جینے کے لیے، ضروری اور غیر ضروری خوشیوں میں حصہ دار بننے کے لیے انسان کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ پاوش کے مطابق جینے کے لیے یہ سب ضروری نہیں ہے۔ لیکن وہ انہیں ضروری سمجھتی ہے اور قدرت کی طرف سے اسے جو کچھ ملا ہے وہ ان کا بھرپور استعمال کرتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا مقناطیسی حسین جسم ہے۔ وہ ان خیالوں سے لڑتی ہے جو اس میں احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ شاید وہ جانتی ہے اس حقیقت کو کہ جس دن اس کے اندر احساس کمتری کے عناصر پیدا ہوئے وہ اس کا لہو چاٹ چاٹ کر اسے کھوکھلا کر دیں گے اور اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ آزاد ذہن سے سوچتی ہے اور خود میں اعتماد بحال کرتی ہے۔ وہ جینا چاہتی ہے ہمیشہ خوبصورت رہ کر اور وہ پوری دنیا کو جوان دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کبھی بوڑھی ہونا نہیں چاہتی۔ اس احساس کی تکمیل کی خاطر وہ ہر کسی سے فراخ دلی سے ملتی ہے۔ ہنستی ہے، بولتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ لیکن ایسے میں بھی وہ اپنا ایک الگ معیارِ حسن رکھتی ہے۔ اس نے مختلف مردوں پر تحقیق کر کے اپنی ایک رائے قائم کر رکھی ہے اور اس کی بنیاد پر ایک فہرست مرتب کر رکھی ہے۔ اس فہرست میں جس مرد کا داخلہ ہوتا ہے اسے ہی وہ اپنا اثاثہ

سمجھتی ہے اور وہ دنیا کی دوسری سبھی عورتوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ بلڈی کیج برڈس.....۔

پاوش اس کا ہم سفر مرد تھا۔ مگر اسے حیرت تھی کہ وہ اس کی فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر میوزک فلور پر کسی دوسرے کی بانہوں میں ہوتی تھی۔ پاوش کے بہت کم ملنے جلنے والے تھے۔ وہ ان کے یہاں کبھی کبھی رات کے کھانے پر جایا کرتا تھا اور کھانے میں ٹومیٹو سوپ اور فرائڈ فش کی فرمائش کیا کرتا تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تو مائکرو بائلوجی اور عیسائی مذہب کی کتابیں پڑھتا، چیس کھیلتا اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر کولتار کی سڑک کو تکا کرتا۔ وہ گھر میں بھی جینس اور سلیولیس ٹی شرٹ پہنے ہوئے رہتا اور اس کی ننگی بالوں بھری بانہیں اسے بڑی اچھی لگتی تھیں۔ مردوں کے ہاتھوں میں گھنے بال ویسے بھی اچھے لگتے ہیں۔ اسے یاد ہے کہ شادی کے بعد اس نے اس کی آزاد خیالی پر صرف ایک بار احتجاج کیا تھا اور بھری پارٹی میں اس کی تضحیک کر بیٹھا تھا۔ وہ بھی بپھر پڑی تھی... یو اسناب، تم اعلا سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔ تب سے وہ کچھ نہیں کہتا۔

وہ ان مردوں سے، جن میں کچھ خاص بات ہوتی ہے، دوستی کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر بار الگ الگ پر کشش لوگوں کے ساتھ خود کو دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی بے پناہ خوبصورتی کے ساتھ کوئی تضاد نہیں چاہتی بلکہ اپنی بے پناہ خوبصورتی کی طرح بخوشی قبول کر لی جانے والی شے کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ وہ اپنے یہاں نت نئے لوگوں کو مدعو کرتی ہے اور اپنے کپڑے اور کمرے کا نمائشی چیزیں دکھا کر داد وصول کرتی ہے۔ اسے اپنے دوستوں سے بہت سارے قیمتی اور نایاب تحفے ملے ہیں۔ وہ ان کی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ اپنے بے تکلف دوستوں کو بوسہ لے کر کرتی ہے۔ پاوش اس لمحہ ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے... اٹس میٹر آف پلیزر، وہ کہتا ہے اور انہیں چائے کا کپ تیار کر کے دیتا ہے

اوران کی کسی فرمائش کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے۔ مگر جلد ہی ان کی الٹ اماڈ باتوں سے اوب بھی جاتا ہے اور کھڑکی کے پاس جا کر کولتار کی سڑک دیکھنے لگتا ہے اور جب سارے لوگ چلے جاتے ہیں تو وہ اس کے پاس آتا ہے۔ اسے ٹھہری ہوئی لیکن شکایت بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کے شانوں پر بوسہ لیتا ہے۔

ایک چھوٹی سی ملاقات کے بعد ایک دن 'وہ' آیا تھا۔

اس کے آنے پر بھی پاوش نے ہی اس کو انٹرٹین کیا تھا اور کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ جہاں 'وہ' اپنے حریف کی عنایتوں سے حیرت زدہ تھا وہیں پاوش اس کی ویلر اپیل پر سالٹی سے مرعوب دکھ رہا تھا۔ غضب کی باڈی لینگوج تھی اس کے پاس۔ اپنی اس کھوج پر اس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔ اس کے چوڑے شانے پاوش کے شانوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھے اور وہ مسکراتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی شرارتی چمک ابھر آتی تھی۔

وہ پاوش کی غیر موجودگی میں آتا اور بغیر دستک دیے اس کے بیڈروم میں داخل ہو جاتا۔ اس کے لیے تو سب معاف تھا۔ ''ہائے سویٹ ہارٹ۔'' وہ مسکرا پڑتا۔ اسے بھی اس کی کمر کا کٹاؤ بے حد پسند ہے۔ وہ جھکتا اور اپنے ہونٹ وہاں رکھ دیتا۔ پھر اسے آگاہ کراتا کہ اس کے جسم کا کون سا حصہ کتنا خوبصورت ہے۔ اسے اپنے جسم کی خوبصورتی کا شعوری طور پر اعتراف ہے لیکن وہ جب اس کے منہ سے اپنے جسم کے ایک ایک عضو، چہرہ، شانے، پستان، کمر، کولہے اور پنڈلیوں کے بارے میں سنتی تو محسوس کرتی جیسے کسی اجنبی جہان کی سیر کر رہی ہو۔ وہ اس کے سینے پر ہولے ہولے ہتھیلی مارتے ہوئے اس کی بانہوں سے سٹ جاتی... ''تم بے ایمان ہو۔'' وہ زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا تو اس کے اندر جوار بھاٹے جیسی کیفیت پیدا ہو جاتی اور جنون کی شدت میں وہ اس کا ہاتھ کھینچ لیتی۔

انسان کے اندر اس کے من میں اس کا اپنا ایک گھر، ایک نجی دائرہ ہوتا ہے۔ جسے وہ اپنا کہتا ہے اور جس پر صرف اپنا ہی اختیار محسوس کرتا ہے۔ اور جس کے تحت یہ میرا اپنا ہے، وہ میرا اپنا ہے کے احساس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ لیکن پاوش میں وہ خاص بات کیوں نہیں ہے۔ وہ حسین ہے، اس کی بانہوں کی مچھلیاں بھی مضبوط ہیں۔ پھر وہ چھوتا ہے تو اسے اپنی ہتک کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اس کی رگوں کے اندر کے پارے کیوں نہیں تھرتھرا اٹھتے۔ جن لمحوں کو وہ پوری طرح جینا چاہتی ہے، محسوس کرنا چاہتی ہے، پاوش کا جسم ان عظیم لمحوں کو سرد کیوں کر دیتا ہے۔ کوئی فاصلہ ہے جس کی بنا پر پاوش اُس کا آئیڈیل نہیں ہو سکتا۔ اور تب اس نے اپنے اور پاوش کے بیچ کے لمحے سمیٹ دیے۔ جب بھی پاوش کی پلکیں بوجھل ہونے لگتیں وہ عاجزی سے کہتی... ''پلیز پاوش، میں ان دنوں کپڑے سے ہوں۔ یا پھر، مجھے زکام ہے۔'' پاوش اسے چادر سے ڈھک دیتا اور سمجھدار بچے کی طرح صوفے پر سو جاتا۔

اس دن 'وہ' نیلی دھاری دار قمیض اور ڈھیلی پتلون میں آیا تھا۔ اس نے بالوں کو پریس کر کے پیچھے کی طرف سنوار رکھا تھا۔ جس سے اس کا اٹیلین لک اکسپوز ہو رہا تھا اور چہرے پر ایک قسم کی لکوڈ کی چکنی پرت تھی جس سے لڑکیوں سا گلیمر پھوٹ رہا تھا۔ آج وہ بے حد سمارٹ دکھ رہا تھا۔

''ہائے سویٹ ہارٹ۔'' وہ کھڑا بدستور مسکرا رہا تھا اور وہ اپنی گردن میں پھر اکڑن محسوس کر رہی تھی... نگاہیں جھکا کر اس کی قمیض کے بٹن سے کھیلنے لگی۔ کتنے دنوں بعد آیا تھا وہ ...شاید عرصہ بعد... وہ اس کے لیے بلیک کوفی تیار کر کے لے آئی۔ اسے پسند تھی۔ لیکن وہ جانتی ہے اس کے مزاج کی ندرت کو۔ وہ آدھی کوفی سپ کرے گا اور میز پر رکھ دے گا۔ پھر جیسے ایک دم سے اس میں بے قراری پیدا ہو جائے گی۔ اس کے ہونٹ انگارے کی طرح تپنے لگیں گے اور وہ انہیں جہاں رکھے گا نیلی مہر ثبت ہو جائے گی۔

اسے اپنی پشت پر جلن محسوس ہوئی۔ اسکے کے ہونٹ داغ دے رہے تھے۔ وہ تڑپ گئی اور اس میں سمٹ گئی۔ وہ ایک تجربہ کار مانجھی کی طرح بھنور کے اردگرد پتوار ڈالنے لگا۔ اس کی اس بے رحمی پر اپنے اندر سے اٹھنے والی چھٹ پٹاہٹ کو اس نے سختی سے روکا۔ پھر دھیرے دھیرے خود کو بچھاتی چلی گئی۔ اس نے اسے پوری طرح ڈھک لیا۔ لہریں چڑھائی کی طرح اٹھنے لگیں اور ایک دھند لکے میں اس کا وجود گم ہونے لگا۔ اس کی سماعت میں زور زور سے گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ پوری طرح اس کے اندر تک سما جانے کی سعی میں لگا تھا اور وہ اسے پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش میں۔ اس نے پہلا دروازہ بند کیا۔ اس کی آنکھوں میں چراغوں کے جھرمٹ کوندے۔ وہ احتیاط سے ایک ایک دروازہ بند کرنے لگی اور قریب تھا کہ منزل اسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ دفعتاً اس کی روح میں کرچیاں بھر گئیں... ''نہیں نہیں...۔'' اس سے پہلے کہ وہ آخری دروازہ بند کر پاتی، پرستش کے اس بہت ہی نجی لمحے میں کسی تیسرے کی موجودگی کی بو پھیلنے لگی تھی۔ 'وہ' بہت پھرتی سے چادر کھینچ کر اپنا منہ چھپا چکا تھا اور وہ برہنگی کا لباس اوڑھے پاوش کے سامنے کھڑی تھی۔ کچھ لمحہ گزر جانے تک پاوش اس کے برف کی طرح گلتے جسم کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑی انکساری سے نگاہیں جھکا کر بولا۔

''دروازہ تو بند کرلیا ہوتا۔''

وہ آخری قطرہ بہہ رہی تھی۔

بو

''چھوکرے...!!''

''آیا ساب...ے''

''ایک چاہ...میٹھا کم پتی مار کے...ے''

''چھوکرے..!!''

''بولو ساب...ے''

''پاؤ روٹی...ملائی والا...ے''

''لایا ساب...ے''

''تیرے کو کیا مانگتا...پھٹا پھٹ بول...ے''

''کام...اپن ادھر کام کے واسطے آئے لا ہے...ے''

اس کی مشینی حرکت رک گئی اور وہ احمق کی طرح اس کا منہ تکنے لگا۔

عمر کچھ اسی کے برابر...پچکے ہوئے گال...محراب کی طرح لانبے چہرے پر سکڑی ہوئی پیشانی...ناک کے نیچے گہری ہوتی ہوئی سیاہی، جیسے اس کی تھی...منہ کے چوڑے لگام

سے باہر نکلے ہوئے بے ترتیب پیلے پیلے دانت...سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں جیسے ہاڑ کے پتلے پر کھال مڑھ دی گئی ہو....

''چھوکرے! ساب کا بل بتاؤ۔''

وہ چونکا...۔''ایک نمبر بیس روپے، دو نمبر دس اسی، اس کے بعد بارہ ساٹھ....''

اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔ دراصل وہ ابھی تک اسی مریل سے چھوکرے کی جغرافیہ میں کھویا ہوا تھا۔قریب جا کر بل نہ بتانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان چائے بسکٹ والے گاہکوں سے ٹرپ ملنے کی امید تو تھی نہیں۔ البتہ کوئی تگڑا آسامی آتا ہے، قلیہ قرمہ بورے جیسی توند میں اتار کر گینڈے کی طرح ڈکارتا ہوا کاؤنٹر پر پہنچتا ہے تو وہ اس کے سامنے تولیہ اور سونف کی پلیٹ رکھ دیتا ہے جس میں دو چار روپے چھٹے چھوڑ کر کاٹھ کے تنکے سے پان کی پیک سے سڑے گلے دانتوں میں پھنسے گوشت کے ریشے نکالتا ہوا وہ اس اطمینان سے چلا جاتا ہے جیسے اس کا پیٹ بھرنے سے ساری دنیا کی بھوک مٹ گئی ہو اور اس نے اپنا پیٹ بھر کر ساری دنیا پر احسان کیا ہو....''

''اپن کو ادھر میں کام ملے گا...؟''

وہ پھر چونکا۔اس کا من کیا کہ اس کی باتوں پر خوب ہنسے۔اس طرح کام مانگنے سے ممبئی میں اسے کوئی کام دے گا کیا...ارے یہاں تو لوگ بھیک اسے دیتے ہیں جو اپنے سچ مچ کے بھکاری ہونے کی جمانت رکھتا ہو۔ یہاں تو لوگ کھود سے کنی کتراتے ہیں...کھود پر بھروسا نہیں کرتے پھر دوسرے کو کون پوچھے...؟

نصف روز کے بعد اس کی چھٹی ہوگئی تو وہ اس مریل سے چھوکرے کو لے کر باہر آ گیا اور فٹ پاتھ سے ہو کر چلنے لگا۔

''کہاں سے آئے لا ہے...؟'' اس نے چلتے چلتے ہی پوچھا۔

''اپن رہنے والا تو ٹنڈلا کا ہے پر ادھر ممبئی میں ایک سال سے ہے۔''

''نام کیا ہے تیرا؟''

''بھگو.....''

''ادھر میں ایک سال سے کیا کرے لا تھا...؟'' وہ اس وقت ماہر پولیس والا ثابت ہورہا تھا جو کرفیو والے وقت میں مشکوک آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر پوچھ تاچھ شروع کر دیتا ہے۔

دادر میں ایک سیٹھ کے یہاں نوکری کرے لا تھا۔ پر وہ سالا اپن کو گالیاں بہت دیتا تھا...''

''تیرا اور کون کون ہے...؟''

''کوئی نہیں۔ صرف ٹنڈلا میں ایک سوتیلی ماں ہوتی ہے، وہ بھی اپن کو نئیں لگاتی ...۔ ایک دن اس نے بہت مار اپیٹا تھا۔ اتنا کہ سر پھٹ گیا تھا....'' اس نے اپنے سر پر زخم کا نشان دکھاتے ہوئے کہا، جہاں کے بال قدرے اڑے ہوئے تھے اور ایک سپید دائرہ سا بن گیا تھا۔ ''اسی دن اپن بھاگ کر ممبئی آ گیا....''

''تیرے کو سیٹھ کے یہاں نوکری کیسے ملی؟''

''وہ سالا اپن کو گاڑی میں ہی مل گیا تھا...اور پھر اپنے گھر لے گیا تھا۔''

''پر میرے کو نئیں لگتا کہ تو نے گالیوں کی وجہ سے نوکری چھوڑی ہے۔ گالیاں تو سالی یہاں کی جھمولہ ہوتی ہیں۔ جب تک دو چار کھاؤ نہیں، کھانا نہیں ہضم ہونے کا...سچ سچ بتا کیا ہوا تھا؟'' اس نے چلتے چلتے ناریل کے کھوپرے کو ٹھوکر ماری۔

''یار تو تو بڑا سیانا ہے...آ کھر ہے تو ممبیا....'' بھگو نے اسے مرعوب نگاہوں سے دیکھا۔

''اپن کا نام بلا ایسے ہی نئیں ہے۔''

اس نے مزید رعب ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آگے بول کیا ہوا تھا...؟''

''اصل میں گرو....وہ سالا سیٹھ کی چھوکری ایک نمبر کی ''چالو چیز'' تھی۔ سیٹھ کا کمرا اوپر میں تھا اور اس کا نیچے میں۔ وہ سالی ایک چھوکرے سے لائین کرتی۔ سیٹھ تو اوپر میں رہتا اور نیچے میں اس کی چھوکری۔ اس چھوکرے کے ساتھ اکھارات موج کرتی۔ کئی بار اَپن سے پنواڑی کی دکان سے سامان منگواتی۔ میرے کو نام نہیں مالوم...وہ کاگج پر لکھ کر دیتی تھی۔ ایک لال رنگ کا ڈبا جس پر تین کونے کا مارکہ بنا ہوتا تھا۔ بس ایک دن اس کا باپ نے اپن کو پکڑ لیا۔ اپن نے تو ساف ساف بتا دیا کہ یہ اس کی چھوکری کا ہے۔ وہ سالا اپن چھوکری کو کچھ کہنے کے بجائے مجھی کو نوکری سے نکال دیا...جانے دو سالے کو...اب تو ہی کوئی نوکری کا انتجام کرا دو گرو۔ تمہارا تو یہاں کافی جان پچان ہوگا نا۔''

''جان پہچان تو بہت ہے پر...اچھا اپن کوسس کرے گا....'' شاید اپنی تعریف سن کر اور بھگو کے گرو کہنے سے وہ خوش ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

''کل تو اپن کے ساتھ چلے گا۔ اپن تیرے واستے سیٹھ سے بولے گا...اپن جدھر میں نوکری کرے لا ہے ادھر میں کام تو بہت ہے پر سیٹھ سالا اکھا کنجوس ہوتا ہے۔ سب کام میرے ہی سے کرواتا ہے...سالا حرامی، گرہ کو بہت مانتا ہے...آج منگل وار کی اس کی دسا چل رہی ہے....اب لگا ہوگا بھاگ کو منانے میں...دیکھا...کیسا سورت سے ہی پاپی لگتا ہے.....''

''اپن لوگ جا کدھر میں رہا ہے.....'' بھگو نے درمیان میں ہی پوچھا۔

بس سامنے والے پل کے باجو میں اپن کی بستی ہے۔ ''ماگھونگر'' آج سے تو اپن کے ساتھ میں ہی رہے گا نا...اپن کے پاس ایک کھولی ہے...اور ایک بڑھیا موسی بھی ہے... اکیلی ہے بے چاری...اپن ہی اس کے واسطے سب کچھ ہے....چل تیرے کو پہلے اس سے

ملواتا ہوں.....‘‘ وہ پل سے نیچے اتر کر بستی کے نکڑ کی طرف بڑھ گئے۔ نکڑ کے دوسری طرف بجلی کے کھمبے کے پاس ایک بڑھیا بھاجی کی ٹوکری لگائے بیٹھی تھی اور بار بار اپنے چمڑے جھول رہے ہاتھوں سے مکھیاں بھگانے کے سبب قدرے پریشان نظر آرہی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بال سن کی طرح سفید تھے اور اس نے کمر کے نیچے ایک پرانا سا تہبند باندھ رکھا تھا اور بقیہ اوپری حصہ پر اسی تہبند کا ایک حصہ ڈال کر سوکھی مرجھائی، چھوہارے کی طرح اینٹھی ہوئی چھاتیوں کو ڈھکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے پاس پہنچ کر بلاّ نے کہا۔

’’موسی کیسی ہے...تیرا دھندا کیسا چل رہا ہے؟‘‘

’’ارے بلاّ...آ...آ...یہ کون ہے تیرے ساتھ.....‘‘ اس نے بھگو کو دیکھ کر پوچھا۔

’’یہ اپن کا یار ہے موسی...آج سے اپن لوگ کے ساتھ ہی رہے گا....‘‘

’’اچھا لے اسے کیلے دیدے....‘‘ بڑھیا نے دو کیلے بھگو کو دیے۔ بلاّ تو پہلے ہی دو اٹھا کر کھانے لگا تھا۔

’’اچھا موسی اپن لوگ چلتا ہے....تو تو سام میں آئے گی نا....‘‘

پھر دونوں بستی میں سما گئے۔ بستی میں کالے کلوٹے، بہتی ناکوں، پھولے پچکے پیٹوں اور بھنکتے جسموں والے بچے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ میونسپلٹی کے نل پر اپنی سپاٹ اور کوئی کوئی جھولتی ہوئی چھاتیوں، الجھے الجھے گرد سے اٹے بالوں اور سوکھی سوکھی رانوں کے ساتھ سروں کو کجھاتی ہوئی بستی کی جوان لڑکیاں اور ادھیڑ عمر کی عورتیں بالٹی اور پانی کا دوسرا برتن سنبھالے کھڑی تھیں۔ بدبودار نالیوں کے قریب فٹ پاتھ پر تاش کے پتے کھیلتے ہوئے ایک ہی ساخت اور حلیے میں ایک جیسے اشکال کے کچھ لوگ جن کی الگ الگ شناخت کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا، ایک دوسرے کو گالی گلوچ کر رہے تھے اور ایک مریل سا شخص اپنی عورت کو بری طرح پیٹ رہا تھا کہ اس کی عورت اپنے کسی عاشق کے ساتھ گنپتی میلہ گھومنے

چلی گئی تھی۔

اگلے موڑ سے بائیں طرف ایک تنگ وتاریک سی گلی گئی ہوئی تھی جس کے اختتام پر بلاّ کی جھونپڑی تھی اور اس کے ٹھیک پیچھے سڑتا بجبجاتا گٹر کا وجود تھا۔ آباد شہر کی چمک دمک کی ایک اہم ایجاد، ایک ایسی ایجاد جس کے تعفن اور سڑ انڈ سے ابکائی آتی ہے۔

''آ گیا اپنا سیس محل....'' بلاّ نے گلی کے موڑ پر پہنچ کر کہا اور دونوں گلی میں سما گئے۔ کھولی کے قریب پہنچ کر بھگو نے دیکھا، چوکھٹ پر ایک تختی لٹک رہی تھی، جس پر موٹے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہے...؟'' جب اس سے نہ رہا گیا تو پوچھ ہی لیا۔

''بلاّ کا سیس محل!!!'' وہ کواڑ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپن کا سیس محل ہے۔ تجھے پسند آیا...؟''

''ٹھیک ہے پر اتنی بدبو...؟''

''ارے وہ تو گٹر کی ہے۔ تو اس سے پہلے سیٹھ کی کوٹھی میں رہتا تھا نا، اس لیے یہ جگہ تیرے کو بری لگ رہی ہے... کچھ دن رہ لے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں اکھا ممبئی میں اس سے اچھی جگہ اور کوئی نہیں، مالم کیوں...؟''

بھگو نے نفی میں سر ہلا دیا تو اس نے مسکرا کر کہا۔

''بدھو... اسی گٹر کے سینے میں تو کالی راتوں کا کالا پن چھپتا ہے... اسی لیے تو یہ اتنا کالا کلوٹ ہے... کل ہی تو نھکا کی عورت نے ایک بچہ پایا ہے... دونوں میاں بیوی کتا کھوس ہوئے تھے۔ ایک بچہ ڈمرونائی پال رہا ہے۔ وہ تو اب تین چار برس کا ہوا ہوگا۔ دیکھنا تیرے اس سیٹھ کی چھوکری بھی ایک دن....''

''اس کا نام مت لے گرو.... اس کے چلتے اپن کی نوکری چلی گئی....'' اسے غصہ میں

دیکھ کر بلاّ چپ ہوگیا تھا۔ دوسرے روز بھگو کو وہ اپنے سیٹھ کے پاس لے گیا۔ پہلے تو سیٹھ نے گالیوں کا پٹارہ کھول دیا۔ پھر بلاّ کی بہت منت سماجت کرنے پر پگھل گیا اور اس نے اس شرط پر بھگو کو نوکری دی کہ اس کی پگار بلاّ کی پگار سے پچیس روپے کم ہوگی۔

نوکری مل جانے سے بھگو بہت خوش تھا۔ وہ روزانہ صبح بلا کے ساتھ کام پر جاتا اور شام کو واپس آجاتا۔ پہلے دن بلاّ نے کیسے کام کرنا ہے، سب سمجھا دیا تھا۔ بھگو کو صرف لوگوں کے جھوٹے برتن اٹھاتے ہی گھن آتی تھی۔ مگر کچھ خاص کراہت نہیں گزرتی تھی۔ منگلوار کے روز آدھا بیلا سے انہیں چھٹی مل جاتی تو وہ کہیں گھومنے نکل جاتے۔ اکثر وہ ممبئی وی ٹی نکل جاتے۔ وہاں پر گیٹ وے آف انڈیا کے کبوتروں کے ساتھ دھما چوکڑی کرتے۔ وہیں پر کئی بار گورے صاحبوں نے ان کے فوٹو بھی اتارے تھے۔

کام کرتے ہوئے بھگو کا ایک مہینہ گزر گیا۔ کل اسے پگار ملنے والی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ پوری رات جانے کیا تانے بانے بنتا رہا۔ گو کہ دوسرے روز اگلے ہفتے دو گلاس ٹوٹ جانے کی وجہ سے اسے پگار میں سے دس روپے کم ہی ملے مگر وہ بے حد خوش تھا۔ مٹھی میں دبے پیسوں کو قدرے توقف کے بعد بار بار گننے لگتا۔ اس نے بلاّ سے کہا کہ وہ ایک دن کے لیے دادر جا رہا ہے۔ کل لوٹ آئے گا۔ اور پھر بنا وجہ بتائے وہ چلا گیا۔ دوسری صبح جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔

بلاّ نے دیکھا تو نہارتا ہی چلا گیا۔ گو کہ وہ سانولی تھی اور اس کے چہرے پر چیچک کے کئی بھدے داغ تھے مگر اس کے جسم کا اتار چڑھاؤ بلا کا ہیجان خیز تھا۔ اس کے سینے پر قمیص کا بخیہ ادھڑا ہوا تھا، جہاں سے انگیا کی پٹی نظر آرہی تھی۔ اس کی کسی ہوئی چھاتیوں کو دیکھ کر وہ کسمسا گیا اور نظریں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

''جمنا...دادر ریلوے اسٹیشن کے پاس والی بستی میں رہتی ہے۔اپن جب ادھر میں رہتا تھا تبھی اس سے جان پہچان ہوئی تھی...اس کی ایک کھائیس تھی کہ اپن اس کو لال چوڑیاں لاکر دے.....''

بلا نے دیکھا، جمنا نے لال چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔اس نے لال رنگ سے ناخن رنگا ہوا تھا اور بالوں میں ربن بھی لال ہی باندھے ہوئے تھی۔شاید اسے لال رنگ بہت پسند تھا۔وہ ابھی اسی میں کھویا ہوا تھا کہ بھگو نے کہا۔

''اپن اسے تم سے ملوانے لایا تھا گرو...اب چل کام پر چلتے ہیں...جمنا کو ہوٹل بھی دکھا دیں گے...کبھی کبھار آتی رہے گی۔''

تینوں ہوٹل کی طرف چل دیے اور خاموشی سے راستا طے کرتے رہے البتہ بھگو راستے میں پڑے ہوئے روڑے یا ٹین پتر کے ڈبوں کو ٹھوکر سے دور اچھال کر اپنی خوشی کا اظہار کر دیا کرتا تھا اور گاہے گاہے بلاّ بھی کنکھیوں سے جمنا کو دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔وہ دانستہ سب سے پیچھے چل رہا تھا۔جمنا کی چال سے اس کے کولہے میں پیدا ہو جانے والی ساخت کو دیکھ کر وہ سوچنے لگتا کہ اس کی کمر کے نیچے کا جسم کچھ بھاری ہے اور بھدا بھی۔ان چھوکریوں کی طرح نہیں جو سیٹھ کے پاس پاؤ روٹی اور چائے پتی پہنچانے آتی تھیں اور سیٹھ ان کا ہاتھ پکڑ پکڑ باتیں کیا کرتا تھا۔پھر بھی جمنا اسے بڑی بھلی لگ رہی تھی...نہ جانے کیوں...؟

سیٹھ نے انہیں اس وقت آتے دیکھا تو آگ ببولہ ہو اٹھا...''حرامیوں، یہ ٹیم ہے تم لوگوں کے آنے کا؟''

ابھی وہ مزید دو ایک گالیوں سے نوازتا کہ اس کی نظر جمنا پر پڑی۔وہ جس تیزی سے کھولا تھا، اسی تیزی سے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔''ہے...ہے...ہے...یہ کون ہے...کیا

یہاں کام کرے گی؟'' اس کے پیلے پیلے دانت باہر نکل آئے اور بھدا سا پیٹ بے ہنگم طریقے سے ہلنے لگا تھا۔

''کھبد ار سیٹھ؛ اس پر برا نجر ڈالا تو....'' بھگو آپے سے باہر ہو گیا تھا۔

''اچھا تو مجھی کو آنکھ دکھاتا ہے... ابھی مجا چکھاتا ہوں میں... ایک تو سالوں کو کام دو دوسرے رواب بھی سہو... چلے جاؤں یہاں سے سؤر و اور پھر اپنی منحوس صورت کبھی مت کھانا....''

بھگو بھی اس وقت غصے میں تھا۔ اس نے نوکری چھٹنے کی پروا نہیں کی اور وہاں سے چلا آیا۔ جمنا کو دادر پہنچا کر وہ دن بھر بستی میں بھٹکتے رہے۔ بلا نے سمجھایا بھی کہ نوکری جانے سے وہ بھوکوں مر جائیں گے... چل کر سیٹھ سے معافی مانگ لے... ردعمل میں بھگو بھڑک اٹھا اور غصے میں بولا۔

''تیرے کو جانا ہے تو جا، پر اپن اس کتے کے پاس نہیں جائے گا....'' اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا تھا۔

دوسرے روز سیٹھ کا ایک آدمی ان دونوں کو کام پر بلانے آیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بھگو کا غصہ قدرے کم ہو چکا تھا۔ دونوں واپس ہوٹل گئے تو سیٹھ نے پہلے چائے پلائی اور غصہ تھوک دینے کو کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سیٹھ کے اس آدمی نے بتایا کہ کل شام جمنا سیٹھ کے پاس آئی تھی اور اس نے اس کا ہرجانہ چکتا کر دیا ہوگا۔ اس لیے وہ دونوں واپس کام پر بلا لیے گئے ہیں....

اسی شام بلا پل پر کھڑا بہت دیر تک دھرتی کی کہکشاں ممبئی کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا... اور بھگو اُس رات موسی کی گود میں سر رکھ کر بہت دیر تک سسکیاں لیتا رہا۔ اس کی بے جان چھاتیوں سے بار بار چمٹنے کی کوشش کرتا رہا اور موسی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی

رہی۔

منگل کو نصف روز کے بعد انہیں چھٹی ملی تو وہ جمنا سے ملنے دادر گئے مگر وہ انہیں بہت تلاشنے کے بعد بھی نہ ملی تو تھک ہار کر اپنی کھولی میں آ کر پڑ گئے۔ بھگو کو بار بار جمنا کی یاد ستا رہی تھی اور وہ اداس ہو جاتا تھا۔ وہ جب کبھی بھی بے زار یا اداس ہوتا تھا، موسی اسے تسلی کا سامان مہیا کرتی لیکن اس وقت تو شام گہری ہو جانے کے باوجود موسی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اندھیرا ہر سمت پوری طرح چھا گیا اور جھونپڑیوں کی منڈیر سے غول کے غول دھواں نکل کر فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ ساتھ ہی بستی کے بچوں کا شور اور رونے دھونے کی آوازیں دن کی بہ نسبت مزید بڑھ گئیں اور دن بھر مزدوری کر کے لوٹنے والے جسموں کے مبہم مبہم سائے اپنی اپنی جھونپڑیوں کی طرف رینگنے لگے تو بھگو اور بلاّ کو موسی کی فکر لاحق ہوگئی۔ اب تک تو چلی آتی تھی...؟ انہوں نے پاؤ اور بھجیا بھی لا کر رکھ لیا تھا۔ منگل کی رات کو وہ موسی کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ کافی دیر تک وہ اس کا انتظار کرتے رہے۔ اندھیرے میں گٹر کی سڑانڈ پوری بستی پر کسی غلیظ چادر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک بلاّ کے ذہن میں ایک خیال عود کر آیا اور وہ بھگو کو لے کر بستی کے نکڑے کی طرف چل پڑا مگر بجلی کے کھمبے کے پاس وہ جگہ خالی تھی اور آس پاس بھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اسے یہ بات سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ ہلا گاڑی فٹ پاتھ پر سامان بیچنے والے دوسرے آدمیوں کے ساتھ موسی کو بھی اٹھا لے گئی ہے۔

وہ اداس من سے پل پر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اچانک وہ بہت کمزور لگنے لگا تھا۔ پل پر سے روشنی میں نہائی ممبئی کی اونچی اونچی عمارتوں سے کسی برقی میلے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ پل کی ریلنگ سے کہنی ٹکا کر اُن روشنیوں کو دیکھنے لگا، جبھی بھگو نے پوچھا۔

''موسی کے بارے میں تو نے کیا سوچا ہے؟''

”کچھ نہیں، صبح سالے چھوڑ دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے اسے اپنے سینے کے کسی حصے میں ایک عجیب طرح کی بیزاری کا احساس ہوا۔ وہ سوچنے لگا.....

موسی اس کی کیا لگتی ہے...؟

وہ کہاں سے آیا...؟

بھگو کا تو ایک گھر ہے جہاں سے وہ بھاگ کر آیا۔

مگر وہ...اس نے جب سے ہوش سنبھالا موسی کو اپنے پاس ہی پایا...پھر...؟

ان سوالوں نے اسے بے چین کر دیا۔ آج اسے کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے۔

صبح جب وہ موسی کو لینے حوالات گئے تو موسی تھانے دار کو بتا رہی تھی کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے...اسی گٹر کی کوکھ سے اس نے پایا ہے...اسے یقین ہے وہ کسی بڑے ساب کا....

یہ سن کر بلا پر حسب توقع کوئی تاثر قائم نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر کی بے چینی کم ہو گئی تھی ۔ایک سرد چنگاری تھی جو شانت ہو گئی تھی ۔ اتنے دنوں بعد آج وہ خود سے ملا تھا۔ اس کی پہچان ہوئی تھی ۔

وہ تینوں واپس بستی میں آئے تو تین چار صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کر تجسس میں پڑ گئے ۔بستی کے ننگ دھڑنگ بچے اور کچھ بستی کے عورت مرد اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ اس بستی میں ایسے لوگ کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ اکثر وہ کسی کے یہاں قرقی اور ضبطی کے لیے ہی آتے تھے۔ ریلوے کے لوہے اور لکڑیاں چرانے والے کچھ چور اس کی بستی میں رہتے تھے۔ ان لوگوں کی وجہ سے یا پھر الیکشن کے وقت میں ایسے لوگوں کا ایک دو دفعہ آنا ہو جاتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد متعلقہ کاموں کا انکشاف ہو گیا کہ وہ سرکاری بابو لوگ گٹر کی چوڑائی

کی کھدائی کا کام کروانے آئے ہیں اور بستی میں مزدور تلاش کر رہے ہیں۔ ان کے ارد گرد جو لوگ جمع تھے اُن میں تو کچھ کام پانے کی غرض سے آئے تھے اور کچھ احتجاج کرنے کے لیے کہ گٹر چوڑا کرنے سے بہت ساری جھونپڑیاں ٹوٹ جائیں گی اور بہت سارے لوگ بے گھر ہو جائیں گے۔ ان میں وہی لوگ تھے جن کا بسیرا گٹر کے کور پر ہوتا تھا۔ مگر سرکاری بابو کے آگے کسی کا کوئی چارہ نہیں چلا۔ آخر شہر کی ایجاد یہ گٹر تھا اور گٹر کی ایجاد ایسی بستیاں۔ اگر گٹر نہ ہو تو ایسی بستیاں قطعی آباد نہ ہوں... یہ مبہم مبہم سے چہرے والے لوگ نہ ہوں... شہر کی روشنی بڑھی ہے تو گٹر کا بڑا ہونا لازمی اور فطری ہے۔

چند لمحوں کے بعد اسی بستی کے مزدور کنارے کی جھونپڑیاں مسمار کر رہے تھے۔ بلّا کے 'شیش محل' کی تختی بھی کہیں غلیظ کیچڑ میں دفن ہو گئی اور وہ شام کے دھندلکے میں پل پر کھڑا روشنیوں کو دیکھتا رہا جو کسی برقی میلے جیسی لگ رہی تھیں۔ وہ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ بھی تو انہیں روشنیوں کا ایک حصہ ہے مگر....

ان روشنیوں میں اس کا اپنا حصہ کتنا ہے...؟

موسی، جسے اس عمر میں حوالات میں بند ہونا پڑتا ہے۔ اس کا حصہ کتنا ہے؟

جمنا، جس نے لال چوڑیوں کی لاج کے لیے اپنے کو مارلیا، اس کا حصہ کتنا ہے...؟

کیا صرف اتنا کہ ان کے پاس بھی زندگی ہے۔ جس کے لیے انہیں جینا ہے، گھر سے بھاگنا ہے، حوالات میں بند ہونا ہے اور ایک دن اسی گٹر کی سڑانڈ میں اپنے جسم کی سڑانڈ کو بھی ملا دینا ہے۔ اسے اپنے آس پاس بہت ہی تیز بو کا احساس ہوا مگر وہ تمیز نہ کر سکا کہ وہ گٹر سے اٹھنے والے تعفن کی بو ہے یا اس کے اپنے، موسی، بھگو، جمنا اور اس کی پوری بستی کی سڑانڈ کی۔

حبضی کی آدھی شلوار

235 نمبر بس میں رپن اسٹریٹ سے چڑھتے وقت بھی اس کے دماغ میں میم صاحب کا عکس چھایا ہوا تھا۔

آفس ٹائم ہونے کی وجہ سے بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ دروازوں پر لوگ بری طرح اڑے ہوئے تھے۔ کچھ راڈ پکڑے پائیدان پر اور کچھ باہر کی جانب جھول رہے تھے۔ ایسے میں وہ اپنی جیب کی طرف سے قطعی بے نیاز تھے اور ان کی ابھری ہوی جیبیں دیکھ کر بدرو کے منہ میں اس طرح پانی بھر آیا تھا جیسے اوپر کے دنوں میں املی یا آچار دیکھ کر کسی عورت کے منہ میں رال آجاتی ہے۔ اس نے تھوک حلق میں غٹک لیا اور اپنے کانے استاد کا تصور کر کے اندر کی جانب سرکنے لگا۔ اس کی محتاط نظر بڑی مستعدی سے کسی کی کھوج کر رہی تھی۔ اوپری پائیدان پر پہنچ کر اسے مطلوبہ شے مل گئی تھی۔ کنڈکٹر کو اس کی تیسری نظر کی بھاشا سمجھ میں آگئی۔ ''ماچ کھانے چلو دادا...... ماچ کھانے کھالی آچے۔'' (بیچ میں چلو بھئی، بیچ میں خالی ہے) اور دوسرے لمحے اس نے خود کو بھیڑ کے حوالے کر دیا اور جس جگہ پہنچا، لیڈی ڈائنا، بنگالی بابو سے لپٹی ہوئی تھی۔

''آہ! میم صاحب کے بدن کی خوشبو......'' ایک لذت آمیز جھرجھری سما گئی اس کے وجود میں۔ بنگالی بابو اونگھ رہے تھے اور ان کی ٹھوڑی سامنے کھڑی عورت کے شانے اور ننگی پشت کو بار بار چھو رہی تھی۔

''مے......م......صاحب......''

عورت نے پیچھے سے سکوائر گلے والا بغیر بانہہ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔

یہ اس کی سرحد تھی۔ اس سے آگے اس کی نظر راہ بناتی تو میم صاحب کا جسم ایک ضد بھرے انکار میں اکڑ جاتا۔ آج وہ خود کو اُن بندشوں سے آزاد محسوس کرنا چاہتا تھا اور محسوس کر بھی رہا تھا۔ گویا میم صاحب اپنے ہی خمیر سے گیلی ہوگئی ہوں۔ آج وہ میم صاحب کی تپتی ریت میں اپنی انگلیاں گڑا سکتا تھا۔ اپنی خشک ہوتی روح کو ایک نئی لذت کی آخری حد سے آشکار کر سکتا تھا۔ اس کی نگاہ عورت کے جسم کی تنگ اور ناہموار گلیوں میں آوارہ کتے کی طرح ہانپنے لگی۔ گردن کے نیچے اور پشت کے درمیان سے جہاں سے پٹھاری علاقہ شروع ہوتا تھا، ایک نالی گزرتی ہوئی نیچے کی طرف ترائی والے علاقے میں کہیں چلی گئی تھی جس کے دونوں ڈھلوانوں پر ''داس مشٹھان بھنڈار'' کے بھاڑ میں جمے دہی کی بالائی سطح جیسی ملائم سطح پر مہین مہین بالوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح کے مہین مہین بالوں کے سلسلے اس کی کلائی اور گداز بانہوں پر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ سندر، سلیقے سے سنورے ہوئے۔ اسے ایک بار پھر لذت آمیز جھرجھری آگئی۔

''آہ میم صاحب......''

پھر اسے ابکائی آتی محسوس ہوئی جیسے حبشی کے جسم کی بُو لگ گئی ہو۔ کئی دنوں سے بال صفا پاؤڈر کے استعمال میں کوتاہی کے سبب عورت کی بغل کے کھڈوں میں اگ آئے چھوٹے چھوٹے بال بدنما لگ رہے تھے۔ بڑا نفیس طبع واقع ہوا تھا۔ اس نے نظریں پھیر لیں۔ بنگالی

بابو کے ململی کرتے سے ناک سٹا دی۔ ''لیڈی ڈائنا'' اب اس سے لپٹنے لگی۔

''آہ.....آہ.....آہ'' وہ خوش ہو گیا۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں سے سیٹی سی بج گئی۔ وہ جلدی جلدی اپنے نتھنوں کو پھلانے بچکانے لگا۔ جیسے وہ اکثر خاص طور سے کرتا ہے۔ اسے اپنا کام یاد آ گیا۔

بنگالی بابو اَب بھی اونگھنے میں مصروف تھے اور اسے یہ سب غیر فطری سا لگ رہا تھا۔ اس نے تیسری آنکھ وا رکھی تھی اور بنگالی بابو بہت باریکی سے چل رہے تھے اور ان کے اندر کا کتا وسیع شاہراہوں پر سرپٹ دوڑ رہا تھا اور جب جب بورے کی تہہ میں اضافہ ہوتا، بنگالی بابو کے اندر کا کتا بری طرح ہانپنے لگتا۔ گرمی کے دنوں میں اکثر کتے منہ پھاڑے، زبان نکالے اور رال گراتے ہوئے اس طرح ہانپتے ہیں کہ ان کا پورا جسم آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔

بنگالی بابو کا چشمہ اور چشمے کے پیچھے ان کی موندی ہوئی آنکھیں، اوپر راڈ پکڑے ہوئے عورت کے ہاتھ پر چڑھی ہوئی ان کی انگلی اور اس کے پچھلے ایک حصے پر قابض ایک ران، جیسے گوا پر کبھی پرتگال۔ یہ سب اسے اچھا لگ رہا تھا۔ جب جب عورت جھک کر کھڑکی سے باہر کے مناظر دیکھتی، اس کی کمر کے تہہ دار بورے میں کئی تہہ پڑ جاتی اور بنگالی بابو......

اس کے دماغ میں کیڑے شور مچانے لگے اور پھر شور کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تو اس نے دیکھا، بنگالی بابو کی جیب بالکل اس کے قریب ہو گئی تھی۔ بس ذرا سا ایسے ہو اور وہ یوں چھو لے گا۔ اس کی نظر نے پھر کھوج کی اور تیسری نظر کی بھاشا سمجھ گئی۔ وہ جلد اپنا کام کر گزرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ عورت بیک بگان یا منٹو پارک ہی اتر گئی تو......اسے اپنا یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا۔ ملک بازار اسٹاپ پر بھیڑ کا ایک ریلا سا اندر داخل ہوا۔ ''آگے چلون دادا......'' وہ قصداً بنگالی بابو سے ٹکرا گیا۔ نتیجتاً ان کی دونوں رانیں......اور ہٹلر نے پوری دنیا فتح کر لی۔ ایک بھونچال سا اٹھا۔ بس وہ ان کی بے آرامی کی کیفیت کے لمحاتی وقفے میں

ہی اپنا کام کرلے گا۔ نہیں، نہیں، وہ زیادہ انتظار نہیں کرسکتا۔ بقول استاد، کوئی غیبی شکتی آسامی کو باخبر کردیتی ہے۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ بس اب تھیئٹر روڈ پار کررہی تھی اور اس کے پہلے ہاتھ کی پہلی دو انگلیاں پوری طرح الرٹ ہوگئی تھیں، اور تب قسمت بھی ساتھ دے گئی تھی اس کا۔ بس رک گئی۔ بیک بگان سے قبل ہی ٹریفک جام ہوگئی تھی۔ بس کے اندر مکھیوں سی لوگوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی تو عورت نے جھک کر باہر دیکھا اور کچھ لمحہ جھکی دیکھتی رہی۔ بنگالی بابو کا شعور جیسے چٹان سے ٹکرا کر لہولہان ہونے لگا۔ پیشانی بھیگ گئی اور ایک مسرت کی لہر بدرو کے شعور کے قالب کو گدگدا گئی۔ اس کی دو انگلیاں جادوئی طریقے سے کرتے کی جیب میں اتریں اور واپس پتلون کی جیب میں سما گئیں۔ اس نے راحت کی سانس لی اور اس کے خیال میں ''داس مشٹھان بھنڈار'' کا بڑے بڑے بھاڑ میں سجا ہوا دہی چھلکنے لگا۔ ''ایک ٹو دیکھی دادا، آمی اے کھانے ناپبو ....'' دھیرے دھیرے اطمینان کے ساتھ وہ بس سے نیچے اتر آیا۔ وہ سوچ رہا تھا، بنگالی بابو کے کپڑے بھی اتارے جاسکتے ہیں، وہ عورت اسی حالت میں رہے اگر۔ فٹ پاتھ سے چلتا ہوا وہ خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ اگلے بس اسٹاپ پر اُسے نصرو مل گیا۔ پتلی کمر والا نصرو لڑکی بنتے بنتے رہ گیا تھا شاید۔ چہرہ مہرہ، چال ڈھال یہاں تک کہ اس کی بات چیت سے اس کے آدھی لڑکی ہونے کا وہم ہوتا تھا۔ اور وہ کہتا....... ''تو تو ایک دم لڑکی ہے رے......'' پھر ہنس دیتا کچھ سوچ کر، اگر ایسا ہوتا تو اس لڑکی سے اس کی گاڑھی کیسے چھنتی جو اس پر دل وجان سے نثار تھی۔ بہت دیر نہیں بیٹھا وہ اس کے پاس۔

''جارہا ہوں.......''

نصرو ہنس دیا۔ ''آج میر بھی بات ہے ملنے کی۔ بس دو چار جوتے اور.......'' وہ ''داس مشٹھان بھنڈار'' پہنچا اور اس نے دہی کا ایک بڑا سا بھاڑ خریدا اور تھوڑی دیر بعد وہ میم

صاحب کے گھر پر تھا۔ اب اتفاق کا کوئی جواز تو ہوتا نہیں۔ میم صاحب غسل خانے میں تھیں۔ وہ سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس لمحہ وہ اپنے اندر ایک تھکان بھری اُمس محسوس کر رہا تھا۔ کچھ رِستا ہوا سا لگا اُسے۔ اس کی نظریں متواتر غسل خانے کی جانب اٹھتی رہیں۔ اچانک غسل خانے کا کواڑ ذرا سا وا ہوا اور ایک جھماکے سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس کے احساس کی آگ پیچ سی جان پڑی اور وہ اپنے اندر سے شعور کے تمام ہی کیڑوں کا اخراج محسوس کرنے لگا۔ میم صاحب نے اطمینان سے پاؤں میں پھنسا کر پینٹی اوپر چڑھائی پھر برا کا ہک لگا کر آپس میں ٹکرا رہی چھاتیوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور بدن پر تولیا پھیلاتے ہوئے غسل خانے سے باہر آ گئیں۔ بدرو کو دیکھ کر ان کے دُھلے ہوئے صاف ہونٹوں پر ایک گہرا تبسم پھیل گیا۔ وہ اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اندر کے کمرے میں چلی گئیں اور واپس لوٹیں تو ایک جدید طرز کی نائٹی میں ملبوس تھیں جس کے کئی مخصوص حصوں میں جسمانی زاویوں کی نمائش کی خاصی گنجائش تھی۔ وہ اس کے سامنے کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔ بولیں کچھ نہیں، بدستور مسکراتی رہیں۔ گویا ان کھلے مخصوص حصے والے علاقوں میں اس کی نگاہوں کو چہل قدمی کرنے کی پوری اجازت دے رکھی ہو۔

داور وہ یہ فرحت بخش تفریح کرتا رہا اور اس کے اندر کا مردانہ چٹان پگھلتا رہا۔ میم صاحب کے ہونٹوں پر اب بھی وہی دلکش تبسم رقصاں تھا جو ایک دعوت تھی پیاس کو پی جانے کی۔ دفعتاً اسے اپنے اندر کانٹے دار جھاڑیوں کی چبھن محسوس ہوئی اور پھر خون ہی خون نکلنے لگے۔ اس کے منہ، ناک، کان اور آنکھوں سے۔ وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگا اور دیر تک روتا رہا اور تب پہلی مرتبہ میم صاحب کی انگلیوں کا برفیلا لمس اس نے اپنے شانے پر محسوس کیا۔

''مت رو بدرو، میرے صاحب آئے ہوئے ہیں۔ تو جا، میں دہی کھالوں گی......''

کچھ جل گیا اس کے اندر جس کی گندھ اس نے بھی محسوس کی۔ اردگرد نفرت کے سایوں سے اپنے سائے کو ٹکراتے ہوئے اس نے بخوبی دیکھا اور پھر تیزی سے اٹھا اور لمبے لمبے قدموں سے باہر نکل گیا اور میم صاحب حیرت زدہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اُف، کتنی نفرت، کتنی نفرت ہے اس کے اندر۔ اوپر سے ہونے والی بارش اس کے من کی آگ کو اور تیز کر رہی تھی۔ دن بھر بارش ہوتی رہی اور وہ پورا دن سلگتا رہا۔ رات میں برج کے نیچے بیٹھا وہ اپنے اندر کی تمام آگ اگل دینا چاہتا تھا۔ سامنے چوڑی اور سیاہ سڑک کے درمیان سفید لکیر کسی بیوہ کی سونی مانگ کی طرح سپاٹ پڑی تھی اور اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں گرتے ہوئے پانی کے فوارے ایک نامعلوم ہیجان سے دوچار کر رہے تھے۔

درزی کا کام اور جبھی سے محبت کرتا تھا۔ لپکتی ہوئی آگ نے سب کچھ خاکستر کر دیا۔ اس کی دکان اور محبت کو بھی۔ بنگلہ دیش چھوڑ دیا اس نے۔ مرشدآباد ہوتے ہوئے کلکتہ آ کر جیبیں کاٹنے لگا۔ اووَر برج کی چھت اور اس کے نیچے بدبودار جبھی اور ''داس مشٹھان بھنڈار'' کے یہاں کا میٹھا دہی اور میم صاحب کی بغیر دروازے کھڑکی کی حویلی..... یہی سب، بس یہی سب اور شاید بے تکان چلنے والی یہ سڑک، گرتے ہوئے فوارے اور لپکتی ہوئی آگ..... کیا کچھ نہیں۔ ننگے بدن پر جمے پانی کے چھینٹوں کو ہتھیلی سے رگڑ کر صاف کرنے لگا اور اوہام کی دھند چھانے لگی اس پر۔ ایسی ہی گہری دھند میں جب وہ پوری طرح گھر جاتا تو اپنے ہوتے ہوئے بھی اپنے نہ ہونے کا گمان خود پر غالب محسوس کرنے لگتا اور جب اسے یہ گمان بھی اپنے دست سے خارج ہوتا محسوس ہوتا تو آہستہ سے جبھی اس کے قریب آ جاتی، ایک دم قریب۔

اسی کیفیت میں اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ جبھی زمین پر بکھری بلاؤز سے

چھاتی نکال کر بچے کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ ایک دم سے اٹھا وہ اور اسے بچے سے الگ کرتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑا۔ جبھی کی چھاتیوں سے سفید سفید دودھ کے قطرے نکل کر اس کے چوڑے سینے کے گھنے بالوں میں پھنس پھنس گئے۔ جھم جھما میں اس کی گردن کی موٹی نسیں ابھر آئیں اور پسینے پسیج کر تیل کی طرح اس کی کھالوں پر چمکنے لگے اور ایک دم سے کچھ جلنے کی گندھ اس کی ناک میں سما گئی تو وہ چھٹ پٹا گیا، تڑپ گیا اور الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا......؟'' جبھی کا برہنہ پیٹ اس طرح پھول پچک رہا تھا جیسے کوئی شریر بچہ پھونک مار کر غبارے میں ہوا بھر رہا ہو اور پھر اس کا منہ کھول دے رہا ہو۔

''چپ خانگین......'' اس نے بے قابو سانسوں کے درمیان تلخی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس رات نہیں لوٹا وہ۔ دوسری رات بھی نصرو کے ساتھ ہی سو رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے اعصاب کو مٹھی میں بھر کر مسل رہا ہو۔ دن بھی جیسے پلک جھپکتے ہی رات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بنگلہ دیش بننے سے قبل اس محلے میں جہاں وہ رہتا تھا، کچھ کم ہی گھرانے بنگالی مسلمانوں کے تھے۔ جبھی انہیں گھرانوں میں سے ایک گھر کی تھی۔ پتلی دبلی چھریرے بدن والی یہ سانولی سی لڑکی محلے کے تمام ہی نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اوباش قسم کے نوجوانوں میں تو جیسے اس کے عاشق ہونے کی ہوڑ سی لگی تھی۔ وہ اسے اپنی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے روز ہی دیکھتا اور ایک دن سچ مچ ہی وہ ایک پیکٹ لیے ہوئے اس کی دکان پر پہنچ گئی تو اس کی ریڈیو کی سڑ پڑ اور مشین کی گھڑ پڑ ایک دم سے بند ہو گئی۔

''کپڑے ہیں، شلوار سل دینا......''

''اور......''

"اور نہیں تو کچھ......اس کی ناپ کی بنے گی.....میانی جوڑی رہے گی اور بس....."
اس نے ایک پرانی شلوار اُس کے ہاتھوں میں پکڑا دی تھی۔اس نے اس کی شلوار کو اپنی ہتھیلیوں میں لے کر چھوا، پھر بھینچا تو نہایت ہی نرمی اور ٹھنڈک کے احساس سے پیدا شدہ ایک لطیف سی گدگدی اس کے رونگٹوں کو بیدار کر گئی۔اور تب اس نے اس کی شلوار کٹنگ کرنے والے کاؤنٹر پر پھیلا دی اور اسی کے ساتھ اس کی طبیعت میں لغزش بھرنے لگی۔ایک نیم بے خودی کے عالم میں اس کے ہاتھ جبھی کی کمر کا احاطہ کرنے لگے۔پھر ازار بند کی گانٹھ پر آ کر رک گئے۔ایک جھٹکے سے ازار بند بھر سے کھل گیا اور شلوار پوری چوڑائی میں پھیل گئی۔ اب اس کی آنکھیں بڑے انہماک سے پورے حالات کا جائزہ لے رہی تھیں۔اس کے پگھلتے ہوئے ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے کی جانب سرکنے لگے اور ایک دم سے پیروں سے آ لگے اور دفعتاً اوپر کو اُٹھنے لگے۔نرم حصوں سے گزرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں لرزش ہو رہی تھی۔درمیان سے اوپر ایک مخصوص جگہ پر اس نے ہاتھ روک لیے.....اور پھر اس کے شعور نے مزید کچھ سوچنے کا موقع فراہم نہیں کیا اور کچھ احتیاط اور کچھ گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس نے نئی شلوار کی میانی چوڑی کر دی۔جبھی مطمئن، شانت اور پرسکون لگ رہی تھی۔لیکن وہ ایک دم سے مضطرب ہو اٹھا، گویا نادانستہ اس سے ایک بڑے جرم کا ارتکاب ہو گیا ہو اور اسی احساس کی پاداش میں اس نے جبھی سے نکاح کر لیا۔محلّہ کے تمام نوجوانوں کی آنکھیں کینہ توز ہو گئیں کہ ان کے اجتماعی عشق کا جنازہ نکل گیا تھا۔وہیں محلے کے دیگر لوگوں کی برہمی کا یہ سبب بنا کہ اس نے، ایک بہاری مسلمان نے ایک بنگالی مسلمان لڑکی سے ان حالات میں شادی کر لی تھی کہ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان جیسے الفاظ لوگوں کے دماغ میں الگ الگ گھر بنا چکے تھے اور وہ اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کے دعوے کو لے کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔اور پھر آسمان کو چھونے لگے تھے

آگ کے شعلے۔

آگ اس کی روح کی طرف تیزی سے لپکی تو اس نے چھٹپٹا کر نصرو کا سینا بھینچ لیا اور جیسے چھناک سے کہیں سے پتھر آ کر اس کے شیشہ شعور پر گرا۔ کچھ سوچنے سے قبل اس نے اس کی تصدیق کر لینی چاہی اور ایک بار پھر اس نے پتھر جیسی سختی کو اپنی ہتھیلی میں بھینچ لیا ......تو اس کے ذہن میں خلا بھرتا چلا گیا۔ اندھیرے میں نصرو کی سسکی ابھرنے لگی تھی۔ ماحول میں پوری طرح خاموشی مسلط رہتی۔ تب اندھریے میں کپڑے کی سرسراہٹ ہوئی اور وہ باہر آ گیا۔ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ کر سامنے نظر گڑادی جیسے ہوا کا وجود تلاش رہا ہو۔ اندھیرے میں سے بدستور سسکی برآمد ہوتی رہی۔

''تمہاری چھاتی ہے؟''

''بیماری ہے......'' اندھیرے میں سے آواز آئی۔

''تو نے بتایا نہیں؟''

''علاج ہے، ہوٹل والا بتا رہا تھا......''

''کیا....؟''

''جلانا ہوگا گرم گرم ٹھکرے سے......''

''تو......؟'' نہ چاہتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا، بہت تکلیف ہوتی ہے......''

نہایت اضطرابی کیفیت میں اس نے رات کاٹی اور بہت صبح ہی اٹھ کر دھندے پر نکل گیا۔ رات کو لوٹا تو جبھی کو گالیاں دے رہا تھا....حرام زادی طعنے دیتی ہے مجھے...... کون عطر سی مہکتی ہے خود.....کہتی ہے میں نے ہی پیٹ دیا تھا.....چھنال سالی، جھوٹ بولتی ہے کمینی۔''

اب وہ پوراوقت نصرو کے ساتھ گزارنے لگا اور رات کو بھی اپنے گھر نہیں جاتا۔اس نے اپنے معمول میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر دی تھیں۔اس دن دھندے پر سے لوٹتے ہوئے وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔سوچ رہا تھا نصرو کو لے کر سوسائٹی میں لاسٹ شو جائے گا اور اس کا دھندہ ٹھیک رہا ہوگا تو رائل سٹی کی بریانی پر ہاتھ پھیرنے کے لیے بھی اسے راضی کرے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں کر سکا تھا وہ۔شام کو اپنی کھولی کے سامنے بیٹھا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مٹھی میں دبی ریت کی طرح بھر بھر کچھ ضائع ہو رہا ہو اُس کے وجود سے۔کچھ جلنے کی تیز گندھ اس کے نتھنوں کو مسلسل جلا رہی تھی۔کیا ضرورت تھی اسے اس لڑکی کے ساتھ فورٹ ولیم جانے کی۔یہ کرچ پہننے والے بھوکے بھیڑئے ہوتے ہیں.....لے گئے دونوں کو الگ الگ کیمپوں میں۔اس لڑکی پر کیا گزری یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔البتہ نصرو بے ہوش ہو گیا تھا اور اس کی جانگ سے.....اف ضرورت کیا تھی،ضرورت کیا تھی ادھر میں جانے کی......"

اس وقت جب آگ لگی تھی......پاکستان کی کوکھ سے کٹ کر بنگلہ دیش نکل رہا تھا۔یہی کرچ پہننے والے آئے تھے سب ٹھیک کرنے.....میری اور جبھی کی اور اس کی شلوار کی حفاظت کرنے.....کہاں ٹھیک ہوا تھا سب.....میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ سب تماشا ہوا تھا.....جبھی کی ملائم ریشمی شلوار نے بھک سے آگ پکڑ لی تھی۔وہ مدد کے لیے چیخ پڑی تھی اور کئی بھاری بوٹوں کی آواز اس کی مدد کے لیے گونجی تھی۔اس کی ادھ جلی شلوار بچ گئی تھی مگر.....ان چار چار مسٹنڈوں نے.....اور ایک تیز گندھ سے اس کی ناک ہی نہیں روح بھی......

اس کا سر منوں بھاری ہو گیا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ اس بوجھ سے خلاصی کی کوئی تدبیر سوچتا،اس کے کانوں میں بے ہنگم شور اور افراتفری کے درمیان کرچ پہننے والوں کے

بھاری بوٹوں کی سخت آوازیں گونجیں۔ اس نے تڑپ کر نگاہیں اٹھائیں۔ سامنے کے مکانات نذرِ آتش ہورہے تھے اور لپکتے ہوئے شعلوں کی لپکتی ہوئی روشنی اس کی کھولی کے اندر سمارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ روشنی جھی کو چھولے، وہ تیزی سے اٹھا تھا اور اسی تیزی سے دروازہ بند کر کے اس نے کھولی میں تاریکی کر دی تھی.....!

کائی

بھڑاک سے دروازہ کھول کر بھوپت اندر داخل ہوا تو گوسائیں کا منہ کسی خود کار آلہ کی طرح خود بہ خود کھل گیا۔ تیری تو ماں کا... اس کے منہ کی بھری شراب اس کی قمیص پر پھیل گئی۔ جتنا بگڑ سکتا تھا منہ بگاڑ کر اس نے پوچھا۔

''کیا ہے بے...؟''

''گاڑی والا سیٹھ ہے۔ صبح جس لونڈے کا باڈی آئے لا ہے، وہ اس کا کوئی اپنا ہوتا ہے...۔''

''اپنے کی تو ماں کا... اس کو ریٹ بولنا مانگتا نا...۔''

''بولا، پن اس کو زیادہ لگتا ہے۔''

''اس کی تو...،' بڑی مشکل سے اس نے بعد کا لفظ روکا۔ جالے میں لپٹا اور مچھروں کے گو سے لت پت بلب کی میلی رزشنی میں بھوپت نے گوسائیں کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے بیچ کا حصہ بدگوشت کی طرح سفید اور شراب کی کائی لگنے سے دونوں کنارے بڑے بھدے ہو رہے تھے اور وہ جب بھی اپنے ہونٹ کھولتا، لس لس کرتی جھلی سی تن جاتی۔

بھوپت اکثر نگاہیں پھیر لیتا۔اسے متلی سی آنے لگتی تھی۔ابھی بھی وہ دوسری طرف اندھیرے میں آنکھیں گاڑے ہوئے تھا۔گوسائیں نے بیڑی سلگا کرسلسلے دار ہونٹوں کے بیچ دبالی اور کرسی سے اٹھ کراُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ سڑک کے دائیں بازو اندھیرے میں ایک اجلی سی ایمبسڈر کار کھڑی تھی۔جس جگہ گوسائیں، بھوپت کے ساتھ کھڑا تھا وہاں بھی کچھ ایسی ہی تاریکی تھی کہ ان کی آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔گوسائیں نے بھوپت کو اشارے سے گاڑی والے کے پاس جانے کو کہہ کر خود چوکھٹ کے سہارے بیٹھ گیا اور اندھیرے میں گاڑھا گاڑھا دھواں اگلنے لگا۔بھوپت کار کی کھڑکی پر جھکا اندر والے سے بات کر رہا تھا۔گوسائیں کے پہلوں میں بے چینی سی ہوئی ۔سالا کوئی سرکاری کتا ہوا تو ایسے ہی بوٹی اٹھالے جائے گا۔تھوڑی دیر بعد بھوپت ایک شخص کو ساتھ لے کر آتا دکھائی دیا۔گوسائیں کی آنکھیں آنے والے پر گدھ کی نگاہ کی طرح ٹکی ہوئی تھیں۔کوئی مالدار آسامی تھا۔اس کا چہرہ نچوڑے ہوئے نیبو کی طرح سٹھا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں الجھنیں گردش کر رہی تھیں۔جب وہ قریب پہنچ گیا تو گوسائیں بیڑی کا ٹکڑا اپنے پیروں تلے رگڑ کر اٹھا اور اپنی قمیص سے ہاتھ رگڑتا ہوا بولا۔''دیکھو صاحب...اپن ادھر میں کوئی لفڑا نہیں مانگتا...ابھی اکھا بمبئی میں دنگا بھڑکے لا ہے...اوپر سے بہت کھینچائی ہے ...پولیس میں کیفیت دیے بنا ادھر سے کوئی باڈی نہیں لے جانے کا....پن اپن لوگ کیا کرے...ادھر میں اکھا دن دس بیس باڈی آنا مانگتا...اپن سب کو اپنے بھیجے پر تو نہیں رکھ سکتا ....شناخت اور پولیس میں کیفیت دیتے دیتے باڈی ادھر میں سڑنے لگتا...باس مارنے لگتا ...تم ادھر میں ایک ٹیم رہنے کو نہیں سکتا...ابھی تمہارا اس آدمی کا باڈی مارننگ میں آیا۔کل تک وہ بھی باس مارنے لگتا...تم اس کو ابھی لے جانا مانگتا...ٹھیک ہے، پن....''اس کے ہونٹ کھلے رہ گئے تھے۔ایڈز کے مریض سی پیلی اور بیمار روشنی میں صاف کچھ دکھائی نہیں دے رہا

تھا مگر بھوپت کو لگ رہا تھا کہ گوسائیں کے کائی لگے ہونٹ جو کھلے ہیں، ان کے درمیان لس لس کرتی جھلی ضرور تن گئی ہوگی۔ وہ اندھیرے میں بھی اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہ رہا تھا۔ سیٹھ بھوپت کو ایک طرف لے جا کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا تھا۔ واپس آ کر بھوپت نے آنکھوں سے گوسائیں کو سمجھا دیا کہ بات طے ہوگئی ہے۔ سیٹھ واپس اپنی کار کے پاس چلا گیا اور لوٹا تو اس کے ساتھ آخروٹ کے چھلکے کی رنگت والی ایک عورت بھی تھی۔ وہ نروس دکھ رہی تھی اور بار بار اپنی ناک سڑک رہی تھی۔ گوسائیں اندراج رجسٹر میں ان کی کیفیت لے کر دستخط کرا چکا تو بھوپت ان دونوں کو لے کر اس طرف بڑھ گیا جدھر ڈار میٹری میں لاشیں رکھی جاتی تھیں۔ یہ ایک کشادہ ہال نما کمرہ تھا جس کے چاروں اطراف ڈراور بنے ہوئے تھے۔ بھوپت نمبر دیکھ کر متعلقہ ڈراور کی تصدیق کر رہا تھا گو کہ اس کام میں اسے کافی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ کمرے میں ٹھنڈی ٹھنڈی سہرن پیدا کر دینے والی ویسی ہی ویرانی تھی جیسا کہ مردہ گھر کے تصور سے آدمی کے اندر بھر جاتی ہے البتہ ایر کنڈیشنز کی ہلکی گھنگھناہٹ اور عورت کے سڑ سڑ کرنے کی آواز ماحول کو اور پر آسیب بنا رہی تھی۔ عورت بہت ہی دھیمی آواز میں اپنے ساتھ والے مرد سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بظاہر وہ مایوس تھی مگر بار بار رومال سے ناک صاف کرنے سے اس کی بڑی الا ئچی جیسی ناک چیری کے دانے جیسی سرخ ہوگئی تھی، جس سے وہ بڑی پر کشش لگ رہی تھی۔

نمبر مل جانے پر بھوپت نے ڈراور کھینچ کر لاش باہر نکال لی۔ لاش کو دیکھ کر جہاں وہ اپنے سینے کو کراس کرنے لگا کہ یہ اس کا روز کا معمول تھا، وہیں لاش لے جانے آئے ان دونوں مرد عورت کے پیچھے کی ہڈیوں میں چینٹیاں رینگتیں محسوس ہوئیں۔ ان کی پیشانی چھوٹی چھوٹی بوندوں سے چپچپا اٹھیں جب کہ کمرہ ایر کنڈیشنر سے سرد تھا۔ عورت نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا اور سسکنے لگی۔ تب تک بھوپت لاش کو اسٹریچر پر ڈال چکا تھا۔ وہ

دونوں اسٹریچر کے ساتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے ڈراور سے لاشیں نکل کر ڈیگ بھرنے لگی ہوں۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے اور آنکھوں میں خلا اتر آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھوپت ان دونوں کو چلتا کر کے لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں کئی ہرے ہرے پتے پھسل رہے تھے۔ پتوں کو دیکھ کر گوسائیں کی آنکھوں میں کئی بوتل کا نشہ چڑھ آیا۔ بھوپت کے ہاتھوں سے پتے جھپٹ کر وہ پاگلوں کی طرح چومنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے گندے لسلسے دار تھوک سے پتے گیلے پڑ گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی بڑی قسمت والا وہ گوسائیں چھوٹی ذاتی کا کیسے ہو گیا کہ اسے اس مردہ گھر میں کیئر ٹیکر کی نوکری کرنی پڑی۔ پھر شاید اسے یہ راز سمجھ میں آ گیا۔ وہ نشے کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

''اوپر والے، تو بڑا کارساز ہے رے... اپن تیری لیلا اچھی طرح سمجھتا ہے.... بس تو اپن کو اگلے جنم میں، پھر اس کے بعد کے جنم میں، پھر اس کے بعد کے جنم میں یعنی ہر جنم میں چھوٹی ذاتی کے ماپھک ہی پیدا کرنا... اپن کی تو چلتی کر دی تو نے اوپر والے... بس ایک اور بڑا دنگا کرا دے اس شہر میں... پھر کوئی مسجد تڑوا دے یا کسی مندر میں گومانس پھیکوا دے ... یہ کام تو تو کسی سے بھی کروانا مانگتا... دیکھ سن، ایک رنڈی، رنڈی ہو کر تیری پوجا کرتا تو دھرم کے نام پر ہی نا.... پھر کوئی دھرم کے نام پر یہ کام کیوں نہیں کر سکتا... اور پھر آخر تو اب ان جگہوں پر رہتا تو ہے نہیں... تیرے بندے تو اب انہیں دوسرے مقصد کے لیے کام میں لاتے ہیں... پھر کیوں تو اپنا بھرم بنائے رکھنا مانگتا ہے... اسی بہانے تیرے کچھ بندوں کا بھلا ہو جائے گا... اپن جانتا ہے تیری درشٹی اپن پر رہی ہے... پہلے تو اپن کو ٹھرا پلاتا... اب اپن کو دیشی باٹلی بندوبست کیے دیلا ہے... بس ایک بار پھر ہندو مسلم کا بھیجا پھرا دے۔ کوئی لفڑا کرا دے، اپن تیرے کو انگریزی میں نہلا دے گا... ہاں اپن تیرے کو انگریزی میں نہلا دے گا... تیری سپتھ ....'' رفتہ رفتہ اس کی تیز ابی آواز ڈوبتی گئی تھی اور وہ ٹیبل پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

دوسری صبح گوسائیں کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اس نے باٹلی اٹھائی مگر اس میں ایک بوند بھی باقی نہیں بچی تھی۔ رات جانے کب وہ پوری بوتل خالی کر گیا تھا۔ اس کا من جھلا گیا اور یکلخت ہونٹ کھل گئے... تیری تو ماں کا... وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ دو فرلانگ کی دوری پر اس کی سب سے پسندیدہ جگہ گاما کی بھٹی تھی۔ گاما اسے عزت دار کسٹمر مانتا تھا اور دور ہی سے سلام ٹھوکتا تھا کیوں کہ گوسائیں بالکل نقد رام تھا۔ کبھی ایک پیسے کا ادھار نہیں لیتا تھا۔ گامانے لونڈے کو آواز دی کہ وہ گوسائیں استاد کے لیے دو کڑک باندھ کر لے آئے اور اپنے پاس سے اس نے کھلی ہوئی باٹلی اسے شوق فرمانے کے لیے پیش کر دی۔ ساتھ ہی اس نے تلی ہوئی مچھلیوں کی پلیٹ بھی رکھ دیا۔ گوسائیں جیسے گاہکوں کے لیے وہ کچھ خاص انتظام رکھتا تھا۔

''بولو استاد، تمہارا دھندہ کس ماپھک چل رہا ہے...؟''

''سب اوپر والے کی درشٹی ہے گامے... تو سنا تیرے دھندے کا کیا ہے...؟''

''استاد سنا ہے کل رات بھنڈی بازار والے علاقے میں پھر بلوا ہو گیا ہے۔''

گوسائیں کے ہاتھ سے باٹلی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ ''کیا بولا رے گامے... پھر سے تو بول...'' گوسائیں کی آنکھوں میں ایک دم سے شرارے بھر گئے تھے اور منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔ اس نے غٹا غٹ باٹلی حلق میں انڈیل لی۔ آستین سے منہ رگڑتا ہوا بولا... ''چار بندھوا گامے... چار، اور سن اب تو انگریزی بھی رکھا کر... اوپر والے کی درشٹی ہے سب... اس نے گوسائیں کی سن لی رے... اس نے گوسائیں کی سن لی...'' اس کے ہونٹوں کے کنارے سے شراب کی پھین بہہ چلی تھی جس سے ہونٹوں کی بدصورتی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ وہاں سے تقریباً جھپٹتا ہوا مردہ گھر آیا تھا۔ بھوپت ابھی تک نیند کی دیوی سے لپٹا ہوا تھا۔

''چھوپتے... تیری تو ماں کا...'' اس نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

بھوپت کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''اپنی ماں کا دلال ہوگا تو...دھتکار ہے مادر...سونے بھی نہیں دیتا۔'' بھوپت نے بھی آڑے ہاتھوں لیا اسے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو گوسائیں گالیاں ہی گالیاں تھوک دیتا اس کے منہ پر، لیکن اس وقت تو جیسے اسے خزانہ ہی ہاتھ آ گیا تھا۔

''اٹھ بھوپتے اٹھ...جا تھانے جا...ساب سے بولنا اس بار سیزن میں وہ کمیشن کتنا بڑھانا مانگتا...اسی ماپھک اپن ادھر میں ریٹ بڑھانا مانگتا...جا بھوپتے جلدی کر...گوسائیں کے منہ کے چھینٹے بھوپت کے چہرے پر پڑ رہے تھے اور وہ من ہی من گوسائیں کی ماں بہن کی کر رہا تھا۔ آخر کار وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام تک دونوں ہی لاشوں کا انتظار کرتے رہے تھے مگر اب تک ایک بھی لاش مردہ گھر میں نہیں آئی تھی البتہ شام کو تھانے کا صاحب ضرور آیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ بھنڈی بازار کے بلوے میں اب تک کسی کے بھی مرنے کی خبر نہیں ہے۔ کچھ مکان اور دکانوں میں آگ لگنے کے علاوہ ایک آدھ چھرے بازی کے واقعات پیش آئے ہیں۔ سن کر گوسائیں اور بھوپت کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ بدحواسی کے عالم میں گوسائیں سوچ رہا تھا کہ چھرا کسی کے دل میں کیوں نہیں لگا...اس کی ماں کا...کیسے کیسے اناڑی بھی آ جاتے ہیں اس میدان میں....

بہرحال بھنڈی بازار کا بلوا شانت ہو گیا تھا۔ کئی روز یوں ہی گزر گئے۔ چاروں باٹلیاں کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ گوسائیں کا حلق خشکی سے چھلا جا رہا تھا اور زبان اینٹھ رہی تھی۔ جیب میں اب کانی کوڑی نہیں بچی تھی۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسی بوڑھی رنڈی کے بدحواس دلال کی ہوتی ہے۔ اس نے بھوپت سے کہا کہ جا کر گاما کی بھٹی سے دو باٹلیاں ادھار لے آئے۔ بھوپت چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹ کر بولا کہ گاما بنا روکڑا ایسے باٹلی

دینے کو تیار نہیں۔اس نے بولا کہ اپن بیوڑوں کو ادھار دے سکتا ہے پن دلالوں کو نہیں۔سن کر گوسائیں کے پیٹ سے ایک بھدی سی گالی امڑی مگر باہر آتے آتے چھلے ہوئے حلق میں اٹک گئی۔اس کے کائی لگے ہونٹ جس کی جھلی اب سوکھ گئی تھی،صرف پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ گوسائیں پاگل ہوا جارہا تھا اور وہ پاگل ہو گیا۔گاما کی ماں بہنوں کو پہلے تو اس نے ننگا کیا، پھر اس کی ماں پر اور کبھی اس کی بہن پر چھلانگیں لگانے لگا۔جب بری طرح ہانپ گیا تو اپوزیشن لیڈروں کی ماں بہن کی کرنے لگا۔''یہ اپوزیشن والے بھی مادر....جانے کہاں مر گئے ہیں...کیا کر رہے ہیں وہ...کیا انہیں معلوم نہیں کہ شہر میں دنگا کئی دنوں سے رکا ہوا ہے ...نکمّے سالے،کرسی پر ہوتے ہیں تو کچھ نہیں کرتے،کرسی سے نیچے ہوتے ہیں تو کچھ نہیں کرتے...کرسی کے لیے تو کرسی سے نیچے والے،نیچے سے نیچے چلے جاتے ہیں....اور یہ معمولی سا دنگا نہیں کرا سکتے...آخ تھو...''اس کے کلیجے میں نفرت اور غصے کی باڑھ اس طرح موجیں پھیلا رہی تھی کہ اس کا چہرہ کئی طرح سے بن بگڑ رہا تھا۔گاما نے آج اس کی جو بےعزتی کی تھی،اتنی بڑی بےعزتی تو اس کی کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا،اس طرح کہ موقع ملتے ہی گاما کی گردن اینٹھ کر بنا برف کی ڈارمیٹری میں ڈال دے گا اور اس کی ماں بہنوں سے اس کی لاش کا معاوضہ وصول کر لے گا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔وہ یہاں لمحہ لمحہ گل رہا تھا اور ادھر گاما اطمینان سے اپنی بھٹی چلا رہا ہوگا...اس کے چہرے پر ایک چمک ہوگی اور ہونٹوں پر مسکان رقص کر رہی ہوگی۔گوسائیں کے اندر بلیڈ سے دھاردار کچھ اترتا محسوس ہوا۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ گاما کی مسکراہٹ اس کے گالوں پر زناٹے دار تھپڑ بن کر پڑ رہی ہو۔پھر وہ خود کو ٹٹولنے لگا۔کیا اس میں ایسا کچھ بھی نہیں۔کیا وہ اتنا ہلکا ہے گاما کی نظروں میں کہ دو باٹلیاں اسے ادھار نہیں مل سکتیں؟اس نے اکھا عمر اس کے یہاں سے نقد روکڑا دے کر باٹلی لی تھی...کبھی ایک پیسے کا ادھار نہیں لیا تھا اور کیسا وہ اسے دیکھتے ہی سلام

ٹھوکتا تھا۔ اسے لگا کہ گاما کا سلام بھی درحقیقت اس کے منہ پر طمانچہ ہی ہوتا تھا۔ وہ سلام نہیں اس کے لیے گالیاں ہوتی تھیں گاما کے لفظوں میں....گاما کے یہ الفاظ کہ اپن بیوڑں کو تو ادھار دے سکتا ہے پن دلالوں کو نہیں... بار بار نشتر کی طرح اس کے دل میں چبھ رہے تھے۔ سوچتے سوچتے اس کے جسم کی طنابیں تن گئیں اور چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ غصہ اور بے عزتی کی شدت سے اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ بھی تھوک کے ساتھ گڈمڈ ہو کے رہ جاتے تھے اور پھین نکل کر اڑنے لگتی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے..."اوپر والے! لوگوں کا کہنا ہے کہ تو ہی اجت دیتا ہے اور تو ہی جلت.... بس ایک چانس دے دے کہ اپن اس گامے کی ماں کی اوقات بتا دے....اوپر والے، تو نے اپنی درشٹی اپن پر سے ہٹا کیوں لی...؟" اس کی آواز گلوگیر ہو آئی اور کہتے کہتے رو پڑا وہ۔

ہاں گوسائیں رو رہا تھا....

اور اوپر والے نے ہمیشہ کی طرح اس کی سن لی۔ شہر میں پھر دنگا بھڑک اٹھا کہ اسے بھڑکنا ہی تھا۔ گوسائیں خوشی سے ناچ اٹھا۔ ایسی ایسی حرکتیں کرنے لگا کہ اس کی دماغی صحت مشکوک لگنے لگی۔ اس عالم میں اس نے جانے کتنی ہی بار بھوپت کا منہ چوما ہوگا۔ بھوپت کو متلی آنے لگتی۔ گوسائیں کے تھوک سے اس کا چہرہ چپ چپ کرنے لگتا۔ وہ گوسائیں کی خوشی میں پوری طرح شامل تھا مگر اس کے ہونٹوں کا لجلجا پن اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

دنگا شباب پر تھا۔ مکان جل رہے تھے۔ دکانیں لوٹی جا رہی تھیں۔ مریم اور سیتاؤں کو ننگا کر کے اُن کی چھاتیوں اور دوسرے انگ کاٹ لیے جا رہے تھے۔ بیٹے کے سامنے ماں باپ کی آنکھوں میں گرم سلاخیں اتاری جا رہی تھیں، اور ماں باپ کے سامنے بیٹوں کے سینے میں لوہے کے ٹکڑے پیوست کیے جا رہے تھے۔ ایک آہ تھی، ایک شور و غوغا، ایک فغاں تھا کہ ہر سو بازگشت کر رہا تھا۔

گوسائیں صبح سویرے اندراج رجسٹر لے کر ٹیبل پر جم جاتا۔

نام....؟

شرافت حسین

باپ کا نام...؟

رفاقت حسین

عمر...؟

۶۴ سال

مرنے والے سے رشتہ.....؟

بیٹا

کیفیت.....؟

دنگائی گھر میں گھس آئے۔ گھر کو آگ لگا دی اور اسے گولی ماردی۔

''ٹھیک ہے یہاں دستخط کرو اور....'' گوسائیں کے ہونٹ کھلے رہ جاتے۔

نام...؟

رتن لال

باپ کا نام..؟

پنا لال

عمر...؟

۳۵ سال

مرنے والے سے رشتہ...؟

بھائی

کیفیت...؟

کل شام بچی کا دودھ لینے بازار گیا اور چھرا مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

''ٹھیک ہے۔ یہاں دستخط کرو...'' گوسائیں روپے تہہ کر کے اپنی جیب میں ٹھونستا جاتا اور پھو پت سامنے والے کو لے کر ڈارمیٹری کی جانب بڑھ جاتا۔

جب لگا کہ ہندوستان کی آبادی ایک دہائی پیچھے کے برابر پہنچ گئی ہے اور اس کی پچاسی کروڑ جنتا کا پیٹ بھرنے کے لیے لاشوں کا کھیت لہلہا اٹھا ہے تو دوسرے دن شہر میں فوج طلب کر لی گئی تھی اور حالات قابو میں آ گئے تھے البتہ جلے ہوئے مکانوں کا دھودھو کرتا دھواں اب بھی آسمان چھور ہا تھا اور فضا میں جلی ہوئی انسانی گوشت کی چیروندھی چیروندھی بو اب بھی بسی ہوئی تھی۔

دن بھر کام کرتے کرتے گوسائیں اور بھوپت نڈھال ہو گئے تھے۔ ڈارمیٹری میں اب صرف ایک لاش بچی رہ گئی تھی۔ یہ ایک عورت کی لاش تھی جس کے سینے میں بارود بھر دیا گیا تھا۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ اس کا بھی آسامی آجائے تو آج کی آمدنی کا حساب کیا جائے۔ پھر بھٹی میں چل کر گاما کی... گاما کا خیال آتے ہی گوسائیں کے ہونٹ پھڑ کنے لگے اور گالیاں تے دست کی طرح باہر آنے لگیں۔

شام دھوئیں کے ساتھ مل کر گاڑھی ہو رہی تھی جب کچھ لوگ اس عورت کی لاش لینے آئے۔ گوسائیں نے دیکھا، ان میں ایک تلک دھاری تھا اور ایک ڈاڑھی والا... ایک کے سر پر پگڑی تھی اور ایک کے گلے میں کراس جھول رہا تھا۔ یہ جماعت اس عورت کی لاش طلب کر رہی تھی۔ گوسائیں کی سمجھ میں کچھ آ رہا تھا اور کچھ نہیں بھی۔ عاجز آ کر اس نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اسے ان باتوں سے کیا مطلب؟ اس نے باٹلی حلق میں انڈیلی اور رجسٹر کھول کر بیٹھ گیا۔

نام...؟

جماعت کے لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

مرنے والے سے رشتہ...؟

ایک بار پھر سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں۔

کیفیت...؟

دنگے میں پھنسے ہوئے لوگوں کو محفوظ جگہوں پر پہنچا رہی تھی کہ اس کی جان چلی گئی۔

''ٹھیک ہے یہاں دستخط کرو اور...'' گوسائیں کا منہ کھلا تھا لیکن اس کے منہ میں کچھ نہ آیا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اپنے خالی منہ کے لعاب چاٹتا ہوا اس نے انکار میں سر ہلایا۔

جماعت نے لاش دے دینے کی گزارش کی۔

اس نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

جماعت رخ بدلنے لگی۔ گوسائیں کی پیشانی پر بوندیں چھچھا آئیں۔ جماعت کے من میں احتجاج پلنے لگا۔ وہ لاش لے جانے کا کوئی معاوضہ نہ دے سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ گوسائیں کوئی فیصلہ کر پاتا، بھوپت نے اشاروں میں اس سے کچھ کہا اور ڈار میٹری کی جانب بڑھ گیا۔ وہ لوگ شانت ہو گئے تھے جس میں ان کا انتظار بھی شامل تھا۔ گوسائیں باٹلی کھول کر کرسی پر جم گیا۔ اس نے یہ باٹلی نقد پیسے دے کر منگوائی تھی مگر اس کے من میں ابھی ابھی پچھلے دنوں گاما کے ساتھ پیش آئے واقعے کی تلخی بھری ہوئی تھی۔ اس نے پہلا گھونٹ اس طرح گھونٹا جیسے اپنی بے عزتی کی کڑواہٹ گھونٹ رہا ہو۔ دھیرے دھیرے اس پر نشے کی یلغار ہونے لگی اور چہرہ کئی طرح سے بننے بگڑنے لگا۔ اسی روکڑے کی خاطر تو گاما نے اس کی بے عزتی کی تھی۔ یہ وہ کیسے بھول سکتا ہے؟... گوسائیں کبھی نہیں بھول سکتا... اور یہ ملا پنڈت اپن کو ٹھینگا دکھانے آئے لا ہے۔

اس نے ایک ہی سانس میں نصف بوتل خالی کر دی۔

''مت دو...بھوپت بھی وصول لے گا اپنا ریٹ ...'' اس کے شعور پر لاشعوری کی تہہ چڑھنے لگی۔ ''دھیرے دھیرے اس کے کپڑے اتار بھوپت ....'' جیسے جیسے کپڑے اترنے لگے اس کے جسم کے عضو جاگنے لگے۔ ''دیکھ تو اس کا جسم کتنا سوندھا سوندھا ہے...اور اس کی چھاتیوں کو تو دیکھ جیسے کسی مندر یا مسجد کے گنبد ہوں....'' اس کے اندر کسی پرندے نے پر پھڑ پھڑائے۔ ''ہاں ٹھیک سے زمین پر لٹا دے...اب اس کی ٹانگوں کو پھیلا... ہاں ذرا سا اور ایسے...یہ سالی ہلتی ڈلتی کیوں نہیں...ایک دم سے لاش کے ماپھک پڑے لا ہے...؟''

''لاش...؟''

اچانک اس کا نشہ ایک دم سے کافور ہو گیا۔ اس نے تڑاک سے باٹلی ایک طرف پھینکی اور لپک کر سامنے کے کمرے میں گیا۔ بھوپت اپنے کپڑے اتار رہا تھا۔ ''تیری تو ماں کا...تو تو اپن سے بھی بڑا کمینہ نکلا رے...چل ہٹ مادر... جا لاش ان لوگوں کے حوالے کر دے....'' اپنی آستین سے ہونٹوں کی کائی رگڑتا ہوا اس نے آنکھوں کو مچیایا۔

''اس کی تو ماں کا....''

اس نے کپڑے اٹھا کر ننگی لاش پر اس طرح پھیلا دیے جیسے پوری کائنات کو ڈھانپ دیا ہو۔

مجھے بوڑھا ہونے سے بچاؤ

دسمبر کے کسی دن کی ڈھلتی عمر میں وہ ملا تھا۔

شام کی پیشانی سیندوریا ہو رہی تھی۔اس کے ساتھ دیسی نسل کا ایک چھوٹا سا کتا آگے پیچھے ہو رہا تھا۔ان دونوں کے بیچ زیادہ دوری نہیں رہتی تھی۔ان کو جوڑنے والی بیلٹ بہت چھوٹی تھی۔ایک یا ڈیڑھ میٹر کی۔

''آپ کی ذرا سی کوشش سے کسی اچھی نسل کا کتا تو آپ کو مل سکتا تھا؟''

''ہوں....''اس نے بیلٹ کھینچ کر کتے کو آگے جانے سے روکا تھا۔

''ویسے یہ بھی پیارا ہے،سلم باڈی کا۔رنگ سیاہ اچھا ہے اور اس کے کان تو کافی لمبے ہیں۔''

''آپ نے اس کی ایک خاصیت نوٹ نہیں کی....''اس نے ہاتھ لمبا کر کے کتے کو آگے جانے دیا۔

''کیا؟''

''اس کی پیشانی پر بھورے رنگ کا جو داغ ہے،وہ اس کے پورے سیاہ جسم پر بڑا اچھا

لگتا ہے۔''

میں نے ذرا سا تیز چل کر کتے کی پیشانی کو دیکھا تھا، پھر مڑ کر اُسے بھی۔

''آپ نے اس کا کوئی نام تو رکھا ہوگا؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''دراصل یہ میری بہو کو پسند نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''اس نے ایک بار میرے پوتے کو زخمی کر دیا تھا۔''

''آپ رہتے کہاں ہیں؟''

وہ خاموش چلتا رہا تھا۔ گردن گھما کر اور پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر ایک طرف دیکھا تھا۔ ''ادھر ہی، یہ سڑک وہاں سے ادھر ہی جاتی ہے۔''

پھر ہم لوگ خاموش چلنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا تھا۔

''آپ جوان ہیں۔ آپ کو سردی کم لگتی ہوگی؟'' شاید اس کے پاس بات کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ صرف اس لیے کرتا تھا کہ خاموشی کے غیر مہذب لمحات پاؤں نہ پساریں۔

''اسے بھی سردی نہیں لگتی۔'' اس نے اپنے کتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''سردی تو سب کو لگتی ہے۔''

اس نے ہنستے ہوئے مجھے دیکھا تھا۔

''تعجب ہے، آپ کو سردی لگتی ہے؟ جوان رگوں میں تو گرمی ہوتی ہے، آگ جیسی۔''

میں نے کچھ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے اس کا ساتھ دیا تھا اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ جلی ہوئی گندمی رنگت سے لگ رہا تھا کہ کبھی وہ گورا بھک بھک آگ رہا ہوگا۔

صاف اور شفاف آنکھوں میں موم کی طرح ہر وقت کچھ پگھلتا رہتا تھا۔ بال پیشانی سے دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ اس طرح جیسے کانٹوں کے بجائے کاٹھ کی تیلی پر سوئٹر بننا سیکھنے والی گاؤں کی نئی نئی کسی لڑکی نے اون کو آپس میں الجھا دیا ہو۔ پھیلی ہوئی ناک کے سوراخوں میں سمائی ہوئی جھاڑو جیسی بے ترتیب مونچھوں کو دیکھ کر چھینک آنے لگتی تھی۔

''آں...ں چھی....''

''ارے ارے، آپ کو تو سچ مچ سردی لگ گئی۔'' وہ کتے کو سنبھالتا ہوا پھر ہنسا تھا۔

''آیئے، آپ کو گرم قہوہ پلاتا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف ضد میں دیکھا تھا۔

''ہاں ہاں، بس پاس میں ہی ریستراں ہے۔'' لگتا تھا وہ مجھے تاڑ گیا ہے۔ پھر بھی مجھے شکست دینا اپنا فرض سمجھ رہا تھا۔

''اب ریستراں میں بوڑھے نہیں آتے۔'' پھر ایک بار وہ بیرا کو قہوہ لانے کو کہہ رہا تھا۔

''جس طرح گرم دھوپ والا جاڑا نہیں آتا۔ ٹھنڈی ہوا والی شام نہیں آتی۔ اسی طرح اب بوڑھے ریستراں نہیں آتے...اور جس طرح ستاروں بھرے آسمان اب خواب میں نہیں آتے....''

اس کا کتا میرے پاس آ کر کچھ سونگھنے لگا۔ میں نے اسے چھونا چاہا تو اُس کے چکنے بالوں سے میری انگلیوں میں گدگدی ہونے لگی۔ میں باہر دیکھنے لگا۔ سڑک کی اوٹ میں چھپی دھوپ اس طرح شرمائی کھڑی تھی جیسے پہلی بار سسرال آئے بہنوئی سے شرمائی ہوئی سالی کواڑ سے لگی باتیں کرتی ہو۔

سڑک پر چلتے ہوئے اس کا کتا اڑتی ہوئی مکھیوں میں سے کسی کسی کو منہ سے پکڑنے

کے لیے لپک پڑتا تھا پھرنا کام واپس ہوکراس کے پیروں کو گھوم پھر کر سونگھنے لگتا۔

''آپ کو معلوم ہے، پوری دنیا میں بوڑھوں کی تعداد کتنی ہے؟''

''نہیں۔''

''بہت کم... گھر کے کھانے کی میز پر تو بوڑھے دکھتے ہی نہیں۔ کیا یہ کہیں کسی دوسری ایک جگہ آباد ہونے لگے ہیں؟ کل میرا بیٹا اخبار کی ایک خبر میری بہو کو سنا رہا تھا کہ ہماری سرکار بہت جلد بوڑھوں کو کچھ خاص سہولت فراہم کرنے والی ہے۔ کہیں یہ بوڑھے اخبار ہی میں تو جمع نہیں ہونے لگے ہیں؟ تب تو ٹھیک نہیں ہے۔ اخبار میں تو گرمی ہوتی ہے۔ آپ کو اب بھی سردی لگ رہی ہے؟ نہیں نا؟''

وہ ایک جگہ ٹھہر گیا تھا، جہاں سے راستے ہم دونوں کو الگ کرر ہے تھے۔

دوسرے دن ہم وہیں ملے تھے جہاں سے گذشتہ روز الگ ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا تھا۔

''آپ کو دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے آپ میرے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔''

اس نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی تھی۔ ''یہ دنیا بہت تیز رفتار ہوگئی ہے اور پھر انتظار میں کافی گھٹن بھی ہوتی ہے۔ انتظار نہ کریں۔ کل آپ سے الگ ہونے کے بعد میں گھر نہیں گیا تھا۔ ٹالا برج کے گلورٹ پر کافی دیر بیٹھا رہا تھا۔ اسے وہ جگہ بہت پسند ہے۔'' اس نے اپنے کتے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ''میں گھر دیر سے جاتا ہوں، سبھی لوگ سو جاتے ہیں جب۔ صرف پہلی تاریخ کو ان کے جگے رہنے سے پہلے پہنچنا ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ آج۔''

''شاید آپ اسے لے کر ہمیشہ ادھر آتے ہیں؟'' میں نے اس کے کتے میں دلچسپی لی تھی۔

''عموماً۔''

''جبھی تو یہ تمام راستوں سے آشنا ہے۔''

''اس میں کئی بری عادتیں بھی ہیں۔آپ بے جا تعریف نہ کریں اس کی۔شام کو یہ اکثر چلّانے لگتا ہے۔میرے پوتے کی پڑھائی ڈسٹرب ہوتی ہے۔پانچ سال کا ہے لیکن عمر سے زیادہ ذہین لگتا ہے۔اس کے چلّانے سے میرے بہو بیٹے ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام آرہا ہوتا ہے تو نہیں دیکھ پاتے۔''

''اس نے آپ کے پوتے کو زخمی بھی کر دیا تھا نا؟''

''ہاں،لیکن اس دن قصور میرے پوتے کا ہی تھا۔وہ خواہ مخواہ اس کی سواری کرنا چاہ رہا تھا۔اپنی ماں کا رنگ روپ لیا ہے۔میری بہو کافی بڑے گھرانے سے آئی ہے۔خوب صورت بھی ہے۔میرا بیٹا بھی ماسٹر ڈگری حاصل کیے ہوئے ہے مگر ان دنوں وہ بے روزگار تھا جب اس کی شادی ہوئی تھی۔بہو کے گھر والوں نے لڑکا پسند کرلیا اور فوراً شادی پر مصر ہو گئے۔میری نوکری تھی،اس لیے میں نے بھی نا نہیں کی۔میرا بیٹا بھی اسی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے بضد تھا۔اس کا کچھ افیئر وفیر کا چکر تھا شاید۔''وہ کچھ دیر رک کر ستانے لگا تھا اور میری آنکھوں میں جھانکا تھا۔''تھک جاتا ہوں۔مسلسل کب تک چل سکتا ہے کوئی۔کیا آپ اس سڑک کی سیما بتا سکیں گے؟''

''ارے ہاں،مجھے افسوس ہے کہ کل آپ کو سردی لگ گئی تھی۔کل آپ نے کچھ خاص پہنا بھی تو نہیں تھا۔اچھا کیا جو آپ نے یہ شال ڈال لیا ہے اپنے اوپر۔آپ پر اچھا بھی لگ رہا ہے۔شخصیت میں ایک طرح کا وقار پیدا ہو گیا ہے۔''وہ پھر چلنے لگا تھا مگر اس بار پہلے کی بہ نسبت دھیرے دھیرے چل رہا تھا اور اس کا کتا ہمیشہ اس سے آگے آگے رہ رہا تھا۔

''دراصل،بہو مجھے بھی پسند تھی اور پھر ہمارے گھر کو دو ایسے ہاتھوں کی ضرورت بھی

تھی جو اُس کے بکھراؤ کو سمیٹ سکیں۔ میری بیوی کے مرنے کے بعد گھر میں ویرانی چھا گئی تھی لگ بھگ۔ آپ شاید نہیں سمجھ پائیں۔ بڑھاپے میں بیوی سے لگاؤ کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے ۔ایسے میں تنہائی کا یکبارگی احساس بڑا تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ انسان کے اندر کا نجی مکان کھنڈر ہو جاتا ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا اس میں سے جوانی اُگ رہی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف تیزی سے لوٹ رہا تھا۔ اچانک میرے ہم عمر وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔

''میں اپنی بیوی سے کبھی الگ نہیں رہا۔ بڑھاپے میں بھی نہیں۔ بچپن میں جب کوئی بچہ کسی دن اسکول جانا چاہتا تو وہ اور کسی کی نہیں صرف اپنی ماں کی خوشامد کرتا ہے۔ ''ممی! میں آج اسکول نہیں جاؤں گا، پلیز ....''

''...سنو آج سنڈے ہے، کیا آج ناشتہ کچھ دیر سے نہیں بن سکتا؟'' جب کبھی اسے اپنے پاس، بالکل پاس رکھنے کی خواہش ہوتی، میں اس سے کہتا۔ اب آپ سمجھ سکیں گے کہ جس کے صرف پاس رہنے کی کشش زندگی میں مضبوطی دیتی ہو، اچانک اس کے نہیں رہنے سے کتنا ٹوٹ جاتا ہوگا انسان ... ہے نا... وہ سمٹ کر دائرے سے نقطے میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن انسان خود غرض بھی تو ہے۔ زندگی میں جس سے اتنا اُنس ہوتا ہے، جس کے بغیر جینے کا تصور بھی بے معنی لگتا ہے ...داستانوں کے سوا ایسا کہاں نظر آتا ہے کہ ایک کے مرنے کے بعد دوسرا بھی مر گیا ہو؟ یہ سب ڈھونگ نہیں کیا؟ اتنے کڑاکے کی سردی میں وہ کس حال میں ہوگی، اس سوچ سے بچنا چاہتا ہوں میں، اور یہ... یہ گرم کوٹ پہنتا ہوں۔ انسان جیتا ہے تو اس خلا کو پُر کرنے کی کسی نہ کسی طرح کوشش بھی کرتا ہے اور اسی کوشش میں بہو ہمارے گھر آ گئی لیکن ایک چادر کئی لوگوں کو ڈھکنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی ادھر سے ایک کونا کھینچ لیتا تو ادھر کھل جاتا۔ کبھی کوئی ادھر تانتا تو ادھر کھل جاتا لیکن میری بہو جتنی خوبصورت

ہے، اتنی ہی سمجھ دار بھی ہے۔ اس نے اپنے جوان پتی کے لیے اپنے بوڑھے سسر کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ تجویز مجھے پسند آئی، اور میں نے وہ چادر اپنے بیٹے کو دے دی۔ حتی کے وقت سے پہلے نوکری سے سبکدوش ہونے اور اس جگہ اپنے بیٹے کو مقرر کرانے میں مجھے کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی، ایسے میں میرا پی ایف بھی کافی کٹ گیا۔ افسروں کو خوش کرنا پڑا۔ ماتحتوں کو بخشش دینا پڑی اور مجھے اپنی پنشن کا نصف حصہ بیچنا پڑا۔ لیکن اتنا اطمینان ہوا کہ میرے بہو بیٹے میری دی ہوئی چادر میں آرام سے رہنے لگے۔ پھر میرا پوتا پیدا ہوا تو میری بہو نے ایک بار پھر اپنی سمجھداری کا ثبوت دیا اور اس نے پھر ایک تجویز رکھی، مجھے اس کی یہ تجویز بھی پسند آئی اور میں نے اپنی پنشن کا ایک اور حصہ بیچ کر اپنے پوتے کے نام سے بینک میں ایف ڈی کرا دیا۔ اب میرے بیٹے کو میرے پوتے کے مستقبل کے بارے میں بھی زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی عمر کے ساتھ وہ پیسہ بڑھتا ہی جائے گا اور جب وہ جوان ہو جائے گا تو اس پیسے سے کسی چادر کا بندوبست کر لے گا۔'' وہ چند لمحوں کے لیے چپ ہوا تھا۔ میری طرف دیکھا تھا پھر چلنے لگا تھا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ ہماری سرکار نے یہاں کے بوڑھوں کے لیے کئی کئی منصوبے تیار کیے ہیں۔ جیسے انہیں ضعیف العمری پنشن دینا، مفت علاج سینٹر قائم کرنا اور لاوارث بوڑھوں کے لیے لوجنگ کا انتظام کرنا وغیرہ...''

اس نے رک کر ایک دکان سے اپنے کتے کے لیے بسکٹ خریدا تھا اور سیدھی سڑک کی طرف جانے کی بجائے پارک کی طرف مڑ گیا تھا۔ گھاس پر بیٹھ کر وہ کتے کو بسکٹ کھلانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ مجھے بھول گیا تھا شاید۔ وہ اپنے کتے کو بسکٹ کھلانے میں منہمک رہا۔ اچانک اس نے اپنی سکڑی ہوئی گردن اٹھا کر کہا۔

''آپ کو تعجب نہیں ہوتا... اب بوڑھے کہیں نظر نہیں آتے؟'' اس کے اچانک اس

سوال سے میں جھلا سا گیا۔ میرے کچھ بولنے سے قبل پھر اسنے کہا۔ ''تصور کیجئے کہ دنیا میں ایک بھی بوڑھا نہیں ہو، تب کیسا لگے گا؟ یا پھر یہ سوچئے کہ ایک بھی جوان نہیں ہو تب...؟'' میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ہنسا تھا۔ ''آپ کو میرے دماغ کی صحت مشکوک لگ رہی ہے نا؟ چھوڑیے جانے دیجئے۔ صرف یہ سوچئے کہ دنیا میں اگر صرف کتے ہی کتے ہوں تو کیسا لگے گا؟ ہاں اس میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ پلا... جوان... بوڑھا... ہر عمر کے کتے...'' مجھے لگا کہ میری آنکھیں اپنی جگہ سے باہر آجائیں گی۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھا ہے، آپ کو سوچنا چاہیے۔ جوان سوچ بہت کچھ کر سکتی ہے۔''

وہ اپنے کتے کو بسکٹ کھلا چکا تو وہ خوش ہو کر گھاس پر کھیلنے لگا تھا۔ اسی درمیان ایک نئی بات ہوئی تھی۔ پارک کی دوسری طرف کیاریوں کے بیچ سے ایک پیارا سا بچہ وارد ہوا تھا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے ہوا میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کے کئی بار ایسا کرنے پر کتا اس کے ہاتھ نہیں لگ سکا البتہ بوڑھے نے کتے کی بیلٹ جلدی سے کھینچ کر اسے اپنے قریب کر لیا اور اسے اپنی بانہوں میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اس کی آنکھیں ایک دم سے خوف زدہ ہو اٹھی تھیں اور وہ چوکنا ہو کر اپنی چکنی آنکھوں سے آس پاس دیکھنے لگا تھا۔ بچے نے ایک بار پھر کتے کو ہمکنے کی ضد بھری کوشش کی تو وہ اسے اپنے سے دور ہٹانے لگا۔ ''نہیں، ہٹو... چلے جاؤ یہاں سے... یہاں نہیں آؤ... ہا... دھر... دھر...'' اُسے کھانسی کا دورہ پڑا تھا اور اس کی آنکھیں بھیگ کر لت پت ہو گئی تھیں۔ وہ زمین کے سہارے بیٹھ کر گہری گہری سانس لینے لگا۔ اس کی سہمی ہوئی نظریں اب بھی اس جانب اٹھ رہی تھیں جدھر سے بچہ وارد ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بچے کے ماں باپ آکر اسے لے گئے تو وہ رفتہ رفتہ

پرسکون ہوا لیکن اب بھی وہ کتے کو اپنی بانہوں سے نیچے نہیں اتار رہا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھائے ہوئے پارک سے باہر آ گیا۔ اس کے سر پر اپنی ہتھیلی پھیرتے ہوئے وہ اسے چمکار رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں الجھا دیں۔

''جانتے ہیں یہ اسے زخمی کر دیتا تو کیا ہو جاتا...؟''

میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے اس طرح الجھ گئی ہیں کہ نکالنے کے ساتھ ہی دیدے بھی نکل کر باہر آ جائیں گے۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ زچ ہو کر بولا۔ ''آپ کچھ نہیں جانتے۔ یہی تو تعجب ہے کہ آج کا نوجوان کچھ بھی نہیں جانتا۔ جب کہ اسے جاننا چاہیے کسی بوڑھے سے زیادہ۔'' اب وہ سڑک کی سیدھ میں چلنے لگا تھا۔ ''میں یہ بھی سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے پاگل یا کچھ اسی طرح کا سمجھ رہے ہیں۔ میری بہو بتا رہی تھی کہ کتے کسی کو زخمی کر دیں تو وہ انہیں کی طرح بھونکنے لگتا ہے اور کتوں کی بہت ساری خصلتیں اس میں پیدا ہو جاتی ہیں۔''

''کیا آپ کے پوتے کے ساتھ ایسا ہوا تھا؟'' مجھے حیرت ہوئی کہ بولتے ہوئے مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی اور میں نے محسوس کیا کہ میں آسانی سے بول سکتا ہوں۔

''نہیں، اسے صرف بخار ہوا تھا۔''

''آپ نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا؟''

''میرے پڑوس میں ہی ایک کتیا نے کئی بچے جنے تھے۔ مجھے اس کا رنگ زیادہ پسند آیا۔ اس کے رنگ کی تو آپ نے بھی تعریف کی ہے اور جانتے ہیں ان میں سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟'' اس بار پھر وہ اپنی آنکھیں مجھ میں اتار رہا تھا لیکن میں ہوشیاری سے اس کا وار بچا گیا۔ عجیب سی راحت محسوس ہوئی۔ وہ ہنسا تھا۔ ''ان میں یہ تشخیص کرنے کی قوت نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد کہاں پل بڑھ رہی ہے اور کس حال میں ہے؟''

''لائیے، اسے تھوڑی دیر میں اپنے ساتھ لے چلتا ہوں۔'' میں نے یونہی پیش کش کی۔

''نہیں، تب آپ اس کے ساتھ نہیں چل سکتے یا یہ آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ آپ نے کبھی کسی جوان آدمی کو کتے کے ساتھ یا کسی کتے کو جوان آدمی کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھا ہے؟ امیر گھروں میں آپ نے دیکھا ہوگا بڑے بڑے بالوں والے چھوٹے چھوٹے کتے ہوتے ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی بیلٹ بھی کسی بوڑھے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے، پہلے فیشن تھا مگر اب تو جیسے بوڑھے ہاتھوں اور کتے کی بیلٹ کا ایک تعلق سا بن گیا ہے جیسے دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہوں۔ آپ اس طرح غیر یقینی سے مجھے کیوں گھور رہے ہیں۔ آیئے آپ کو ایک منظر دکھاتا ہوں۔'' وہ اسی سڑک سے ہوتے ہوئے پارک کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہاں مختلف لوگ مختلف قسم کے کتے لیے اپنے ساتھ ٹہل رہے تھے اور اتفاق کی بات کہ وہ سب بوڑھے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں مسکرائی تھیں۔ وہ سیمنٹ کی بنی ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے کتے کے بالوں میں کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر اُس کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں۔ میں نے کہا۔

''آپ ہنستے ہیں تو عجیب لگتے ہیں۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' وہ بغیر نظریں اٹھائے دھیرے سے بولا تھا۔

''دراصل آج مہینے کی پہلی تاریخ ہے نا، آج کے دن میں اپنی ہنسی چھپا نہیں پاتا۔ دراصل آج میری اپنے بیٹے سے ملاقات ہوتی ہے۔ ویسے بھی آدمی کو مہینے میں ایک بار تو ہنس ہی لینا چاہیے۔''

میں اسے کس نظر سے دیکھ رہا تھا مجھے پتا نہیں تھا۔

''آپ کا بیٹا کسی دوسری جگہ رہتا ہے کیا؟''

''نہیں، پاس ہی رہتا ہے... مگر پاس رہنا اور ملنا دونوں متضاد باتیں ہیں نا؟ میں

سمجھتا ہوں آپ سمجھ نہیں پا رہے ہیں یا پھر میں آپ کو سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ دراصل اس میں قصور آپ کا یا میرا نہیں ہے۔ Generation Gap نے انسان کو یہی ابہام تو دیے ہیں۔ آدمی چاہ کر نہیں سمجھ پاتا یا پھر کوشش کرتے ہوئے سمجھا نہیں پاتا۔'' اس کی ہنسی کچھ اور گاڑھی ہو گئی تھی۔ ''آپ ایک بار پھر مشکوک ہو رہے ہیں شاید۔'' پھر اس نے میرا دھیان دو بوڑھوں کی جانب مبذول کرایا تھا جو کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

''دیکھیے، ان میں ایک بوڑھا پاگل ہے۔ اسے کوئی کتا نہیں مل سکا ہے۔ وہ کسی کے کتے پر بھی اپنا حق جما لینا چاہتا ہے۔ ایک دفعہ میرے کتے کو بھی اپنا کہہ کر جھگڑ پڑا تھا اور آپ ہیں کہ اتنی دیر سے مجھے ہی پاگل سمجھ رہے ہیں۔''

پارک میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اکثریت بوڑھوں کی تھی اور ان کے ساتھ کے کتوں کی مگر یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ کوئی بوڑھا کسی دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتا تھا۔ جیسے سب اپنے اپنے کھنڈر کی اینٹیں چننے میں مصروف تھے۔ ٹہلنے کے دوران اگر کبھی ایک دوسرے کے سامنے آ بھی جاتے تو ان کی آنکھوں میں کسی طرح کا کوئی شائبہ نہیں لہراتا تھا۔ عموماً ان کی آنکھیں ریت کے ٹیلے جیسی خشک اور چہرے فصل کٹے کھیت کی طرح سپاٹ ہوتے تھے۔ ہاں ان کے کتے جب ایک دوسرے سے تعلق کی کوئی پرانی شناخت ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تو وہ پل بھر کے لیے زچ ہو اُٹھتے۔ پھر اپنے کتے کو سنبھالتے ہوئے اپنی راہ کی دوری ناپنے لگتے اور ان کے چہرے پر جلد سفر مکمل کر لینے کی بیزاری پھیل جاتی۔

وہ اب بھی سیمنٹ کی بنی بینچ پر بیٹھا اپنے کتے کے بالوں میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ خالی بوتل کی طرح اس کی نگاہیں کبھی کبھی اٹھتیں اور پھر جھک جاتیں۔ وہ اپنے کوٹ کی آستین سے کتے کا لعاب صاف کر کے اٹھا اور پارک سے باہر جانے والے راستے پر چلنے لگا۔

''تنہائی میں انسان خود کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ سب اسی عمل میں لگے ہیں اور چاہتے

ہیں کہ جلد سے جلد اپنے آپ کو پالیں۔''

وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا مگر اس راستے سے نہیں، جو ایک جگہ ہم دونوں کو الگ کرتا تھا۔ میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جیسے اس کے ہاتھ کی بیلٹ کتے کی گردن میں نہیں بلکہ میری گردن میں بندھی ہو۔

''یہ لوگ اپنی تلاش میں یوں ہی صدیوں تک جیتے رہتے ہیں اور اپنے اندر کے سناٹے سے جوجھنے کے اس عمل میں اگر کوئی کبھی کسی پل کے لیے خود سے ملتا ہے تو وہ صدیوں پر احسان کرتا ہے جیسے۔ آپ نے دیکھا نہیں، ان میں سے بیشتر کے چہروں کے خطوط مشابہت رکھتے ہیں۔ دراصل ان کی اپنی گردن پر کوئی نہ کوئی چہرہ رہے اس کے لیے وہ ایک مقام پر پہنچ کر اپنے چہرے کے نقش ایک ہی قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔'' وہ اپنے گھر کے پاس پہنچ کر رکا اور میری طرف دیکھا تھا اس نے۔

پھر میں اس کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

دو کمروں کی بغل کا ایک سیلن بھرا حصہ جسے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ درمیان میں چکٹ ہورہے بستر پر شاید وہ اپنے کتے کے ساتھ سوتا تھا۔ اس کے کہنے پر میں بستر پر بیٹھ گیا لیکن میرے نتھنوں میں بستر سے نکلنے والی سڑے انڈے جیسی بساندھ پھیلنے لگی تھی۔ میں اپنے جسم کے سینے والے حصے میں ناک چھپا کر اپنے کپڑوں سے خوشبو اخذ کرنے لگا۔ اسی درمیان کمرے میں اس کا بیٹا داخل ہوا تھا۔ اس نے بوڑھے سے الگ، میری ہی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے جس میں سے اچھی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس نے مجھ پر نگاہیں جمادیں جیسے مجھ میں اپنی شناخت تلاش کررہا ہو۔ پھر وہ بوڑھے سے مخاطب ہوا۔

''بابو جی، آج پہلی تاریخ ہے نا... آپ کی پنشن مل گئی ہو تو...؟''

''ہاں ہاں۔'' بوڑھے نے اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی اپنے کوٹ کی جیب

سے کچھ نئے نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیے تھے۔ میں نے دیکھا تھا اس کے بیٹے کے چہرے پر اطمینان کا سایہ لہراتے ہوئے۔ اس نے بھی میرے چہرے پر کسی لکیر کی شناخت کر لی تھی شاید۔ میں گڑ بڑا گیا اور بوڑھے کے کتے میں خود کو مصروف کرنے لگا۔ دروازے کی اوٹ میں آہٹ ہوئی تھی۔ غالباً اس کی بہو تھی۔ سامنے نہیں آنا چاہ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خوبصورت تھی اور سمجھدار بھی۔ اس کے پوتے کی توتلی آواز سنائی دی تھی اور روکتے روکتے اس کی بہو کی مبہم آواز بھی تیر گئی تھی کمرے میں۔

''بیٹے، دادا کو دمّہ ہے...، خلاب خلاب بیمالی...اچھے بیٹے ایسے دادا کے پاس نہیں جاتے۔''

بیٹے نے بڑی ہمدردی سے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ ''بابو جی، آپ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے...آپ کو ڈاکٹر سے رجوع کر لینا چاہیے۔ بس سامنے والے چوراہے کے قریب ہی تو سرکاری ڈاکٹر ہے جو شام کو بیٹھا کرتا ہے۔'' شاید وہ تیز چلنے کا عادی تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بوڑھے نے اپنے کتے کو بستر پر بیٹھا دیا اور میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں اتارنے لگا۔ مجھے کراہیت محسوس ہوئی اور میں وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس کی آنکھیں میری آنکھوں کی طرف حملہ آور ہوتی رہیں۔ میں جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ موڑ مڑتے ہی نگاہ گھر کی طرف اٹھ گئی تھی۔ پتا جی دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ برسوں سے ان کے جسم سے لپٹا ان کا اوور کوٹ ان کی پہچان تھا، لیکن...میں نے قریب پہنچ کر دیکھا، ایک خارش زدہ کتا کچھ سونگھتے ہوئے ان کے آگے پیچھے ہو رہا تھا اور اس کی کافی چھوٹی بیلٹ پتا جی نے اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔

❁❁❁

مونا

اچانک بیس سال بعد مونا کو دیکھا تو یقین نہیں آیا۔

''تم مونا ہی ہونا؟'' گویا میں ہر طرح اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

''کیوں، کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟ مجھے نہیں لگتا کہ ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کو بھول بھی سکتے ہیں۔'' وہ بدستور مسکراتی رہی اور میں اس کے بالوں میں اگ آئی سفیدی کو دیکھتا رہا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس کی خیریت پوچھنی چاہیے اور میں بول اٹھا۔

''کیسی ہو، کب آئیں؟''

''چلو یہاں سے... کسی دوسری جگہ... تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی جانب تقریباً کھینچتی ہوئی بولی اور ہم لوگ لائبریری سے باہر آ کر کیفے کے لان میں بیٹھ گئے۔ دھوپ کمزور اور نسبتاً زرد پڑ چکی تھی اس لیے بڑی بھلی جان پڑ رہی تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے کہا۔

''آج ہی ایئر فرانس کی پہلی بس سے آئی ہوں۔ تم جان کر خوش ہو گے کہ میں اکیلی نہیں آئی بلکہ اپنے دوستوں کو بھی لے کر آئی ہوں۔ مجھے امید ہے تم ان سے ضرور ملنا چاہو

گے۔وہ بہت اچھے ہیں، بہت ہی پیارے... تمہیں بہت خوشی ہوگی ان سے مل کر۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے شوہر اور بچوں کی کمپنی یہاں آئی ہوئی ہے...؟''

''اوہ نو رحمانی، میں نے اس طرح کی کوئی کمپنی نہیں تیار کی ہے۔ میں اپنے ان دوستوں کے ساتھ آئی ہوں جن کے لیے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اپنا کیریئر چھوڑ دیا تھا، تمہیں چھوڑ دیا تھا اور جاپان چلی گئی تھی۔''

''کیا تم اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہو؟'' اس کی وضاحت پر میں نے استفسار کیا۔

''زندگی میں کچھ نہیں رکھا ہے رحمانی۔'' یک لخت وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ میری ماں نے مرتے وقت مجھ سے صرف یہی پرومس لیا تھا کہ اس کی فیملی یتیم نہ ہو۔ تم نہیں جانتے کہ اس وقت اس کے چہرے پر کیسی بے قرار کیفیت تھی۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے الجھ گئی تھیں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کہ میری آنکھوں میں اسے یقین نظر آیا تھا مگر اس کے یاس بھرے چہرے کو دیکھ کر میں نے اسی وقت ارادہ کرلیا تھا کہ اپنی ماں کی آخری خواہش کسی بھی طرح پوری کروں گی۔'' قدرے ٹھہر کر پھر اس نے کہا۔

''اور شادی نہ کرنے کا فیصلہ تو میں نے بہت پہلے کرلیا تھا اور تمہیں معلوم بھی ہے۔ شادی، بچے، یہ سب زندگی کے محض چھوٹے چھوٹے تجربے ہیں جنہیں کبھی میں کرنا چاہتی تھی۔ But it was never my destination، خیر چھوڑو ان باتوں کو، چائے نہیں پلاؤ گے؟''

میں مسکرایا۔ "Oh, you will never change"

''کچھ پرانی عادتیں وقت کے ساتھ اور پرانی ہوجاتی ہیں۔ جیسے اس وقت تمہارے لائبریری آنے کی عادت۔''

میں نے بیرے کو چائے کا حکم دے دیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی، پھر میں نے شکایتاً کہا۔ ''لیکن وہاں جا کر تو تم نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ جیسے سب کچھ فراموش کر دیا ہو۔''

''ہاں رحمانی، میں سب کچھ فراموش کر بیٹھی ہوں۔ میں اپنی دنیا میں گم ہوں۔ کبھی تم اس میں جھانک کر دیکھنا، میری باتوں پر یقین کر لو گے کہ میرے دوست کتنے اچھے ہیں۔ یو نو، میں انہیں لے کر ورلڈ ٹور پر نکلی ہوں۔ ہندوستان بھی جاؤں گی اگر تم ہماری مدد کرو گے؟''

میں اثبات میں گردن ہلا کر بولا۔ ''آرتھر سے ملی ہو؟''

''نہیں۔ اور میں زیادہ سے زیادہ وقت اپنے دوستوں کو دینا چاہتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں وہ تم سے ملتا رہا ہوگا۔ مجھے امید ہے وہ خوش بھی ہوگا۔'' غالباً اس نے اس موضوع سے فرار حاصل کرنا چاہا اور کہا۔

''اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، شادی کب کی؟ کیا اپنی بیوی سے نہیں ملواؤ گے؟''

''تمہارے جانے کے بعد جب میں وطن گیا تو وہیں فرحت سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب تو ہمارے دو بچے بھی ہیں، عماد اور ثریا۔ میں نے انہیں تمہارے بارے میں بتایا ہوا ہے۔ تم ہندوستان جاؤ گی اور ان سے ملو گی تو واقعی انہیں بہت مسرت ہوگی۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں، ہندوستان ایک عظیم ملک ہے مگر وہاں کے رہنما Conservative سے ہوتے ہیں شاید۔ اس کے برعکس وہاں کے عوام سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر وہ سیاسی بحران کے شکار ہوتے رہے ہیں۔ مجھے وہاں کے عوام اور کلچر میں دلچسپی ہے۔ اس کا ایک سبب تم بھی ہو سکتے ہو کہ میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کیا تم وہاں کی چند ایک جگہوں کا پتا نہیں دو گے، جہاں میں اپنے دوستوں کو خاص طور سے لے جا سکوں؟''

چنداں توقف کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیفے سے باہر آ کر کچھ دور خاموش میں

اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ بھی چپ تھی۔ اچانک اس نے کہا۔ ''اب مجھے جانا چاہیے۔ میرے دوست انتظار کررہے ہوں گے۔'' میں نے اسے خدا حافظ کہا اور کل اس کے دوستوں سے ملنے کا وعدہ کر کے اپنی رہائش پر آ گیا۔ بستر پر نیند کسی بھی طرح آنکھوں میں نہیں سما رہی تھی۔ بار بار مونا کا خیال آ رہا تھا۔ کیا یہی اس کی منزل ہے یا اور آگے جانا چاہتی ہے وہ؟ اور پھر میں بیس سال پہلے کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا، جب اس سے میری ملاقات یہیں فرانس میں ہوئی تھی۔

وطن سے ہزاروں میل دور پردیس میں خالی وقت گزارنے کے لیے لائبریری سے اچھی جگہ اور کیا ہوسکتی ہے اور تقریباً میری ہر شام لائبریری میں گزرتی تھی اور اسی طرح ایک شام ایک ہی موضوع کی کتاب اِشیو کروانے کے مرحلے پر متعارف ہوئے تو ہم دونوں دوست بن گئے۔ اچھے دوست کی تلاش کسے نہیں ہوتی اور پردیس میں کوئی اچھا دوست مل جائے تو پھر اجنبیت کا کچھ خاص احساس نہیں ہوتا۔

اس کا نام مونالیزا تھا مگر وہ صرف مونا کہلانا زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس لیے بھی کہ اس نام میں ہندوستانیت کی جھلک ملتی تھی۔ اسے چائے اور کتابیں بہت پسند تھیں۔ میں نے اس کے پچھلے برتھ ڈے پر روسی ادب کی ایک کتاب تحفے میں دی تھی۔ اس وقت اس نے چائے پلانے کا وعدہ لیا تھا اور وعدے کے مطابق ایک شام میں کافی ہاؤس میں اس کا انتظار کررہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئی تو میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ وہ کچھ مضمحل سی لگ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ چوں کہ میں نے چائے پر بلا رکھا تھا اس لیے چلی آئی ورنہ نہیں آپاتی اور ایسے موسم میں تو لحاف ہی سب سے اچھی پناہ ہوسکتی ہے۔ وہ خفیف سی ہنسی تھی۔

وہ چائے دھیرے دھیرے سپ کرتی رہی۔ اس کی قمیص کے سینے پر شیشے جڑے

کڑھائی میں میرا عکس نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کی قمیص بہت خوبصورت ہے تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ اس لیے نہیں کہ اس کی قمیص واقعی خوبصورت تھی بلکہ اس لیے کہ ہم دونوں کی پسند میں حد درجہ یکسانیت تھی۔ اس نے اپنی خوشی کا مزید اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ قمیص اسے بھی بہت پسند ہے۔ پھر اس نے بتایا کی میری دی ہوئی کتاب اسے بہت پسند آئی۔ چوں کہ وہ فرانسیسی تھی اور مصوری میں دلچسپی رکھتی تھی مگر اسے ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک روسی ادیب کو اپنا آئیڈیل مانتی تھی۔

چائے کی خالی پیالی میز پر رکھنے کے بعد اس نے اپنا پرس کھولا اور نیچرل کلر کی لپ اسٹک نکال کر اپنے ہونٹوں پر قلعی کرنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ یہ خوبصورت لڑکی آخر زندگی کو کس طرح جینا چاہتی ہے۔ دونوں ہونٹوں کو مچا کر لپ اسٹک درست کرنے کے بعد اس نے پرس بند کیا اور میری طرف اس انداز میں دیکھنے لگی گویا یہ جو چھوٹی سی پارٹی اس کے اعزاز میں دی گئی ہے اس کے لیے وہ بے حد ممنون ہے اور تھوڑی دیر بعد بیرا جب خالی پیالیاں اٹھا کر لے گیا تو میں سوچنے لگا کہ کیا مونا ایسی ہی زندگی جینا چاہتی ہے جیسے پیالی پر رہ گئے اس کے خوبصورت ہونٹوں کے نشان؟

وہ کچھ تازگی محسوس کرنے لگی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ چاہے تو طبیعت بحال کرنے کے لیے بیئر کا ایک چھوٹا سا پیگ لے سکتی ہے مگر اس نے انکار ہی کیا۔ فرانس میں عمدہ شراب ملتی ہے مگر اسے قطعی ناپسند تھی بلکہ کبھی کبھی سگریٹ پینا ناگزیر سمجھتی تھی وہ۔

اس کی ماں جاپان کی تھی۔ شراب اسے بھی ناپسند تھی۔ اس لیے اس کی کبھی مونا کے باپ سے نہیں نبھی اور وہ اسے چھوڑ کر جاپان چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد تو وہ اور زیادہ پینے لگا تھا۔ بیوی کے جانے کے غم میں یا پھر ہمیشہ کے لیے آزاد ہونے کی خوشی میں لیکن مونا جانتی تھی کہ اس کا باپ اس کی ماں کو بہت چاہتا تھا۔ پتا نہیں شراب اس کی کیسی ضرورت

دوسرے معنی میں کمزوری تھی جس کے لیے اس نے اپنی بیوی کی بھی پرواہ نہیں کی۔

جاپان میں اس کی ماں جسمانی طور پر معذور لوگوں کا ایک ادارہ چلاتی تھی۔ اس کام سے وہ خود کو خدا کے بہت قریب محسوس کرتی تھی۔ جس کے آگے اسے دنیا کی ہر روشنی پھیکی نظر آتی تھی۔ اس نے کئی بار اس کے باپ کو نصیحت کی تھی کہ اپنے دل میں حقیقت کی روشنی اتارنے کی کوشش کرے اور اس بات پر اس کا باپ کئی بار اس کی ماں کے ساتھ جھگڑا تھا اور گالی گلوچ کی تھی۔ اس کی ماں مونا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر اس کے باپ نے قانون کی مدد لے کر اُسے روک لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ مونا کو بھی اپنے ساتھ لے جا کر کوڑھیوں کی خدمت میں نہ لگا دے۔ اور ایک دن سینے میں شدید درد کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

اچانک وہ قدرے بیزار ہو اُٹھی۔ اس کی انگلیاں میز پر پیانوں کی طرح تھرک اٹھیں اور پھر وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

''عورت بھی عجیب شے ہے۔ دوست، محبوبہ یا بیوی، اس کی ایک الگ ہی کشش ہوتی ہے، گو عورت خوشبو کا پیڑ ہے۔ غالباً مجھ سے باتیں کر کے تمہیں ضرور ایک اچھی خوشی کا احساس ہوتا ہوگا۔''

اس نے مرد کی نفسیات کا ایک گہرا مشاہدہ پیش کیا تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ حقیقتاً عورت سے چند گھڑی اچھی باتیں کر لینے سے دماغ کا بہت سارا ٹینشن دور ہو جاتا ہے اور پھر اس سے تو ہر موضوع پر باتیں ہوتی تھیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر چند گھڑی باتیں کر سکتی تھی۔ اسے ہمیشہ اچھی کتابوں کی تلاش رہتی تھی مگر اس کا المیہ تھا کہ اسے اچھی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس ہوتی رہتی۔ طالب علمی کے زمانے میں اپنے ایک ہم عصر طالب علم سے اسے ایک اچھی کتاب حاصل ہوئی تھی۔

وہ روسی ادیب کو اس لیے آئیڈیل مانتی تھی کہ وہ ہمیشہ روح کی گہرائی پیش کرتا تھا۔
کسی کتاب میں وہ اپنی بات کہلوانے کے لیے ایک ایسا کردار پیدا کرتا ہے جو گونگا ہے اور بہرہ بھی۔ اس کے سر پر بال نہیں ہیں اور اس کی ناک لمبی ہے جو ہونٹوں کے آگے تک لٹکتی رہتی ہے۔ لوگ اس کو دیکھ کر ہنستے ہیں اور اپنے لیے تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی گڈھے جیسی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا ہے اور انہیں ہنستا پا کر وہ بھی ہنستا ہے اور جب ہنستا ہے تو اس کا دہانہ پھیل کر کانوں سے جا لگتا ہے۔

مونا کے ساتھ کئی بار مجھے آرتھر سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کو خوشی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔مونا کہتی بھی ہے کہ آرتھر بہت اچھا انسان ہے۔ اس کا پلس پوائنٹ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے اصولوں سے محبت کرتا ہے بعد میں اس سے۔ دوسری طرف اس میں ایک عیب بھی ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ Dry ہے مگر Reserve Nature کا قطعی نہیں۔ اور ایسے لوگ اسے پسند ہیں اور پھر شادی وہ محض ایک تجربہ کے لیے کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ دراصل وہ جاننا چاہتی ہے کہ ازدواجی زندگی کے کیا راز ہیں۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ اس کی ماں کے ساتھ کیا کیا دشواریاں رہی ہوں گی اور اس کا باپ کیوں کر اُس کی ماں کے ساتھ نباہ نہیں کر سکا ہوگا۔ یہ تمام باتیں اس نے آرتھر کو بھی بتائی تھیں تا کہ وہ ازدواجی زندگی سے منسلک ہونے کے بعد ان تمام باتوں کو سمجھنے میں اس کے ساتھ تعاون کر سکے۔ وہ اس کے ذریعہ ان حالات کی نفسیات کو جاننا چاہتی تھی۔

ایک شام لائبریری میں وہ ملی تو اس کے چہرے سے اداسی ٹپک رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں شدید بیمار ہے اور وہ ایک بار اس سے ملنا چاہتی ہے۔

میں مونا کے جذبات کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا، بس خاموش نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔

"...اور میں جا رہی ہوں۔"

"لیکن آرتھر اور تمہارا کیریئر؟" مجھے کچھ ہوش آیا۔

"اس کی کچھ مجبوریاں ہیں، وہ میرے ساتھ نہیں جا سکتا جب کہ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرے ساتھ ہوتا تو میرے کام مزید آسان ہو جاتے۔" اس نے میری طرف دیکھا پھر کہا۔ "اور اس سوال میں تم نے خود کو کیوں نہیں شامل کیا؟ تم بھی تو میرے عزیز ہو اور میں تم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں اور کیریئر، تو وہ میری ماں سے زیادہ عزیز نہیں ہے رحمانی۔ تم نہیں جانتے میری ماں کتنی عظیم عورت ہے۔ اس نے میرے ڈیڈی سے شادی اس شرط پر کی تھی کہ وہ اسے اس کی فیملی سے الگ نہیں کریں گے لیکن بعد میں ڈیڈی کے اپنے وعدے سے مکر جانے کی وجہ سے اسے بہت ہی دلی صدمہ پہنچا تھا۔ پھر بھی اس نے بہت حد تک ڈیڈی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اسے مایوسی ملی۔ ڈیڈی کی شراب نوشی اور جوئے کی لت اور نت نئے الزام تراشیوں نے میری ماں کو ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائی۔ وہ زندگی کی دلچسپیوں سے قطعی طور پر مایوس اور بے زار ہو گئی تھی۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے ڈیڈی نے مجھے اپنی اولاد کہنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں آج سوچ سکتی ہوں کہ اس لمحہ میری ماں پر کیا گزری ہوگی۔ مگر وہ عورت تھی نا؟ بہت حد تک اس نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس کی اپنی بیوی ہے جسے اس نے جیسس (Jesus) کے سامنے قبول کیا ہے۔

آخر ایک لمحہ اسے احساس ہو گیا کہ وہ اپنی ہستی خود متزلزل کر رہی ہے۔ اس کی ضرورت یہاں نہیں، جاپان میں اپنے دوستوں کے پاس ہے جو آج بھی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج بھی اسے آواز دے رہے ہیں۔ "مدر، لوٹ آؤ مدر۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ لوٹ آؤ۔"

"ناگاساکی کی تباہی کے بعد جیسے وہاں کی آب و ہوا ہی مفلوج ہو گئی۔ شجر و حجر کیا،

وہاں کی انسانی نسل نے جو نئی صورت اختیار کرلی کہ میری ماں جیسی عورت اس سانحہ کو جھیل نہ سکی اور فوری طور پر اپنے تمام تر رنگین خواب سینے کے تاریک گوشے میں مقید کر کے ایک نئے مشن پر نکل پڑی لیکن میری ماں کو میرے ڈیڈی سے ہتک اور نفرت کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا اور آخر کار وہ لوٹ گئی اپنے بچوں کے پاس، ہمیشہ کے لیے...اور آج برسوں بعد میں اسے یاد آئی ہوں۔ وہ تو مجھے پہچان بھی نہیں پائے گی لیکن مجھے امید ہے جب میں اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی 'مونا' ہوں جسے وہ بہت پہلے بچپن میں ہی چھوڑ کر چلی آئی تھی، اپنے بہت سارے ضرورت مند بچوں کی پکار پر، تو وہ مجھے اپنے سینے سے لگالے گی اور بہت پیار کرے گی مجھے۔''

اتنا کہتے ہوئے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھپھک پڑی تھی وہ۔ میرا من بھی بھاری ہو گیا تھا۔ واقعی مونا ایک عظیم عورت کی بیٹی تھی مگر اُس کی مامتا سے کوسوں دور۔

...اور وہ چلی گئی تھی۔

اور آج بیس سال بعد پھر اس سے ملاقات ہوئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

صبح جب میں نے اسے فون کیا اور بتایا کہ میں آرہا ہوں تو اس نے جلد آجانے کی تاکید کی اور کہا کہ ہو سکے تو پورے دن کے لیے آجاؤں کیوں کہ وہ اپنے دوستوں کو یہاں کے تفریحی اور تاریخی مقامات دکھانے لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے مجھ سے گزارش کی کہ میں یقینی طور پر اپنا آج کا پورا دن اس کے اور اس کے دوستوں کے ساتھ گزاروں۔ مجھے بھی اس کے دوستوں سے ملنے اور ان کے ساتھ چند گھڑی گزارنے کا بڑا اشتیاق تھا لہٰذا میں نے اسے اطمینان دلایا کہ آج میں پورا دن اس کے ساتھ ہی گزاروں گا تب اس نے فون پر متعدد بار شکریہ ادا کیا تھا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

میں جلدی جلدی تیار ہونے لگا اور ساتھ ہی سوچتا رہا کہ مونا کے دوستوں کے لیے

اپنے ساتھ کیا لے جاؤں۔کافی سوچنے کے بعد میں نے بکے سینٹر سے ان کے لیے اچھے اور خوشبودار پھول لیے کہ پھول مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں اور مجھے ان سے عشق ہے۔تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب میں وہاں پہنچا جہاں مونا اپنے دوستوں کے ہمراہ ٹھہری ہوئی تھی تو وہ مجھے اپنی منزل کے بیرونی ٹیرس پر نظر آ گئی۔مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے جلدی سے کسی کو مخاطب کیا۔غالباً اپنے دوستوں کو۔اور پھر ٹیرس پر تقریباً دو درجن کی بھیڑ نظر آنے لگی۔سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر مجھے وِش کر رہے تھے۔میں نے بھی اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور جلدی سے لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔لفٹ سے اترنے کے بعد کوری ڈور میں مونا مل گئی اور مجھے لے کر ہال میں داخل ہوگئی۔کمرہ کافی کشادہ تھا اور اس کے دوست تین تین کی قطار میں قرینے سے کھڑے ہو کر اور ایک ہاتھ اپنے سینے پر اور دوسرا اوپر اٹھا کر جرمن زبان میں کچھ گا رہے تھے۔پل بھر کے لیے جیسے میں مبہوت سا ہو گیا۔ان کی آواز کی مٹھاس اور دھن کی ہم آہنگی سے ایک عجیب سا سماں بندھا ہوا تھا اور ماحول میں بڑی ہی عقیدت اور پیار بسا ہوا تھا۔ان کے استقبال کا یہ انداز اور اہتمام دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔میں نے باری باری سب سے مل کر انہیں پھول پیش کیے اور ان کے نام معلوم کیے۔وہ واقعی بڑے خوش نظر آ رہے تھی او راُن کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آ کر پھیل رہی تھی۔پھر مونا نے کہا۔''آؤ تمہیں مسٹر جیکب سے ملواتی ہوں۔وہ بغل کے کمرے میں ہیں۔'' اسی کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ وائلن کی تیز دھن کی آواز غالباً بغل والے کمرے سے آ رہی تھی۔مونا بتا رہی تھی،وہ پاؤں سے معذور ہیں اس لیے اس کمرے میں نہیں آ سکتے۔میں ملحقہ کمرے میں جو اس کمرے سے تقریباً نصف چھوٹا تھا،داخل ہوا تو سامنے ہی بستر پر نصف عمر کو پار کر چکا ایک شخص لیٹا ہوا تھا ۔ایک پتلی سی چادر اس نے اپنی کمر کے حصے تک ڈال رکھی تھی اور اس کے پیٹ پر ایک سیاہ رنگ کا وائلن پڑا ہوتھا۔سرخی مائل اس کے بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے اور تراشی ہوئی

فرنچ داڑھی اس کے گورے چٹے گالوں پر بڑی ہی پرکشش لگ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مونا نے اس کی مدد کی اور وہ بیٹھ گیا۔

''یہ مسٹر جیکب ہیں، انہیں موسیقی بہت پسند ہے اور یہ خود بھی اچھا گاتے ہیں۔ کئی مقابلوں میں انہوں نے انعام بھی حاصل کیا ہے اور جیکب! یہ رحمانی، ہمارا ہندوستانی دوست اور ایک کہانی والا آدمی۔ آپ اسے اپنی رولانڈا والی بات نہیں بتائیں گے ورنہ یہ اس پر بھی کوئی کہانی لکھ دے گا۔'' اسی کے ساتھ جیکب نے زوروں کا قہقہہ لگایا اور ہم سب اس کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔

''ایکسکیوزمی سر...!'' اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اداس سا ہو گیا تھا۔

''مگر کیوں؟'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''میں آپ کے استقبال میں ....''

''ارے کوئی بات نہیں، میں جو تمہارے پاس آ گیا ہوں۔''

وہ مطمئن ہو گیا اور کچھ گنگنانے لگا اور دیر تک گنگناتا رہا۔

مونا، رمی کے ہاتھوں کی پٹیاں کھولنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر کوڑھ کے زخم تھے اور انگلیوں کی جگہ ٹھڈی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ مونا نے پٹی کی جب آخری تہہ کھولی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سڑے گلے سفید بد گوشت اور کہیں کہیں سکڑی ہوئی سیاہی مائل چمڑی دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا قصائی خانے سے چھچھڑے لا کر وہاں چسپاں کر دیے گئے ہوں اور مجھے لگا کہ میرے پیٹ میں سے کسی طرح کے گولے اٹھ اٹھ کر حلق میں آ گئے ہوں اور ممکن تھا کہ مجھے الٹی کرنے کے لیے فلش کی جانب بھاگنا پڑتا، میں نے نظریں منتقل کر کے مونا کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ بچپن سے ہی مجھے یہ سب برداشت نہیں

ہوتا تھا۔ اس لیے میں بہت کم ہسپتال یہ کسی ڈاکٹر کے یہاں کسی کی عیادت کو جاتا ہوں۔
کیوں کہ وہاں جا کر خود میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ بہت سوں کی رائے ہے کہ
میں دل کا کمزور ہوں۔ خدا جانے۔ مونا روئی کے ٹکڑے میں زخم کے خون آلود مواد جذب
کرنے میں مشغول تھی۔ مجھے یاد آیا، بچپن میں میرے چھوٹے بھائی کی داڑھی سمیت پورے
گال پرلہسن کا زخم ہوگیا تھا اور اس میں پیلے پیلے مواد بھر گئے تھے جنھیں میری ماں اپنے آنچل
میں جذب کیا کرتی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بھی ایسے ہی تاثرات ہوا کرتے تھے۔
مونا بتا رہی تھی کہ اب زخم پر تازہ گوشت آنے لگا ہے اور بہت جلد چھچڑا نما گوشت کی جگہ
تندرست اور نئے گوشت بھر جائیں گے اور رمی کی تکلیف دور ہو جائے گی۔ ویسے صبح وشام
زخم کی صفائی ہو رہی ہے اور DAPSONE کی گولیاں اور دیگر دوائیاں بہتر کام کر رہی
ہیں لیکن کبھی کبھی اندرونی INFECTION کے سبب مواد زیادہ پیدا ہو جاتا ہے اور
تکلیف شدید ہو جاتی ہے تو فوراً اسی وقت صفائی ناگزیر ہو جاتی ہے کیوں کہ ایسی حالت میں
زخم کے MYCOBACTERIUM LEPREA جن کے مواد میں تیرنے سے
بہت شدید تکلیف ہوتی ہے، وہ باہر آجاتے ہیں۔'' مونا نے رمی کے ہاتھوں پر اب نئی پٹی
باندھ دی تھی اور اس کا چہرہ سمندر کی خاموش سطح جیسا پر سکون لگ رہا تھا۔

مونا کے تمام دوست روانگی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ہم نے سیاحت کے لیے پہلے
ہی اوویلا کاریں پچھتر ڈالر فی کار کے حساب سے کرائے پر حاصل کر لی تھیں۔ یہ ننھی کاریں
بڑی خوبصورت تھیں اور کہیں بھی آسانی سے جا سکتی تھیں۔ ہم لوگ ان کے ذریعہ مقامی شہر
بورڈو کے غیر آبادی والے علاقے میں پہنچے۔ مونا کے دوستوں کی خواہش تھی کہ وہ پہلے انہی
علاقوں کو دیکھیں۔ سرسبز چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی یہ بالکل کھلی جگہ تھی۔ دلکش
مناظر کے سینے پر پاؤں پسارے فطرت پوری طرح راج کر رہی تھی اور ہر جانب دھواں

دھواں سا سماں طبیعت میں ایک عجیب طرح کا ہیجان پیدا کر رہا تھا۔ سب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیکب اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ اپنا وائلن لے آیا تھا جسے چھیڑنے میں مشغول ہو گیا تھا، ساتھ ہی اس کی گنگناہٹ بھی وائلن کا ساتھ دے رہی تھی۔ اسی دوران مجھے جیکب کی رولانڈا والی بات یاد آ گئی اور میں نے مونا سے پوچھا۔ ''یہ رولانڈا کا کیا معاملہ ہے؟''

''رولانڈا، جیکب کی محبوبہ تھی۔ ایک حادثے میں جیکب کے پیر چلے گئے تو اس نے اسے ٹھکرا دیا لیکن میرے پاس آ کر وہ اس کی بے وفائی کو قطعی بھول گیا ہے۔ اب وہ صرف اس کے نام پر ہنستا ہے۔ وہ مجھے مدر کہتا ہے جیسے میں نے ہی اسے جنم دیا ہو۔ وہ کہتا ہے اگر رولانڈا نے بے وفائی نہ کی ہوتی تو اُسے اس کی ماں کیسے ملتی۔ اتنا اچھا کنبہ کیوں کر ملتا؟ اور اس کے لیے رولانڈا کا شکر گزار ہے وہ۔''

''اور رمی؟''

''رمی کے گھر میں سب ہیں۔ کچھ دن قبل وہ نادان چرسیوں کی سنگت میں چلی گئی تھی۔ وہیں اس نے نہ جانے کس طرح یہ روگ پال لیا تھا اور پھر اس کے گھر والوں نے اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ وہ اپنے گھر والوں سے نفرت کرتی ہے۔ اس کا باپ کبھی اس سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس سے نہیں ملتی۔''

جیکب اب بھی وائلن چھیڑنے میں مشغول تھا۔

اور میں کچھ سوچ رہا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟''

ہاں، شاید وہ جانتی تھی کہ میری سوچ کیا ہے؟

”کیا تمہیں نہیں لگتا رحمانی کہ جیکب کورولانڈا اور رمی کو ان پیپوں کے درمیان کی کشش کے سوا بھی کوئی دوسری بات یہاں محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے ماضی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جیکب کا قہقہہ کس قدر معصوم اور پرسکون تھا اور.....“

جیکب اب بہت زوروں سے وائلن بجارہا تھا۔

”...اور وہ ہنسنے لگے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی ہے اور اکثر میں اپنی ماں کو سوتے میں دیکھتی ہوں۔“ مجھے لگا کہ میں نے مونا کی باتوں کا کوئی جواب دیا ہے مگر وہ وائلن کی تیز آواز میں دب کر رہ گیا شاید۔ مدر... مدر... جیکب اونچی آواز میں پکار رہا تھا۔ ہم نے اس کے قریب پہنچ کر دیکھا۔ کچھ اجنبی لوگ رمی اور دوسرے ساتھیوں سے باتیں کر رہیں تھے۔ پتا چلا کہ وہ بھی سیاح ہیں اور ان لوگوں سے ان کے ادارے کے متعلق جانکاریاں لے رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سب کے گروپ فوٹو لیے اور چلے گئے اور شام تک ہم لوگ بھی واپس آ گئے تھے۔

چوں کہ مونا کے دوستوں سے مجھے اُنس سا ہو گیا تھا اور وہ میرے بھی دوست بن گئے تھے۔ لہٰذا ان کے ساتھ مناسب وقت گزارنے کے لیے میں نے اپنے کام سے چندروز کی مہلت لے لی تھی۔ دوسرے روز جب میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے بڑے ہی پرجوش انداز میں میرا خیر مقدم کیا۔ مونا فوڈ سپلائی والوں کی بدنظمی پر انہیں تاکید کرنے گئی ہوئی تھی اور بہت جلد اس کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ جولیا نے مجھے چائے کا کپ تیار کر کے دیا۔ مونا کی عادت کے سبب انہیں یہ انتظام رکھنا پڑتا تھا۔ جولیا چوبیس پچیس سال کی ایک خوبصورت یہودی لڑکی تھی مگر بدقسمتی سے قوت گویائی سے محروم تھی اور تقریباً چار پانچ سالوں سے مونا کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مونا نے اسے ان کے اسکول میں داخل کرا دیا تھا جہاں وہ ایک نوجوان طالب علم کو پسند آ گئی تھی اور جاپان واپسی پر ان کی شادی ہونا تھی۔ میں نے

اشارتاً اس کے دوست کے بارے میں پوچھا تو اس کی آنکھیں ایک دم سے بھر گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ مونا اور اپنے ساتھیوں سے جدائی کا اسے غم ہو رہا ہے۔

مونا اب تک نہیں لوٹی تھی اور رمی شدید تکلیف میں تھی۔ اس کی بے چارگی بھری آنکھیں بار بار اُس دروازے کی جانب اٹھ رہی تھیں جہاں سے مونا وارد ہونے والی تھی۔ بظاہر اپنی بے چین کیفیت کو چھپانے کی وہ پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور زخموں میں مواد اور مواد کے کیڑوں کے تصور سے مجھے لگا کہ میرے پیٹ میں سے کئی طرح کے گولے اٹھ اٹھ کر میرے حلق میں آ رہے ہوں اور مجھ سے اس کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ دفعتاً میں نے اس کی پٹیاں کھولنا شروع کر دیں۔ پھوڑے کی شکل میں مواد بھرے ہوئے تھے۔ جیکب کا وائلن نہیں بج رہا تھا اور مجھے اس کی مانوس دھن کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پورے اطمینان کے ساتھ رمی کے زخموں کو صاف کیا۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں چپ چپا کر ایک دوسرے سے سٹنے لگی تھیں۔ میں نے اس کے زخموں پر دوائیاں لگا کر نئی پٹی کر دی۔

رمی کی تکلیف دور ہو چکی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس زمانے کا سب سے عظیم انسان ہوں جب کہ حقیقتاً میں ایک کمزور دل انسان تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مونا لوٹ آئی تھی ۔اس نے رمی کی پٹیاں بدلنے کے لیے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر شام تک میں اور مونا اپنے دوستوں میں لگے رہے۔ چند روز بعد میری چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور مونا بھی اب یہاں سے ہندوستان کے لیے پرواز کرنا چاہتی تھی۔ اس درمیان ہم لوگوں نے مختلف اہم اور یادگار مقامات کی سیر کی۔ ایک شام وہ ملی تو اس نے اس بات کی جانکاری دی کہ وہ اگلے روز کی فلائٹ سے اپنے دوستوں کو ہندوستان لے جا رہی ہے۔ میں چپ تھا بلکہ چپ رہنے اور نہ رہنے کے بیچ کی میری کیفیت تھی۔ کچھ بولنے کی کوشش کی تو لگا میں کچھ بول نہیں پاؤں گا۔

بہت کوشش کے بعد میں نے کہا۔

''...تم جو کر رہی ہو...اور جو سوچ رہی ہو، وہ کرنے اور سوچنے کے لیے....'' لمحہ بھر کے لیے میں رکا پھر بولا۔ ''ہندوستان میں بھی تمہیں بہت سارے ایسے لوگ ملیں گے، بہت ملیں گے ایسے لوگ جنہیں تمہاری ضرورت ہوگی اور مونا تم انہیں اپنا لینا....ان کی ماں بن جانا۔''

''اور کل میں نے رمی کی پٹیاں بدلی تھیں اور شاید کل ہی ناگاسا کی تباہ ہوا تھا اور شاید اب پوری دنیا تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ انسانیت کو شرمندہ اور شانتی کا خون کرنے کے لیے بڑے خطرناک قسم کے ہتھیار دنیا والوں نے جمع کر رکھے ہیں کہ اگر اُن کا استعمال ایک بار بھی ہو گیا تو پوری دنیا HANDICAPPED ہو جائے گی اور تمہیں....''

''بس کرو رحمانی، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔''

''نہیں، تمہیں سننا ہوگی میری باتیں۔ تمہاری ماں کو موقع نہیں ملا ورنہ یہ باتیں تم اسی سے جانتیں۔ تمہیں دعا کرنی ہوگی اپنے رب سے کہ وہ تمہارے ارادے کو مزید مستحکم کرے اور تمہاری امداد فرمائے۔ جاؤ مونا، میرا وطن...میرا گاؤں...میرے گھر والے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔'' دوسرے روز ایئرپورٹ پر میرے تمام دوست خاموش زبان میں مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ سب نے مجھے پھول پیش کیے اور میرے ہاتھوں کے بوسے لیے۔ جیکب نے اپنا وائلن مجھے پکڑا دیا۔ مونا نے تاکید کی...''رحمانی تم اپنا خیال رکھنا۔ راتوں کو دیر تک مت لکھنا، وقت پر سو جانا۔ سگریٹ کم پینا.....''

وہ آگے بڑھتی گئی۔

''مونا ذرا سننا....'' وہ رکی، مڑی اور سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''تم جاننا چاہتی تھی نا کہ روسی ادیب کا وہ کردار کیوں کر ہنسا کرتا تھا؟''

اس کی آنکھیں سکڑنے کے انداز میں ہوگئیں۔ میری نظر اپنے ہاتھ میں جیکب کے وائلن پر سے ہوکر مونا کے چہرے پر ٹک گئی اور میں نے کہا۔

’’زندگی سے جو لوگ قطعی طور پر مایوس ہو گئے ہوں۔ جو ہنسنا بھول گئے ہوں، ان میں، ان مردہ انسانوں میں جینے کی ذرا سی بھی خواہش پیدا کرنے والا بہر حال مسکرا سکتا ہے اور ہنس سکتا ہے مونا۔‘‘ وہ تیزی سے مڑی تھی اور تقریباً دوڑتے ہوئے رن وے کی جانب بڑھ گئی تھی اور میرا ہاتھ بہت دیر تک ہوا میں ہلتا رہا۔ اس وقت تک جب تک کہ احساس نہ ہو گیا کہ میری آنکھوں کی پلکوں سے پانی کے دو قطرے ٹپک پڑے ہیں۔

داڑھی

ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اپنا پرس کھولا۔سوسو کے دو پتے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی۔'رونی سے یہاں تک کے دوسو روپے...؟ سچ ایکدم گلا کاٹنے لگے ہوتم لوگ۔'

ٹیکسی ڈرائیور بھی کچھ کم ٹھس نہیں تھا، چھوٹتے ہی بولا۔'وقت بھی تو کافی لگتا ہے میڈم اور پھر پیٹرول بھی تو...'

'ارے مجھے معلوم ہے، پیٹرول سے ہی چلتی ہے، پانی سے نہیں' اس کی آواز میں قدرے جھلاہٹ تھی۔کھسک کر اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔'چلو بیٹے، باہر نکلو۔' اسٹینڈرڈ تھری میں پڑھ رہی اپنی بیٹی کو اس نے باہر کیا پھر خود بھی باہر آ گئی۔کچھ نیچے تک سرک آئے نظر کے چشمے کو اس نے انگلی سے اوپر کیا پھر موبائل میں وقت دیکھنے لگی۔ابھی سوا دس بجا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کا تاثر پیدا ہوا۔شکر ہے، وقت سے اسٹیشن پہنچ گئی۔اس کی ٹرین گیارہ پینتالیس میں تھی۔

جب کہیں جانا ہوتا ہے، ایک عجیب طرح کے، نامعلوم اندیشہ سے بھر جاتی ہے وہ۔

کئی روز پہلے سے ہی سفر کا ایک ایک سامان بیگ میں رکھتی جاتی ہے۔ یہ نہ چھوٹ جائے وہ نہ چھوٹ جائے۔ کہیں ٹریفک کے جام میں نہ پھنس جائیں، کہیں ٹرین نہ مس ہو جائے، اتنے بجے گاڑی ہے، اتنے بجے نکلنا ہوگا۔ عجیب طرح کی گھبراہٹ، اضطراب اور خدشات سے گھری رہتی اور سامان اکٹھا کرتی رہتی۔ ساتھ ہی سارا جوڑ گھٹاؤ اس کے اندر چلتا رہتا۔

لیکن وہ تو وقت سے کافی پہلے اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ تین روز قبل سے جو ایک بے چینی غالب تھی اس پر، اچانک وہ راحت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ گہری سانس خارج کرتے ہوئے پرسکون نظروں سے اس نے چاروں جانب دیکھا۔ نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کا نظارہ ہی بدلا ہوا تھا۔ چپے چپے پر پولیس لگی ہوئی تھی۔

'ارے یہ کیا بھیا، اتنی فورس کیوں ہے...؟' اس کے منہ سے یکلخت نکلا۔

'کچھ ہوا ہوگا میڈم...' ڈرائیور نے لاپرواہی سے کہا اور اتنی ہی لاپرواہی سے ڈگی سے اس کا سامان نکال کر اس کے پیروں کے پاس پٹک دیا۔

'ارے سنبھال کے بھیا۔ پاپا کے آچار کی شیشی ہے اس میں۔ نہ جانے ٹوٹی یا بچی...؟' اس نے تھیلا اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔ 'پر یہاں ہوا کیا ہے...؟ اتنی پولیس...؟ ریل منتری تشریف لا رہے ہیں کیا...؟'

'ارے ہٹا لے وہاں سے... جلدی کر۔' ذرا دور کھڑے پولیس کے جوان نے ٹیکسی ڈرائیور کو آواز لگائی تھی۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی تو وہ قلیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ دو دو قلی اس کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔

'ارے بھئی دو نہیں، ایک چاہیے۔ سامان ہی کتنا ہے...؟'

'ہاں میڈم چلیے...' ایک آگے بڑھ کر بولا تو دوسرا واپس مڑ گیا۔

'ریوا ایکسپریس...'

'چار نمبر میڈم...'

'چلو...'

'پچاس روپیا میڈم...'

'کیا...؟' حیرت و استعجاب سے اس کا منہ کھل گیا۔

'ایہے ریٹ ہے میڈم...'

'کیا مجھے نہیں معلوم؟ پہلی بار جا رہی ہوں؟ ہر دو ماہ پر کانپور جاتی ہوں ۔ بیٹے، جاتے ہیں نا ہم؟ مجھے الّو بنا رہے ہو؟ ایکدم سے لوٹ مچی ہے...؟'

'ایہے ریٹوے ہے میڈم ۔ چلنا ہو تو...' وہ اس کا بیگ اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔

'اوہ مما، چلئے نا...' اس کی بیٹی زچ ہو رہی تھی۔

'یہاں رکیے نہیں، رکیے نہیں۔ چلتے رہیے...' وہی پولیس والا پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

عجیب بے بسی تھی۔ شش و پنج میں پڑی بیٹی کا ہاتھ تھامے کھڑی رہی کچھ دیر، پھر قلی سے مخاطب ہوئی۔

'چلو لیکن ٹرین میں برتھ تک چھوڑنا ہوگا...؟'

قلی مسکراتا ہوا تیار ہو گیا۔ عام طور پر قلی برتھ تک ہی سامان پہنچاتے ہیں، پر اسے لگا ،اس کی بات رہ گئی، اب پچاس وصول ہو جائیں گے۔

'بھیا، آج اتنی پولس کیوں ہے یہاں؟ آپ کے لالو جی آ رہے ہیں کیا...؟ ارے بیٹا ٹھیک سے... نیچے دیکھ کر چلو نا...' وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

'میڈم، آپ کو کچھوؤ معلوم نہیں ہے کا...؟ بمبے ٹیشن پر اتنک وادیوں نے بم بسپھوٹ کیا ہے نا۔ ابھی ایک دو گھنٹا پہلے ہی کی تو بات ہے۔ بہتے لوگ مارے گئے

ہیں۔ٹرینوکواڑادیا ہے۔اسی لیے اینہا بھی سکورٹی لگی ہے۔اندرتو بڑی چیکنگ ویکنگ چل رہی ہے۔ای موہمڈنون چین سے جینے نہیں دے گا سب...' آخری جملہ اس نے ہونٹ دبا کر دھیرے سے ادا کیا تھا۔

چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔کپڑوں کے نیچے، جسم کے سارے رواں یکلخت کھڑے ہو گئے تھے۔قلی اپنی رفتار میں آگے بڑھا جارہا تھا۔وہ ٹھٹھکی کھڑی رہی۔سو چا، قلی کو روکے، نہیں روک سکی۔اس نے بیٹی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی، خود کو متوازن کرنے کی کوشش کرتی دھیرے دھیرے بڑھنے لگی۔بڑی سخت سکیورٹی تھی۔پولیس کے جوان ہتھیار سنبھالے بالکل مستعد کھڑے تھے۔پولیس کے کتے ایک ایک شئے سونگھتے پھر رہے تھے۔جگہ جگہ بالو بھری بوریاں رکھی ہوئی تھیں، ان کے پیچھے بندوق سنبھالے کمانڈو الرٹ کھڑے تھے۔مین گیٹ پر اتنی سخت چوکسی کہ ایک ایک آدمی مٹل ڈیٹکٹر سے ہوکر گزر رہا تھا۔پولیس والے مسافروں کے بیگ، سوٹ کیس کھلوا کھلوا کر دیکھ رہے تھے۔ایک ایک چیز کی باریکی سے جانچ پڑتال کی جارہی تھی۔

مٹل ڈیٹکٹر سے ہوکر وہ اندر پہنچی تو ایک سہرن پیدا کر دینے والے سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔لگ ہی نہیں رہا تھا، اسٹیشن ہے۔نہ شور سرابہ...نہ بھا گا بھا گی...ایکدم خاموشی اور خاموشی میں لپٹے رینگتے ہوئے لوگ۔گاڑیوں کی آمدورفت کا اعلان اور چیتاوَنی.....

'...یاتریوں سے انرودھ ہے کی کسی بھی سندگدھ ویکتی سے ساوَدھان رہیں...اس کی سوچنا ترنت پولیس یا ریلوے کرمچاری کو دیں...یاتریوں سے نویدن ہے کی کسی بھی لاوارث وستو کو ہاتھ نہ لگائیں...کرپیا دھیان دیں، کسی بھی آپات استھتی میں خود کو فوراً سرکچھت استھان پر لے جائیں...'

اس نے محسوس کیا، اس کے سینے کی دھڑکن تیز تیز چلنے لگی ہے۔اس نے اپنا چشمہ

ٹھیک کیا اور خود کو پر سکون کرنے کی سعی کرنے لگی۔ دھیان بٹانے کی غرض سے اس نے بیٹی سے پوچھا۔

'بیٹے' نانا کا سویٹر کس والے بیگ میں رکھا ہے...؟'

'بلیک والے میں...' بیٹی نے مختصر سا جواب دے کر بات ہی ختم کر دی لیکن اسے تو کچھ بولتے رہنا تھا۔ یہ سکوت اس کے ذہن و دل پر بڑا اثر انداز ہو رہا تھا۔

'لیکن بیٹے...، نانا کو زیادہ تنگ نہ کرنا...ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے...ہم لوگ ان سے مل کر دو ایک دنوں میں واپس آ جائیں گے...'

اس کی بیٹی چپ رہی' چلتی رہی۔

'یہ بول کیوں نہیں رہی...؟ ڈری ہوئی تو نہیں ہے...؟'

'بیٹے، آپ نے مما کی بات کا جواب نہیں دیا...؟'

'مما، نانا کو دلی کیوں نہیں لاتے؟ میں ان کے ساتھ گھوڑا گھوڑا کھیلتی...؟'

برجستہ وہ مسکرا پڑی۔ ہونٹوں کی دھاریاں پھیل گئیں۔ 'وہ نہیں آئیں گے بیٹے، انھیں کانپور ہی اچھا لگتا ہے۔'

اس کی ٹرین پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھی۔ قلی رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

'ایس الیون بھیا۔ برتھ نمبر ۲۹۔۲۸...' اس نے قلی کو بتایا۔

ٹرین کے اندر آئی تو یہاں بھی خاموشی۔ لوگ چپّی کی چادر تانے اپنی برتھ تلاش کر اپنا سامان رکھنے میں مصروف تھے۔ اس نے بیٹی کو برتھ پر بیٹھا دیا۔ پیسے لے کر قلی جا چکا تو وہ بھی اپنا سامان برتھ کے نیچے رکھنے لگی۔ تھیلا اس نے اوپر ہی رکھا کہ اس میں پانی کی بوتل اور کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ پوری بوگی کا ماحول وہاں چھائی ہوئی خاموشی سے بوجھل ہو رہا تھا۔ گو کہ بوگی میں بہت کم لوگ تھے، آدھی سے زیادہ برتھ خالی تھیں۔ جبکہ عام طور پر اس

ٹرین میں کافی بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ وہ جب بھی کانپور جاتی تھی، اسی ٹرین سے جاتی تھی۔ یہ دیر رات کھلتی تھی اور اہل صبح کانپور پہنچا دیتی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا، کب چلے، کب پہنچ گئے لیکن آج اتنی کم بھیڑ...؟

سامان اڈجسٹ کر کے وہ بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ متفکر بھی لگ رہی تھی۔ اس کی برتھ جہاں تھی، وہ پورا کمپارٹمنٹ تو بالکل ہی خالی تھا۔ ۲۹۔۲۸، لوور مڈل برتھ اس کی تھی۔ اس کے اوپر سامنے کی تینوں اور کنارے کی دونوں برتھ خالی تھیں۔ ابھی ٹرین چھوٹنے میں دیر بھی تھی۔ ہر کوئی اس کی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ دو گھنٹا پہلے ہی اسٹیشن آ جائے۔ اس نے سوچا تو ہنسی آ گئی۔

سچ، وہ تو ایکدم نمونہ ہے۔ کئی روز پہلے سے تیاری کر رہی ہے پھر بھی پاپا کا ایش ٹرے رہ ہی گیا۔ راجیو سے بول کر جے پور سے منگوایا تھا۔ لے تو آیا تھا، پر اس کا نن اسٹاپ لیکچر بھی سننا پڑا تھا۔ 'ایک طرف تو پاپا کو سگریٹ پینے سے روکتی ہو، دوسری طرف ایش ٹرے لے جا کر دے رہی ہو۔ تمہاری تو بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہونہہ، چھوڑ دی پاپا نے سگریٹ اور تم نے چھوڑوا دی...'

'بات سمجھا کرو راجیو... بولتی ہوں اس لیے کہ ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ کیسے ہانپتے ہانپتے بے سدھ ہو جاتے ہیں؟ یہ بیماری ہوتی ہی ایسی ہے۔ پر میں یہ بھی تو جانتی ہوں، وہ چھوڑیں گے نہیں اس کو۔ ان کے ساتھ ہی جائے گی۔ اس عمر کی عادتیں کہاں جاتی ہیں...؟'

'بیٹے' آپ کچھ کھاؤ گے؟ چپس نکال لو تھیلا میں سے...' اس نے بیٹی سے کہا۔

اس کا موبائل بجا۔ راجیو تھا۔ چنئی گیا ہے آفس کے کام سے۔

'ہاں راجیو، ٹرین میں بیٹھ گئی ہوں۔ اب چلے گی ہی۔ ہاں ہاں، اسٹیشن آئی تب پتہ

چلا ممبئی کے بارے میں۔ یہاں بھی بہت سخت سکیورٹی ہے۔ ارے نہیں، چلی جاؤں گی۔ اب تو بیٹھ چکی ہوں۔ ڈونٹ وری... ہاں ہاں، بیٹی ٹھیک ہے... نہیں، ڈری نہیں ہے... لو بات کر لو...' اس نے فون بیٹی کی طرف بڑھایا۔ 'بیٹے پاپا سے بات کرو...'

'ہلو پاپا... جی، چپس کھا رہی ہوں... آپ نے کھانا کھایا... جی میں ٹھیک ہوں... آپ کب لوٹیں گے پاپا؟ مما بتا رہی تھی کہ نانا سے مل کر ہم لوگ بھی دو دن میں دہلی لوٹ جائیں گے... جی پاپا... بائے پاپا...'

ٹرین کھلنے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ کنارے والی دونوں برتھ پر مسافر آ گئے تھے۔ اپر برتھ والا تو باضابطہ لمبی تان کر لیٹ چکا تھا۔ نیچے والا نیم دراز کوئی میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

اس نے مڈل والی برتھ کھولی۔ تھیلے سے چادر نکال کر بچھایا اور بیٹی کو لٹا دیا۔ 'بیٹے، سردی لگے تو دوسری والی چادر اوڑھ لینا... چلو، اب تم سو جاؤ... گڈ نائٹ...'

اس نے اپنی برتھ پر بھی چادر بچھالی۔ موبائل میں چھ بجے کا الارم لگایا اور کھسک کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ نومبر کی ہلکی نم ہوا نے اس کے جسم کو چھوا تو اس کے اندر گنگنی گدگدی بھر گئی اور قدرے تازگی محسوس کرنے لگی وہ۔ باہر پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پولیس کے مسلح جوان بھی گشت لگا رہے تھے۔

'نہ جانے ممبئی کی کیا خبر ہے...؟' اس نے سوچا، پاپا کو فون کر دینا چاہیے۔ فکرمند ہوں گے وہ۔' اس نے پاپا کو فون ملایا۔ 'جی پاپا... میں بول رہی ہوں... جی، ٹرین میں ہوں... ٹھیک ہوں... ہاں ہاں... وہ بھی ٹھیک ہے... سو رہی ہے... آپ فکر نہ کریں... میں صبح پہنچ جاؤں گی...'

گاڑی رینگنے لگی تھی۔

’...گاڑی کھل چکی ہے پاپا...میں صبح پہنچ رہی ہوں...‘

فون بند کر اس نے سامنے دیکھا۔ سامنے نیچے والی برتھ کا مسافر بھی آ چکا تھا۔ شاید رنگیتی ہوئی ٹرین لپک کر اس نے پکڑی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے، ہاتھ میں کچھ وقت لے کر نہیں چلنے سے۔ ایسی ہی بھاگا بھاگی مچتی ہے۔ نا بابا نا...اپنا فنڈا ٹھیک ہے۔ کم سے کم گھنٹا، آدھ گھنٹا پہلے پہنچو۔ بھلے انتظار کرنا پڑے۔ سامنے والے مسافر کی ہانپتی کانپتی کیفیت دیکھ کر اس میں اس کی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ دیکھوتو' بندے کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ کیسا پسینے پسینے ہو رہا ہے؟ کالی جینس اور گرے کلر کا جیکیٹ۔ بے وقوف ہے کیا؟ اتنے ماڈرن ڈریس اپ کے اوپر چادر کیوں لپیٹ رکھی ہے اس نے؟ اور پھر دہلی میں ابھی اتنی سردی کہاں؟ عجیب شخص ہے، چادر سے ہی چہرہ صاف کر رہا ہے؟ گورا چٹا چہرہ... گھنی لمبی داڑھی...

داڑھی...؟

تو مسلمان ہے...؟

چہرہ صاف کرنے کے بعد اس نے اپنی داڑھی چادر کے نیچے کر لی ہے اور چہرے کا زیادہ تر حصہ چھالیا ہے۔

پر کیوں؟ یہ اپنا چہرہ اور داڑھی کیوں چھپا رہا ہے...؟

’..........؟‘

اس نے محسوس کیا، پیروں کے نیچے سے سنسناہٹ جیسی کوئی چیز اوپر اس کے پورے جسم میں بھرنے لگی ہے۔

’یاتریوں سے انرودھ ہے کی کسی بھی سندگدھ ویکتی سے ساودھان رہیں...‘

’ای موہمڈ نون چین سے...‘

گاڑی پوری رفتار سے بھاگی جارہی تھی۔

اس نے بے چینی سے چشمے کا شیشہ صاف کر دوبارہ آنکھوں پر چڑھایا۔ رفتہ رفتہ اس کے اردگرد شک کا گھیرا کستا جارہا تھا۔ کہیں یہ...؟ کہیں کیا...؟ یقینی طور پر... یہ خود کو چھپانے کی کوشش کررہا ہے۔ کیسا اکبکایا ہوا ہے۔ بے چین سا ہر چیز کو دیکھ رہا ہے...

اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ محسوس ہوا، اندر سے کوئی شئے اوپر آکر حلق کے پاس پھنس گئی ہے جس سے اس کی سانسوں میں رکاوٹ پیدا ہورہی ہے۔ کھڑکی سے نم ہوا آنے کے باوجود اس کی پیشانی گیلی ہونے لگی۔ نظر ترچھی کر، چشمہ کے کنارہ سے وہ اس کے حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی ایک ایک جنبش پر دھیان دینے لگی۔

چوکنی نظر سے آس پاس دیکھ رہا ہے وہ۔ ایک ایک چیز کو بھانپ رہا ہے۔ کہیں....اسی ٹرین میں کچھ کرنے کا اس کا ارادہ تو نہیں؟ کنارے کی برتھ والے دونوں مسافروں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ دونوں تو جیسے ہر غم سے آزاد نیند کی آغوش میں ہیں۔ انھیں تو کسی انہونی کی کوئی فکر ہی نہیں۔ گمان ہی نہیں کہ یہاں کیا ہونے والا ہے...؟

کیا کرے وہ...؟ کیا انہیں جگا کر بتائے، بھائی صاحب وہ آدمی...لیکن تب تک تو وہ...تڑ...تڑ...تڑ...نہ جانے کتنوں کو موت کی نیند سلا دے گا۔ نہیں نہیں، اس وقت کوئی بھی حرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ ارے...وہ تو سوئی ہوئی اس کی بیٹی کو دیکھ رہا ہے...ا یکدم سے اس کی سانسیں رک گئیں۔ ہائے، میری بچّی...نہیں نہیں، اگر اس نے اس کی بچّی کو کچھ کیا تو وہ اس کا خون پی جائے گی...جان سے مار دے گی اُسے...بھلے وہ اسے بھی مار دے...اس کا چہرہ سخت ہوا اٹھا تھا لیکن بدن کے سارے رواں بھی کھڑے تھے۔ گھبراہٹ ایسی کہ اپنی جگہ پر شل ہوگئی تھی جیسے۔

اس نے اپنا ہاتھ چادر کے اندر کرلیا ہے۔ ضرور...ضرور چادر کے اندر کچھ چھپا رکھا

ہے اس نے؟ اے کے ۴۷ یا کوئی اور مہلک ہتھیار؟ لیکن اتنی سکیورٹی کے ہوتے...؟ ضرور پولیس والوں کو چکما دے کر اندر آیا ہوگا؟ ارے ہاں، یاد آیا۔ ٹرین کھل گئی تھی، جب تو دوڑ کر چڑھا تھا وہ۔ جب پولیس کے کھوجی کتے بوگی کا چپہ چپہ سونگھ کر چلے گئے تھے۔

گاڑی کسی کراسنگ سے گزر رہی تھی۔ کھڑ پڑ کی تیز آواز کے ساتھ دائیں بائیں زور کے جھٹکے کھانے لگی تھی۔ اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ لیکن وہ...وہ تو ایکدم چست درست بیٹھا ہوا تھا۔ کیا غضب کی ٹریننگ ہوتی ہے ان کی۔ جسم میں بجلی بھری ہوتی ہے جیسے۔ جبھی تو پلک جھپکتے ہی قیامت ڈھا دیتے ہیں...

ارے، ارے، اٹھ کر کہاں جا رہا ہے وہ؟ ضرور بوگی کا معائنہ کرنے گیا ہوگا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھسک کر برتھ کے کنارے آئی، گردن باہر نکال کر جھانکا۔ ٹائلٹ کے اندر گھسا ہے۔ وہ جھانکتی رہی۔

بوگی کے اندر تقریباً سارے لوگ سو چکے تھے یا پھر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ خوفناک لگنے جیسی خاموشی مسلّط تھی۔ ایسی حالت میں تو وہ آرام سے ایک ایک کو مار دے گا۔ کوئی نہیں بچ پائے گا۔ خوف اور خدشہ سے وہ لرز اٹھی۔ کھسک کر سابقہ جگہ پر بیٹھ گئی۔

بیٹی گہری نیند میں تھی۔ اس کی اپنی نیند تو کافور ہو چکی تھی۔ سامنے موت ہو تو نیند بھلا کیسے آئیگی؟ جانے کب کیا ہو جائے؟ وہ ابھی تک لوٹا نہیں؟ اتنی دیر تک ٹائلٹ میں کیا کر رہا ہے؟ کہیں ٹائلٹ میں ہی بم تو نہیں پلانٹ کر رہا ہے؟ اور اتنی دیر کیا کرے گا ٹائلٹ میں؟ سہمی سہمی پھر کنارے پر آ کر جھانکنے لگی۔ گیٹ کے پاس کھڑا موبائل سے باتیں کر رہا ہے۔ ضرور...اپنے آقاؤں سے بات کر رہا ہوگا؟ سارے حالات سے واقف کرا رہا ہوگا؟ اسے ہدایت دی جا رہی ہوگی؟ کیسے کرنا ہے؟ کب کرنا ہے؟ کہاں کرنا ہے...؟ سب کچھ اسے بتایا جا رہا ہوگا۔ جہاد کا گھونٹ پلایا جا رہا ہوگا۔ جنت میں گھر بنانے کا خواب دکھایا جا رہا ہوگا۔ وہ

جلدی جلدی اپنی گردن ہلا رہا ہے۔آقاؤں کے ایک ایک حکم پر لبیک کہہ رہا ہے۔

یا پھر وہ اپنے کسی ساتھی سے بات کر رہا ہوگا۔وہ اکیلا تو نہیں ہی ہوگا؟ اور بھی ساتھی ہوں گے اس کے۔ شاید ابھی اسی ٹرین میں ہوں۔ الگ الگ بوگی میں۔ سب ایک دوسرے کے کانٹکٹ میں ہیں۔ کب، کیسے، کیا کرنا ہے۔ منصوبے کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔

آرہا ہے...آرہا ہے...وہ جلدی سے اپنی جگہ پر آگئی۔آنکھیں بند کرلیں، جیسے سونے کی کوشش کر رہی ہو۔ذرا سی آنکھیں وا کر، چشمہ کے پیچھے سے دیکھنے لگی۔اپنی برتھ پر بیٹھ گیا ہے۔ بیگ سرہانے رکھ کر لیٹ گیا ہے۔ارے،اس نے اس کے بیگ کی طرف تو دھیان ہی نہیں دیا۔ضرور اسی بیگ میں تباہی کا سارا سامان ہے۔ ورنہ اتنے جتن سے سرہانے نہیں رکھتا۔برتھ کے نیچے ڈال دیتا۔

ٹی ٹی ای آیا تھا۔ٹکٹ مانگ رہا تھا۔ بھائی صاحب وہ آدمی...وہ ٹی ٹی ای کو بتانا چاہتی تھی، پر منہ سے لفظ باہر نہیں نکل پائے۔وہ لیٹا ہوا ہے، پر اس کا ہاتھ تو اس کے بیگ پر ہی ہے۔سہم گئی وہ۔ کچھ بولنے کا مطلب تھا، فوراً دھڑام..دھڑم.. لاشیں.. خون... چیتھڑے...

'ہاں بھئی..ٹکٹ...' ٹی ٹی ای اس سے مخاطب ہوا تھا۔اس نے لیٹے لیٹے ہی اپنا ٹکٹ دکھایا ہے۔کوشش کر رہا ہے، چہرہ سامنے نہ آئے۔آنکھیں اور ناک دکھائی دے رہی ہے

'آپ کی برتھ ٹونٹی سکس ہے...مڈل والی...' اس کا ٹکٹ دیکھ کر ٹی ٹی ای آگے بڑھ گیا تھا۔

...تو اسکی وہ برتھ نہیں ہے۔دوسرے کی برتھ پر جما ہوا ہے۔خالی پا کر بیٹھ گیا ہے۔

نہیں نہیں، یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔

وہ جان بوجھ کر اپنی برتھ پر نہیں بیٹھا ہے تا کہ واردات کرنے کے بعد اسکی سہی نشان دہی نہ ہو سکے، اسکی شناخت نہ ہو سکے۔ اس کے بارے میں سہی سہی کچھ پتہ نہ چل سکے۔ ٹی ٹی ای بغل کے کمپارٹمنٹ میں ٹکٹ دیکھ رہا ہے۔ وہ پیچھے سے جا کر ٹی ٹی ای کو بتا دینا چاہتی تھی۔ ٹائلٹ... ہاں ٹائلٹ کا بہانا ٹھیک رہیگا۔ وہ اٹھی، من ہی من کچھ پڑھتی آگے بڑھی۔ ٹی ٹی ای کے پاس پہنچ، مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کلیجہ دھک سے کر کے رہ گیا۔ غضب کا عیار ہے وہ۔ برتھ کے کنارے سے جھانک رہا ہے۔ بس یونہی ٹائلٹ کی طرف گئی، لوٹ آئی الٹے پیر۔ بیٹھی تو اس طرح جیسے جسم کی ساری طاقت نچوڑ لی گئی ہو۔

ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ علی گڑھ ہوگا۔ علی گڑھ ہی تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی تھی۔ پیٹھا والے، چائے والے آواز لگا رہے تھے۔ وہ اپنی شیشہ لگی کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے۔ اس کا موبائل بجا ہے۔ وہ ایکدم سے چونک گیا ہے۔ جیب سے فون نکال کر نمبر دیکھتا ہے۔ اٹھ کر کمپارٹمنٹ کی دوسری جانب چلا جاتا ہے۔

ضرور اسے اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی جگہ اڑا دینا ہے، ٹرین کو اور اسٹیشن کو بھی۔ اے بھیا سنو... ایکدم بوکھلا کر پلیٹ فارم پر کسی کو پکار اٹھی۔ مزید کچھ کہتی، وہ برتھ پر آ کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ سہم کر وہ کھڑکی سے چپک گئی۔

گاڑی کھل چکی تھی۔ دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کا خوف، اس کی دہشت بھی زور پکڑتی جارہی تھی۔

اس نے لائٹ آف کر دی ہے۔ کمپارٹمنٹ میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ لیکن... اس نے لائٹ کیوں آف کر دی؟ اندھیرا کیوں کر دیا؟ کیا وہ تاریکی کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے؟ بیگ کی زپ کھلنے کی آواز آئی ہے۔ اندھیرے میں بیگ کیوں کھول رہا ہے؟ کیا ہتھیار نکال

رہا ہے؟ یا بم میں ٹائمر لگا رہا ہے؟ وہ آنکھیں پھیلا کر دیکھنے لگی۔ چشمہ کے باوجود کچھ صاف نہیں دکھ رہا۔ نہ جانے کیا کر رہا ہے وہ؟ نہ جانے کیا کرنے والا ہے؟

ضرور ہی فدائین ہے۔ لگتا ہے، خود کے ساتھ ہی ٹرین کو بھی اڑا دے گا۔ تب تو... وہ اور اس کی بچی... ان کے تو چیتھڑے بھی نہیں ملیں گے۔ ادھر راجیو سوچے گا، ہم لوگ پاپا کے پاس گئے ہیں... ادھر پاپا انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے اور ہم لوگ... ہم لوگ... نہیں نہیں... بوگی کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔ انھیں تو پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ کال کے گال میں چلے جائیں گے۔ لیکن... لیکن... اس کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں۔ وہ تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

سامنے... اپنے سامنے... موت کو دیکھ رہی تھی۔ موت کو دیکھتے ہوئے مرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، اس کرب سے بڑی شدت سے گزر رہی تھی وہ۔

لیکن کیا وہ ایسے ہی مر جائے گی؟ مرنے سے پہلے، زندہ رہنے کے لیے، آخری کوشش سمجھ کر، کیا وہ کچھ نہیں کر سکتی؟ کیوں نہیں کر سکتی؟ وہ اس پر جھپٹ پڑ سکتی ہے۔ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔ دبوچ کر شور مچا سکتی ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے نوچ سکتی ہے۔ اپنے ناخنوں سے اس کی آنکھیں پھوڑ سکتی ہے۔

ہاں ہاں، اسے اپنے آپ کو، اپنی بیٹی کو بچانا ہوگا۔ ورنہ راجیو کا تو سب کچھ ہی اجڑ جائے گا۔ اس کا تو ہم دونوں کے سوا کوئی ہے بھی نہیں۔ باپ رے، مجھ سے شادی کرنے کے لیے کون سی مصیبت نہیں جھیلی ہے اس نے۔ اس کے پریوار کا کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سب ناراض تھے۔ سب کی مخالفت سہہ کر اس نے مجھ سے شادی کی تھی۔ سب کے طعنے برداشت کر اس نے مجھے اپنایا تھا۔ میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے اس نے۔ کتنا پیار کرتا ہے وہ ہم سے۔ وہ تو جیتے جی مر جائے گا۔

اور...اس عمر میں پاپا تو ایکدم بے سہارا ہو جائیں گے۔ وقت بے وقت کون دیکھے گا ان کو؟ دور ہے، پر ماہ دو ماہ میں آ کر اُن کو دیکھ تو لیتی ہے۔ اتنے ہی سے ان کو کتنا بل مل جاتا ہے۔ اور یہ، یہ میری بیٹی... ابھی دنیا ہی کہاں دیکھی ہے اس نے؟ ابھی ابھی تو آنکھ کھولی ہے۔ اگلے ماہ تو اس کا ساتواں برتھ ڈے ہے۔ کتنا انتظار ہے اس کو اپنے برتھ ڈے کا؟ کتنی تیاری کر رکھی ہے اس نے؟ کیا ساری کی ساری تیاری...نہیں نہیں، اسے اس پر جھپٹ ہی پڑنا چاہیے۔ موقع اچھا ہے۔ بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے قبل کہ بیگ سے ہتھیار نکالے وہ اسے دبوچ لے سکتی ہے۔ اگر اس کی لمبی داڑھی پکڑ میں آ جائے، تب تو وہ ایکدم مجبور ہو جائے گا۔ پوری طرح گرفت میں آ جائے گا۔ درد اتنا ہو گا کہ کچھ کر ہی نہیں پائے گا۔ ہاں ہاں، اسے اس پر حملہ کر ہی دینا چاہیے۔

ایک...دو...ارے باپ رے، کس طرح گھور رہا ہے وہ۔ اس کے اندر چل رہی ساری باتوں کو پڑھ رہا ہے۔ کتنا محتاط ہو گیا ہے۔ کیا صرف بیگ میں ہی ہتھیار ہوں گے اس کے؟ چادر کے اندر بھی تو رکھے ہوں گے؟ ان کے پاس کیا نہیں ہوتا؟ چاقو سے لیکر اے کے ۴۷، ہتھ گولے، آر ڈی اکس تک۔ اور پھر جسم سے بھی تو گٹھیلا پھرتیلا ہے۔ اس کے پاس پہنچنے سے قبل ہی اس کا کام تمام کر دے گا۔ تو پھر...پھر...

گاڑی اپنی پوری رفتار میں بھاگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو لانگھتی، تیز شور کرتی گزر رہی تھی۔ نہ جانے وقت بھی کیا ہوا تھا؟ پوری بوگی میں مرگھٹ جیسا سناٹا پسرا ہوا تھا۔ تابوت میں رکھی لاش کی مانند لوگ اپنی اپنی برتھ پر سوئے ہوئے تھے۔ ایک اسی کے کمپارٹمنٹ میں غیبی طور پر، لیکن دکھنے جیسی چیزیں چل رہی تھیں۔

کچھ تو کرنا ہی ہو گا؟ کیوں نہیں وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لے؟ اس کے پیر پکڑ لے؟ اس سے گڑگڑا کر بولے، دیکھو بھیا، تمہاری بھی کوئی بہن ہو گی، میری بیٹی جیسی بیٹی

ہوگی، کیا تمہارے دل میں رحم نہیں ہے؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟ اگر تمہاری بہن یا بیٹی کو کوئی مارے تو تم پر کیا بیتے گی؟ آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ آخر یہ سب کیوں کرتے ہو تم لوگ؟ کیا ملتا ہے تمھیں بے قصوروں کا خون بہا کر؟ یہ اندھی لڑائی کیوں لڑ رہے ہو تم لوگ؟

اس طرح گڑگڑانے سے اسے ضرور دیا آجائے گی۔ بخش دے گا وہ ہمیں۔ ہاں، یہی ٹھیک رہے گا۔ ایسا ہی کرنا چاہیے۔

'بھائی صا...'

وہ بولنے کے لیے منہ کھولنے ہی والی تھی کہ اس کے موبائیل کا الارم گھنگھنا اٹھا ۔اس کا مطلب صبح ہو گئی تھی۔ چھ بج گئے تھے؟ باہر کہرا ہے، صبح پتا نہیں چل رہی ہے لیکن یہ طے تھا ٹرین کانپور پہنچنے والی ہے۔ کانپور پہنچنے کے احساس سے ہی اس کے اندر توانائی بھر گئی ۔بس تھوڑی دیر میں ہی...بس تھوڑی دیر اور...

گاڑی کی رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی۔ رفتار کم ہوتے ہی وہ اپنا بیگ اٹھا کر تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے، وہ یہیں اترے گا...نہیں، لگتا ہے یہیں کچھ کرے گا... اسی اسٹیشن پر...

'چلو بیٹے...اٹھو، جلدی چلو...' اس نے بیٹی کو نیچے اتارا۔ نیند سے جگی وہ آنکھیں ملنے لگی۔

'چلو بیٹے جلدی کرو...'

وہ سامان گھسیٹتے ہوئے گیٹ تک آئی۔ ٹرین رک چکی تھی۔ نیچے اتر کر ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ وہ گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

'یا اللہ... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے...'

اس کے منہ سے نکلا اور وہ بیٹی کا ہاتھ تھامے قلی کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

❀❀❀

چائمس

کہیں پڑھا تھا ''عورت جب تک ماں نہیں بن جاتی، نامکمل رہتی ہے''۔

کیرتی... کیرتی سنہا... چونتیس سالہ عورت۔ آٹھ سال پہلے جس کی شادی مجھ سے ہوئی تھی، پورے نو مہینے کے لیے انکیوبیٹر میں چلی گئی تھی۔ غالباً یہی مدت ہوتی ہے عورت کے مکمل ہونے کی۔ میری پتنی کیرتی سنہا کو یقین تھا، جب وہ نو مہینے بعد انکیوبیٹر سے باہر نکلے گی مکمل ہو چکی ہوگی۔ اس کا ادھورا پن ختم ہو چکا ہوگا۔

میں ہار چکا تھا۔

اس رات کیرتی سنہا ہی تھی جس نے میرا ہاتھ روک دیا تھا اور پھنکارتی ہوئی بولی تھی... ''تمھیں ایڈز ہے کیا جو ہر بار یہ جھلی چڑھا لیتے ہو؟'' اس کی آواز مجھے اندھیرے میں کوندتی ہوئی بجلی سی دکھی۔ کاش وہ میری بے بسی کو سمجھ رہی ہوتی لیکن تاریکی کے باوجود میں کیرتی سنہا کے چہرے پر نفرت اور غصے کا چنگھاڑتا سمندر ضرور دیکھ سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو رہی تھیں اور سانسوں کا ایسا بے ترتیب سلسلہ کہ پورا جسم پھول پچک رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے مجھ پر جمود طاری ہو گیا تھا اور مجھے اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ

پہلی بار کیرتی سنہا نے میرے اندر ٹھنڈی ٹھنڈی لہر پیدا کر دی تھی۔اس کی طرف دیکھنے سے اجتناب برتتے ہوئے میں نے دھیرے سے کہا۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں...؟''

اس نے بجلی کا لیمپ زمین پر دے مارا اور اندھیرے میں بھڑ بھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

دروازے کے پاس ٹنگا ہوا چائمس اس کے سر کے لمس سے بول پڑا تھا۔ٹن ٹن...ٹنن...ن ن ن...میری کھیج کی انتہا نہ رہی۔اس بے وقت کی ڈفلی کا مطلب...؟ کیرتی سنہا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ کسی کو سمجھ نہیں سکتا...پھر کیوں اٹھا لائی تھی اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ اسے بھی؟ رہنے دیتی وہیں اسے۔

اٹھ کر اسے شانت کروں یا پھر اسے کمرے سے باہر پھینک دوں، یہ خیال ابھی میرے من میں چل ہی رہا تھا کہ کیرتی سنہا دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اور وہ پھر... ٹن...ٹنن...ٹن۔

''اِٹس ٹو مچ...''میں چیخنا چاہ رہا تھا کہ کیرتی سنہا چیخ پڑی تھی۔

''کیا سمجھوں...؟ کب تک سمجھوں...؟ کچھ نہیں سمجھنا مجھے...آخر تم مجھے کیوں نہیں سمجھتے...؟''

جیسے بجلی کڑکی اور پھر خاموشی۔وہ بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ میں اندازہ لگا رہا تھا۔اس نے منہ دوسری طرف پھیر رکھا ہوگا۔سچ بھی تھا۔منہ دوسری طرف کیے وہ سسک رہی تھی۔

''آخر تم مجھے کب سمجھو گے...؟''ذرا دیر کی خاموشی پھر اس نے کہا۔''میں ادھوری ہوں پرشانت، ادھوری ہوں۔ مجھے اپنے جسم سے نفرت ہو رہی ہے...گھن آ رہی ہے مجھے... مکمل ہونا چاہتی ہوں...تم مجھے مکمل کیوں نہیں ہونے دیتے...؟اس الجھی الجھی شئے کی مدد لے کر

میرے جسم کی بے عزتی کیوں کرتے ہو...؟ میں عورت ہوں مجھے گالی کیوں دیتے ہو...؟''

میرے اندر خاموشی بھری ہوئی تھی۔ کیرتی سنہا بول رہی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ مجھے کیا اور کیوں سمجھا رہی ہے؟ کیا وہ مجھے اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ میں اسے سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے اتنا بھی نہیں سمجھتی، اس خیال کو وہ کیوں گھر کرنے دے رہی ہے۔ دکھ اور مایوسی کی یلغار سے میں بے چین ہو اٹھا تھا۔ ڈاکٹر... کچھ کہنے کی کوشش میں صرف ہکلا کر رہ گیا۔ اس کی معصوم اور بے قصور خواہش نے میرے پورے بدن میں لرزش بھر دی تھی جس کا احساس مجھے گہرے اندھیرے میں بھی ہو رہا تھا۔

میری پتنی کیرتی کی یہ ضد تھی کہ شاید ڈاکٹر کی ہدایت اسے یاد نہ تھی کہ شاید وہ اسے یاد نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

''پرگننسی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔''

مگر ضد تھی اس کی۔

''پوری ہونا چاہتی ہوں...''

اور میں ہار گیا تھا۔

کیرتی سنہا انکیوبیٹر میں چلی گئی تھی۔ وہ مکمل ہو رہی تھی۔ وہ عورت بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

ڈاکٹر بار بار اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ ''اِٹس ناٹ گڈ... اِٹس بیری ڈینجرس...''

اور میں بار بار اپنی ہتھیلی رگڑ رہا تھا۔

کیرتی سنہا میری پتنی بننے سے قبل میری شناسا تھی۔

بارش کی ایک شام تھی جب اس سے میری ملاقات بس اسٹاپ پر ہوئی تھی۔ میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی اور دو بار کافی کا پیالہ ختم ہونے تک جتنا ممکن ہو سکا

تھا، اس نے اپنے بارے میں بتایا تھا اور میرے بارے میں پوچھا تھا۔

اس نے بتایا تھا کہ وہ بچوں کے ایک اسکول میں میوزک ٹیچر ہے۔ وہ نہ صرف میوزک ٹیچر ہے بلکہ شاستریہ سنگیت اس کی سانسوں میں بسا ہوا ہے۔ کھانے کے بغیر تو وہ زندہ رہ سکتی ہے لیکن سنگیت کے بنا نہیں۔ اس کا خوبصورت چھوٹا سا کمرہ اس کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔ کمرے میں کئی طرح کے ساز وسامان سلیقے سے رکھے ہوئے تھے اور اس کے ریاض کرنے کی جگہ بھی بنی ہوئی تھی۔

لیکن، اس چھوٹے سے کمرے میں جس چیز نے سب سے زیادہ مجھے اپنی طرف راغب کیا تھا وہ دروازے کے پاس ٹنگا ہوا چائمس تھا۔ کانسے کا بنا پانچ زنجیروں والا چائمس، جس پر بھورے رنگ کی قلعی چڑھی ہوئی تھی اور جس کی سب سے نچلی زنجیر سے تار الٹک رہا تھا اور جو معمولی لمس سے ہی بول پڑتا تھا... ٹن ٹن... ٹنن... ٹن... آپ پڑھ رہے ہوں... کام کر رہے ہوں... کچھ سوچ رہے ہوں... اور تبھی اس کا ٹن ٹن... ٹنن... ن... ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نرم انگلیوں سے جسم کے اندر گدگدی کر رہا ہو... جیسے...

میں نے کیرتی سنہا سے کہا بھی... ''مجھے سب سے زیادہ...''

بھاری پلکوں کو اٹھا کر اس نے اسے دیکھا تھا۔ ''آپ اس کی معصومیت پر جا رہے ہیں... جب کہ یہ نہایت ہی بے حس اور خود غرض قسم کی شئے ہے۔

دراصل آپ اچھے موڈ میں ہیں... اس کا سب سے بڑا عیب ہے کہ یہ سامنے والے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ آپ ہنس رہے ہیں... رو رہے ہیں... اس کو کوئی سروکار نہیں... بس اپنی دھن میں... ٹن... ٹن... ابھی کل کی ہی بات ہے۔ میرے اسکول میں ایک بچہ فیس نہ دے پانے کی وجہ... میں پورا دن اَپ سیٹ تھی۔ گھر پہنچی تو یہ جناب ٹن... ٹن... ٹن ن ...ٹن... ہاؤ کرویل... میں تو ایک دم سے چیخ پڑی... 'شٹ اَپ' لیکن... وہ ہاتھ رگڑ رہی تھی...

''یہ کسی کو سمجھ نہیں سکتا...''

ایک بے جان شئے سے ایسی توقع...؟ کیرتی سنہا کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔ ''سنگیت زندگی کی علامت ہے...کہیں اس حالت میں بھی...یہ زندگی کا...''

''آپ فلاسفر ہیں...شاید...؟'' وہ مسکرائی تھی۔

''نہیں لیکھک ہوں...ہندی کا...'' میں بھی مسکرایا تھا۔

ہم دونوں مسکرانے لگے تھے۔

بطور جان پہچان یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ پھر اس کے بعد کئی ملاقاتیں....اور پھر ہم نے شادی کر لی تھی۔ شادی ہوئی اور مجھے کیرتی سنہا سے عشق ہو گیا۔ وہ میرے خیالوں کا ایک مستقل حصہ بن گئی۔ میں آفس جانے سے کترانے لگا۔ دوستوں کی ملاقاتوں سے بچنے لگا۔ گھر آئے مہمانوں سے چڑنے لگا۔ گویا کہ ایک ہی کوشش، کسی پہلوں وہ بٹے نہیں۔ پھر جب وہ سیڑھیوں سے گری، اس کے بچے دانی کا آپریشن ہوا اور وہ کوما میں چلی گئی تو یکلخت مجھے لگا وہ میرے لیے کتنی ناگزیر ہے۔ اس کو منہا کر کے تو میری زندگی کا کوئی معنی ہی نہیں بچتا تھا۔

ڈاکٹر نے تسلی دی تھی۔ ''بچ جائے گی لیکن مستقبل میں پرگننسی خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں...'' ایک اس دن مجھ پر دہشت طاری ہوئی تھی اور ایک آج ڈاکٹر نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ''اِٹس ناٹ گڈ...اِٹس بیری...'' جامد نظروں سے میں کیرتی سنہا کا چہرہ تکتا رہا تھا۔ وہ ہنس دی تھی۔ ہونٹوں کی دھاریاں پھیل گئی تھیں۔ ''کیا ہوگا...؟ مر جاؤں گی نا...بس...'' دوسرے پل کیرتی میری بانہوں میں تھی۔ جی چاہتا تھا اسے اپنے اندر جذب کر لوں۔

لیکن وہ پوری ہو رہی تھی۔

چوتھے ماہ سے اس کی آنکھوں کا خمار بڑھنے لگا تھا۔ وہ گھنٹوں آنکھوں کو بند کیے دیکھتی رہتی۔ محسوس کرتی رہتی۔ بے وجہ مسکراتی رہتی۔ لگتا وہ سنگیت سن رہی ہے، لگتا وہ تھرک رہی ہے۔ کئی بار ٹوکا میں نے۔ وہ مجھے نہیں سن پاتی تھی۔ بس خود کو سن رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی خود کو مکمل ہوتے۔ ایک عورت کا مکمل ہونا کتنے اَن چھوئے سپنوں کو جنم دیتا ہے، یہ کیرتی سنہا کی آنکھوں سے صاف عیاں ہو رہا تھا۔ پانچواں مہینہ چڑھتے ہی کیرتی نشہ بن گئی۔ اس کے پاؤں سہی جگہ نہیں پڑتے۔ چلتی تو ڈگمگاتی۔ کمر اور کولہے بھر گئے۔ اس پر دلکشی کا غلبہ ہوا تھا۔

چہرے کا ابرق گاڑھا ہو کر تپ تپ کرنے لگا تھا۔ رہ رہ کر ہونٹوں کی دھاریاں پھیل جاتیں۔ سانسوں کی رفتار بتاتی، جذبہ و احساس کا تلاطم زور پکڑ رہا ہے۔

کنواری خوشیاں اس کی چھاتی میں اچھل کود مچا رہی تھیں۔

خواب میں ڈوبی بستر پر لیٹی رہتی کیرتی سنہا۔ پشت سے تکیہ لگا تا تو وہ اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیتی۔

''خوش ہونا...؟''

اس کے بال سہلاتے میرے ہاتھ رک جاتے۔ اسے غور سے دیکھنے لگتا۔ جذبات سے پُر اُس کا چہرہ مجھے خواب ناک لگتا۔

ٹھہر ٹھہر کر کہتی... ''میں تمہاری شکر گزار ہوں پرشانت... تھینک یو... ویری مچ...''

''تم خوش ہو...؟'' میرے گلے سے جو آواز نکلتی، بخدا مجھے خود پہچان میں نہیں آتی۔

''یو... آخر تم مجھے کب سمجھوں گے...؟'' قدرے زچ ہو کر وہ کہتی۔

اس کی بات سن کر میں کہیں دور چلا جاتا۔ واپس آتا اور پوچھتا۔ ''اچھا... کیا بناؤ گی اُسے...؟''

''ویل...'' پیشانی پر انگلی رکھ کر سوچتی اور چہک کر کہتی... ''کچھ بھی... پر ہندی کا

لیکھک نہیں...''

وہ ہنس دیتی۔ میں ہنس دیتا۔

کتنی امید افزا تھی ہماری ہنسی۔

ساتویں مہینے کے شروعاتی دنوں میں سے کسی ایک دن کیرتی سنہا درد سے چھٹ پٹا نے لگی۔

آٹو...ٹیکسی...نہیں، امبولینس...

کیرتی سنہا اسپتال پہنچادی گئی۔

وہ ہوئی نہیں تھی۔ اسے دستانہ چڑھے ہاتھوں نے کیرتی سنہا کا پیٹ چاک کر کے باہر نکالا تھا۔ اگر نہیں نکالی جاتی تو کیرتی سنہا...کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ صرف چھ مہینے اور کچھ دنوں کی تھی۔ آدھی ادھوری۔ کیرتی سنہا بے ہوش پڑی تھی۔ جو بھی فیصلہ کرنا تھا، مجھے کرنا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔

کیرتی سنہا پوری ہوگئی تھی...مگر وہ...''او کے...او کے...'' ڈاکٹر نے کہا تھا۔ شاید وہ ہارا نہیں تھا ابھی۔ ''ہم اسے بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اکثر ہی ایسا ہوتا ہے اور اکثر ہی انہیں بچا لیا جاتا ہے...'' ڈاکٹر نے اپنی ساری صلاحیتوں کا استعمال کیا تھا...''اس کے بعد دستانہ پہنے ہاتھوں نے ٹھیک اسی طرح اسے ایک دوسرے شکم میں منتقل کر دیا جس طرح انھوں نے اسے کیرتی سنہا کے شکم سے نکالا تھا۔

وہ جتنا بھی بنی تھی اس سے آگے بنے گی۔

کیرتی سنہا کو ہوش آیا تو اپنا خالی پیٹ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ٹانکے کی سلائی اور پٹی کی موٹی تہہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایسے سہلانے لگی جیسے اسے ڈھونڈ رہی ہو۔

لیکن وہ وہاں تھی کہاں؟

وہ تو ایک دوسرے شکم میں بن رہی تھی۔ کیرتی سنہا کی پلکوں کے دونوں کناروں سے دھار بہہ چلی۔

''تم مکمل ہو چکی ہو...''میں نزدیک کھڑا اسے اپنے ہونے کا احساس کرانے لگا۔

''لیکن وہ ابھی بن رہی ہے...''

اس نے غیر یقینی سے مجھے دیکھا۔'' کہاں ہے وہ...؟'' جیسے اس کے ساتھ ساتھ میں وہاں نہ تھا۔''بس یہی کہیں...لیکن وہ بن رہی ہے...''

میں اپنی موجودگی کے لیے لگا تار کوشاں تھا۔

''بن رہی ہے...؟ کیا وہ...؟'' اس کی آواز ٹوٹ پھوٹ کر قسطوں میں باہر آئی۔

''فکر نہ کرو...وہ ایک دوسرے ''شکم'' میں اپنا ادھوراپن دور کر رہی ہے...بلکہ اپنی تکمیل کے بقیہ اوقات گزار رہی ہے...''

مجھے اب بھی بے چینی سے دیکھ رہی تھی۔ میرے چہرے کے ریشے ریشے کو پڑھ رہی تھی۔

''یقین کرو...تم مکمل ہو چکی ہو...''میں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

کیرتی سنہا گھر آ گئی۔

دیکھو تو سب کچھ ویسا ہی...اسی طرح...جس طرح تم چھوڑ کر گئی تھیں...دیواروں پر لگائی ہوئی تمہاری پینٹنگس...صوفوں کے کور پر تمہاری کی ہوئی کشیدہ کاری...کھڑکی دروازوں کے پردے...اور وہ تمہارا چائمس...ٹن ٹن...ٹن...ٹن...تم مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہو؟...''

''مجھے اس کے پاس لے چلو پرشانت...''

پھر ضد...کیا کرو گی اس کے پاس جا کر...؟

کہنا چاہ رہا تھا لیکن رک گیا کہ اس کے بعد وہ یہی کہتی۔ ''آخر تم مجھے سمجھتے کیوں نہیں...؟''

...اور مجھے احساس تھا، کیرتی سنہا کو اسے بنتے ہوئے دیکھنا ٹھیک نہیں جب کہ اب وہ اس کے اندر نہیں بن رہی تھی۔

کچھ وقت لگا لیکن کیرتی سنبھلنے لگی تھی۔ میرے لیے اچھا تھا ادھر کیرتی کا سنبھلنا اور ادھر اس کا بننا۔

میں ہر روز اسپتال جاتا۔ وہ شیشے کے گھر میں اطمینان سے پڑی ہوتی تھی اور اس کے بہت چھوٹے سے منہ میں آکسیجن کی نلی لگی رہتی تھی۔ وہ لگاتار بن رہی تھی۔ شیشے کے اس گھر میں اسے وہ سارا ماحول مل رہا تھا جو کیرتی سنہا کے شکم میں اسے ملتا تھا۔

تین مہینے لگے۔ کیرتی سنہا پوری طرح سنبھل گئی تھی اور وہ شاید پوری طرح بن گئی تھی۔

''ڈاکٹر...''

''یس...شی از اوکے...''

وہ پوری طرح بن کر پہلی بار گھر آئی تو میں نے کیرتی سنہا سے کہا۔

''تم تو اس کی آدھی ماں ہو...''

''کیا مطلب...؟'' کیرتی سنہا کی آنکھوں میں تشویش کے تاثر پیدا ہوئے۔

''مطلب یہ کہ تم نے اسے آدھا بنایا ہے...مکمل تو یہ...اس لیے آدھی ماں وہ...''

''اوہ...مائی گاڈ'' کیرتی سنہا کے چہرے کی کسی تنی ہوئی طنابیں اچانک ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...''

وہ ہنسنے لگی۔ میں ہنسنے لگا۔

کتنی بے لوث تھی ہماری ہنسی......۔

اچانک وہ چپ ہوگئی۔ کچھ سوچنے لگی۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جھجکتے ہوئے بولی۔

''یہ پوری طرح... پوری ہوگئی ہے نا...؟''

مجھے عجیب لگی اس کی آواز۔ پوری طرح پوری ہونے کا مطلب؟ پوری طرح ہی تو پوری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا...''پوری ہوگئی ہے... پوری طرح مکمل...شی از او کے...'' پورے تین مہینے اس کی دوسری والی آدھی ماں نے اپنے شکم میں رکھا تھا۔اس سے قبل کیرتی سنہا نے چھ مہینے اپنے شکم میں۔ چھ اور تین نو ہوتے ہیں۔انسانی جان کے مکمل ہونے کا یہی وقفہ ہوتا ہے۔دو چار دن کم یا زیادہ۔ پھر کیرتی سنہا کا ایسا سوال کوئی معنی رکھتا ہے کیا؟ کیا اسے اس کے پوری طرح پورا ہونے کا یقین نہیں ہے؟ لیکن اس یقین کے نہیں ہونے کی وجہ؟

وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی...

''یہ کچھ بول نہیں رہی...مجھ سے باتیں نہیں کر رہی ہے؟''

''لیکن تمھیں یقین کرنا چاہئے...''

میں کیرتی سنہا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے پوری طرح یقین تھا۔ وہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے۔ میں خوش تھا اور اپنے لکھنے کی ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔ کیرتی سنہا بستر پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔

اس رات میری کہانی میں اس کا باضابطہ اور مکمل جنم ہوا۔ میں نے کیرتی کو دکھایا۔ کیسے زندگی سے بھرپور مسکراہٹ لیے اس کے ہونٹ پھیل سکڑ رہے تھے۔اس کے ہونٹوں

سے پتلی سی نلی لگی ہوئی تھی جس کے ذریعہ کوئی پتلی سی چیز اس کے پیٹ کے اندر جارہی تھی۔
وہ زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کہ دور سے گزر رہی تھی۔

ڈاکٹر ہر روز آتا، دیکھتا اور اطمینان دلا کر جاتا تھا... ''شی از نارمل'' مہنگا اور تجربہ کار ڈاکٹر... مجھے بھروسہ تھا۔ لیکن کیرتی سنہا... اسے تشویش تھی... یہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے نا...؟''

میں انگلیوں کے اشارے سے پھیلتے سکڑتے زندگی سے بھرپور اس کے ہونٹ دکھاتا... تمہاری بے یقینی کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں... ڈونٹ وری... شی از نارمل... مجھے لگا میرے منہ سے ڈاکٹر بول رہا ہے۔ ہڑبڑا کر میں نے پالنے میں دیکھا۔ نلی کے ذریعہ کچھ اس کے اندر جارہا تھا۔ وہ زندہ رہنے کے لیے... بٹ شی از...'' میں نے کیرتی سنہا کو اطمینان دلانا چاہا... اگر ذرا بھی نامکمل ہوتی تو ڈاکٹر اسے گھر نہیں بھیجتا... کیرتی نے پہلی بار میری بات غور سے سنی اور شاید پہلی بار اس نے اس پر یقین کرنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے سے اس بات کی جھلک مل رہی تھی۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہے۔ لڑ رہی ہے اندر ہی اندر، جب کہ اسے نہیں پتا، اس اندر کی لڑائی میں ہار کس کی ہوگی اور جیت کس کی؟

''اگر یہ پوری طرح پوری ہوگئی ہے تو جلدی سے بڑی کیوں نہیں ہوتی... دودھ کا گلاس پھینک کیوں نہیں دیتی...؟ اور میں اسے ڈانٹ کیوں نہیں رہی...'' لڑکی بی ہیو یور سیلف...''

کیرتی سنہا کی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا، سوائے اس کے کہ غور سے اسے دیکھنے لگتا۔ دیکھ چکنے کے بعد جیسے تیسے خود کو تسلی دیتا، اتنی جلدی کیسے کیرتی سنہا...؟''

''مگر یہ بڑی کیوں نہیں ہوجاتی...؟'' میری تسلی کا کھنڈر ڈاکٹر نے دیکھا تو مسکرا پڑا۔

''ہیوپیشنس... تھنکس آرامپروونگ...''

مجھے بھی مسکرانا پڑا۔

کتنی معنی خیز تھی ہماری مسکراہٹ؟

''بچوں کے ہونے کے بعد مرد حاشیے پر چلا جاتا ہے۔'' عام طور پر مردوں کی یہ شکایت ہوا کرتی ہے۔ میری بھی تھی۔

''ایسا کیوں کہتے ہو...'' جیسے، کہیں سے مستعار لیے ہوئے لفظ کیرتی سنہا نے ادا کیے۔

''اس لیے کہ اب آفس کے لیے مجھے خود تیار ہونا پڑتا ہے...خواہش ہونے پر چائے خود سے بنانا پڑتی ہے...رات کو مجھے کتابیں پڑھتے ہوئے سونا پڑتا ہے...''

ٹھیک ہی تو ہے...'' یہ الفاظ بھی اس کے نہیں تھے۔ میں جھلا اٹھا۔

''ٹھیک ہے...؟'' میں اس کی طرف لپکا... ''کیرتی سنہا...'' وہ کھلکھلاتی ہوئی بچنے لگی۔ میں مرد تھا، مرد ہمیشہ حملہ آور اور اکثر اوقات فاتح ہوتا ہے۔

کیرتی سنہا میری گرفت میں آگئی تھی۔

''چھوڑو نا'' وہ کسمسا رہی تھی۔

''ہرگز نہیں...''

''وہ دیکھ لے گی...''

''ابھی چھوٹی ہے...''

کیرتی سنہا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ ''وہ بڑی کب ہوگی پرشانت...؟ وہ اسکول کب جائے گی...؟''

''پرشانت سنہا...'' خواہش ہوئی کہ میں اپنا نام زور سے چیخوں۔ لیکن نہیں، ایسا

کچھ نہیں کر سکتا تھا میں۔ ایسا کچھ نہیں کیا میں نے۔ بس اسے دیکھتے ہوئے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

رات کو کیرتی سنہا میرے قریب آئی تھی۔

'تم آئسولیٹ ہو رہے ہو پرشانت...؟'' اس نے میرے سر کو اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ ''میں کیا کروں پرشانت جب سے وہ ہوئی ہے... بلکہ جب سے وہ بن کر آئی ہے... نہ جانے کیوں مجھے... پوری طرح پوری... پرشانت پلیز... مجھے سمجھنے کی...'' وہ میرے سر کو اپنے اندر بھینچتی جا رہی تھی، میں اس کے اندر سماتا جا رہا تھا ذرا دیر بعد، وہ مجھے پوری طرح اپنے اندر جذب کر چکی تھی۔

اور پھر ایک دن...

پرشانت... پرشانت... صبح صبح کیرتی سنہا چیخنے لگی تھی۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے نیچے آیا تھا۔

''پرشانت وہ نہیں ہے...'' وہ میرے جسم سے لپٹ کر مجھے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ''وہ نہیں ہے پرشانت...''

میں ہکا بکا پالنے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہوگی... یہیں کہیں ہوگی... کہاں جائے گی... بستر پر ہوگی... اس کے نیچے... تکیے کے پاس... کچن میں... باہر کہیں... برآمدے میں... کہیں نہیں... پھر کہاں...؟''

کیرتی سنہا مجھے کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔ اور ذرا دیر بعد وہ اسپتال میں تھی۔

گویا اس پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا۔ ایک ایک انکیوبیٹر کو کھنگال رہی تھی۔ ''نہیں ہے... نہیں ہے پرشانت... وہ یہاں بھی نہیں ہے...''

''پرشانت... پرشانت...'' وہ پھر سے مجھے نوچ کھسوٹ رہی تھی۔

میں سچ کہتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، غیر متوقع طور پر میری زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اچانک رونما ہوئے ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیرتی سنہا... مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ دکھ سے پاگل ہو رہی تھی۔ درد نے اس کے انگ انگ کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ مکمل ہو کر بھی....

اور میں...

''کیرتی سنہا میں بھی... میں بھی کچھ تھا اس کا...'' میرے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔

''آخر... تم کیرتی سنہا... مجھے...''

میرے اندر کی چیخ اندر ہی رہی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''آؤ چلو، میں تمھیں، اسے اپنی کہانیوں میں بڑا ہوتے دکھاتا ہوں۔''

میں، پرشانت سنہا، گھر پہنچ کر کمرے میں داخل ہوا تو میرے سر سے...

ٹن ٹن... ٹنن... ٹن... ٹنن...

ناف کے نیچے

مقام۔شمالی ٹولے کا ایک تاریک کمرہ۔

...اس سے قبل کہ اژدہا اسے اپنے دہانہ میں بھر لیتا اس کی نیند ٹوٹ گئی اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا ایک ایک عضو پھوڑے کی شکل میں ٹیس رہا ہے۔وہ پسینے سے تر بہ تر ہو گیا تھا اور پیاس کی شدت سے اس کا حلق سوکھنے لگا تھا۔کمرے میں گہری تاریکی تھی اور ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔

آج پھر اس نے وہی خواب دیکھا تھا۔ایک طویل وعریض بدہیئت اژدہا اسے چاروں جانب سے اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہے اور اپنے دہانہ کو پھیلا کر اسے ثابت نگلنے کی کوشش کرر ہا ہے۔اس کے جسم کی ہڈیاں چٹک رہی ہیں اور روح گھٹتی جارہی ہے۔اس سے قبل کہ اس کی روح فنا ہو جاتی اور وہ ہیبت ناک اژدہا اسے اپنے سخت دہانہ کی گرفت میں لے لیتا...اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔یہ خواب وہ مسلسل کئی راتوں سے دیکھ رہا تھا۔خواب اس قدر ڈراؤنا تھا کہ اس کا اثر اس کے ہوش وحواس پر کئی کئی دنوں تک مسلط رہتا تھا اور آج تو

اس کا پورا جسم گھاؤ ہی بنا ہوا تھا۔

اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔اسی کیفیت میں اس نے بمشکل گردن گھما کر بغل میں سو رہی اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا۔تاریکی میں ان کی ناک سے نکلنے والی گھر گھراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور چار پائی سے پیر نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پیاس کی شدت کے باوجود اندھیرے میں پانی کے مٹکے تک جانے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ چار پائی سے پیر لٹکائے وہ گہری سانسیں لیتا رہا۔

اس کی عمر کوئی ایک پینتیس سال تھی۔ اکہرا جسم اور درمیانہ قد ہونے کی وجہ سے ڈنڈوں کی مار اس کے اندر اندر تک حائل کر گئی تھی۔ بیوی نے ہلدی اور چونے کے مرکبات پورے جسم پر مل تو دیا تھا لیکن اسنے تنبیہ بھی کیا تھا، 'جب جب پروا چلے گی، انگ انگ ٹیسے گا اور اس کا انگ انگ ٹیس رہا تھا۔

دفعتاً اس کے کانوں میں ایک مترنم اور قدرے مانوس سی آواز ٹکرانے لگی۔ یہ گاؤں کی گول گنبد والی عبادت گاہ سے آنے والی آواز تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ رات ڈھل چکی ہے اور اب نور کا تڑکا پھیلنے ہی والا ہے۔ پورے دن میں کل پانچ دفعہ عبادت کے لیے اس آواز کے ذریعہ لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ بلاتفریق سب لوگ ایک ساتھ اپنے معبود کی عبادت کرتے ہیں۔اس کے حواس ذرا بحال ہونے لگے۔ایک ایک منظر یاد آنے لگا۔ نکیلے گنبد وای عبادت گاہ...چار پائی...چپل...ڈنڈے....

اس کے باپ کی ایسی ہی ٹیس سے موت واقع ہوئی تھی۔ٹولے کی سامنے والی سڑک سے بڑے گھر کی سواری نکل رہی تھی۔شراب کے نشے میں اس کا باپ اپنے گھر کے سامنے چار پائی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔اس وقت تو سواری نکل گئی تھی مگر شام کو بلاوا آ گیا تھا۔ بڑے گھر کی دالان کے ستون سے باندھ کر اس پر اتنے ڈنڈے برسائے گئے تھے کہ اس کا

باپ نیم مردہ ہو گیا تھا۔

کسی کم ذات کی یہ مجال کہ سامنے سے اشراف گزریں اور وہ چارپائی پر بیٹھا رہ جائے۔ یہ تو خوش آئند بات نہیں ہے۔ یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ بڑے گھر کے لوگوں کا خیال ہے کہ... اس طرح مذہب کا خطرے میں پڑنا لازم ہے اور جب مذہب خطرے میں پڑے گا تو معاشرتی نظام کو درہم برہم ہونے سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ ہر کسی کے لیے حد مقرر ہے... آج معاشرے میں سکون اور امن و امان کا فقدان اس لیے ہے کہ طے شدہ کام طے شدہ حدوں کے اندر نہیں کیے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں افراتفری مچنا فطری ہے۔ مذہب کا پیمانہ ٹوٹنا لازمی ہے اور جب یہ پیمانہ ٹوٹے گا تو معاشرے کا تانا بانا بکھر جائے گا...

اس کے باپ نے مذہب کو خطرے میں ڈالا تھا۔ معاشرتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ مجرم تھا۔

وہ اپنے باپ کے نیم جاں جسم کو اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو اس کا لاغر باپ بستر پر پڑا کھو... کھو... کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کے سینے میں اتنی شدید چوٹ تھی کہ وہ زیادہ دنوں تک نہ جی سکا لیکن مرنے سے قبل اس کے پاس ایک امانت تھی جسے اس نے اس کے حوالے کیا تھا۔ اور وہ تھی پشتینی نصیحت...

'ہم ناف کے نیچے والے ہیں، ناف کے اوپر والوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہی ہمارا فرض ہے۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ تم ایسی بھول نہ کرنا۔ اپنی حد کو عبور نہ کرنا۔'

اس کے باپ نے اسے نصیحت کی تھی۔ اس کے باپ کو اس کے باپ یعنی اس کے دادا نے یہ نصیحت کی تھی اور اس کے دادا کو اس کے پردادا نے۔ اسی طرح یہ نصیحت نسل در نسل ان کے درمیان چلی آ رہی تھی۔ اب یہ نصیحت اس کے معرفت اس کے بیٹے تک پہنچے گی۔ اس کے باپ تک اس نصیحت کی خوب پاسداری ہوئی لیکن اس سے بھول ہو گئی۔ وہ بھول

گیا۔ اپنے باپ کی نصیحت بھول گیا۔ پشتینی نصیحت کو بھول گیا۔

کل کی بات ہے...

بڑے گھروں کے یہاں سے خدمت گزار کر واپس لوٹ رہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بھیگنے سے بچنے کے لیے نکیلے گنبد والی عبادت گاہ کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ ناپاک کر دیا اس نے عبادت گاہ کو۔ پھر کیا تھا، اس کا بھی بلاوا آ گیا۔ اس نے بہت معافی مانگی، زمین پر ناک رگڑی۔ بیوی نے جان بخش دینے کی منّت کی۔ اسے بھی ذلیل کیا گیا کہ اپنے مرد کی خبر پا کر وہ بدحواس چپل پہنے گاؤں میں بھاگتی آ گئی تھی۔ اس کی جان تو بخش دی گئی لیکن پورا جسم ڈنڈوں سے چور کر دیا گیا۔

اسے اپنے سر میں شدید درد کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے گردن گھما کر ایک بار پھر اندھیرے میں سو رہی اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا۔ ان کو دیکھتے ہوئے اس کے اندرون میں تلاطم سا برپا۔ 'نہیں، ہرگز نہیں...وہ اپنے بیٹے تک اس پشتینی نصیحت کو منتقل نہیں کرے گا۔'

کچھ لمحوں تک ان کی جانب دیکھتے رہنے کے بعد وہ آہستگی کے ساتھ چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تاریکی کے باوجود اسے اندازہ تھا کہ دروازہ کس جانب ہے۔ وہ دھیرے دھیرے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک خوش گوار احساس سے بھر اُٹھا۔ کیا ہی خوب منظر تھا۔ تاریکی رخصت ہو رہی تھی اور نسیم سحر میں لپٹی ہوئی نرم روشنی اس کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے انگ انگ میں پیوست درد کو سہلا رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ وہ کھڑا روشنی کو پیتا رہا۔ دفعتاً اس کے اندرون میں عجیب سی ہلچل ہوئی اور بیک وقت خیال گزرا کہ اندر واپس لوٹ جائے اور بستر پر جا کر سو جائے۔ اس نے گردن گھما کر اندر دیکھا۔ اس نے دیکھا اس کے بستر پر، جہاں وہ لیٹا ہوا تھا، وہاں ایک بڑا

سا اژدہا بیٹھا ہوا تھا اور جو اُس کے بیٹے کو خوں بار آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کے ہوش وحواس فاختہ ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر نگاہیں ہٹالیں۔ دروازے پر کھڑا وہ گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ کچھ لمحہ بعد اس نے دل کو مضبوط کیا اور لرزتے قدموں سے باہر آ گیا۔

تقریباً پچیس تیس گری پڑی، ٹوٹی بکھری جھونپڑیوں اور کچے مکانوں والا اس کا ٹولہ شمن پورہ گاؤں کے شمالی حصے میں واقع تھا۔ وہ اپنے ٹولے سے نکل کر گاؤں میں داخل ہونے والی سڑک پر آ گیا۔ وہ دوراہے پر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے گاؤں کے مکانوں کی شروعات ہوتی تھی۔ سیدھی سڑک گاؤں کی گول گنبد والی عبادت گاہ کی طرف جاتی تھی اور سیدھے ہاتھ کی سڑک نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کی طرف۔

نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ سے بھی آواز گونجنے لگی تھی۔ وہاں بھی عبادت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چیخ اٹھا اور اس کے اندرون میں ایک بار پھر تلاطم سا برپا۔ اس نے یاس وحسرت بھری نگاہوں سے نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کی طرف دیکھا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ چند ثانیہ وہ بے حس بنا کھڑا رہا پھر سیدھے رستے پر بڑھ گیا۔ وہ جوں جوں گول گنبد والی عبادت گاہ کے قریب پہنچ رہا تھا، اس کے قدموں میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ اس کے دروازے کے پاس پہنچ کر وہ ایک کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے اکا دکا لوگ صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ ذرا دیر بعد اُن میں سے معتبر اور نمایاں سا دکھنے والا ایک شخص باہر نکلا تو وہ قدرے لپکتے ہوئے اس کے پاس پہنچا۔

'سنیے، سنیے... مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ رکیے مالک...' وہ سرگوشی میں چلایا۔
اس شخص نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ 'کون ہو بھائی، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'

'میں...میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ...کہ کیا میں بھی آپ کی اس عبادت گاہ میں...'

اس نے عبادت گاہ کی طرف انگلی اٹھائی۔'...عبادت کر سکتا ہوں؟ کوئی روک ٹوک تو نہیں ہوگی نا؟'

'یہ عبادت گاہ میری نہیں ہے بھائی۔ یہ تو اس کی ہے جو ایک ہے اور جو سب کا مالک ہے۔ اس ایک کو ماننے والا کوئی بھی اس میں عبادت کر سکتا ہے۔'

'اگر میں اس کو ماننے لگوں تو کیا میں بھی اس میں عبادت کر سکتا ہوں...؟'

'ہاں...ہاں...کر سکتے ہو...پر تم ہو کون؟'

'میں...میں...اسی گاؤں کے 'شمالی ٹولہ' پر رہتا ہوں مالک...' اس کی آواز میں قدرے لکنت کی آمیزش تھی۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔

صاف روشنی میں وہ شخص اسے بغور دیکھے جا رہا تھا۔

مقام۔ گول گنبد والی عبادت گاہ کا صحن

شام کی عبادت کے بعد وہ سب وہاں یکجا ہوئے تھے۔ سب خاموش تھے اور غور و خوض میں غرق تھے۔ بظاہر تو یہ محض ایک تجویز تھی لیکن اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا لازمی تھا۔

'مجھے لگتا ہے، ہمیں اسے اپنی جماعت میں شامل کر لینا چاہیے۔' کچھ لمحہ کے بعد ان میں سے ایک شخص نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

'لیکن جناب یہ بھی تو سوچیے کہ اس کا اثر کیا ہوگا؟' ایک دوسرے شخص نے اندیشے کا اظہار کیا۔

پہلے والے شخص نے اپنی گردن کو پھر جنبش دی۔'اثر کیا ہوگا بھئی، ہم تو اس کے پاس گئے نہیں ہیں۔اس تجویز کو لے کر وہ خود آیا ہے۔اس نے خود سے اپنا منشا ظاہر کیا ہے اور یہ تو اچھی بات ہے کہ اس طرح ہمارا حلقہ وسیع ہوگا۔ ہماری مقدس کتاب بھی تو یہی کہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تبلیغ کرو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے میں شامل کرو۔ یہ شخص تو خود سے چل کر ہمارے پاس آیا ہے اور پھر ہمارے ملک کے آئین میں بھی درج ہے کہ کوئی بھی بالغ فرد اُن تمام معاملات میں اپنا فیصلہ کرنے کے لیے خودمختار ہے۔' اس شخص نے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

'لیکن حضور ہمیں یہ بھی تو دیکھنا ہوگا کہ اس کا اصل منشا کیا ہے؟ کہیں اس طرح ہمیں فائدہ کے بجائے نقصان نہ پہنچ جائے؟' ایک دوسرے نے پہلے والے شخص سے سوال کیا۔

'ارے بھائی، ظاہر سی بات ہے وہ ہمارے یہاں کی خوبیوں اور اچھائیوں سے متاثر ہو کر ہی ہم میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ آخر ہماری مثل... ہماری نظیر کہیں اور ہے کیا؟' ایک شخص نے فخریہ لہجے میں کہا۔'ہمارے یہاں کی مساوات دیکھو۔ ہمارے یہاں کی اخوت دیکھو۔ ہمارے یہاں کا عدل دیکھو۔ ہمارے یہاں کی یکجہتی دیکھو۔ کیا کیا دیکھو گے۔ ہم بلا تفریق شانہ بہ شانہ ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ ہمارا امام کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ہمارے مقدس صحیفے کوئی بھی پڑھ سن سکتا ہے۔ ہمارے مابین کوئی امتیاز نہیں۔ کوئی بندش نہیں۔ ہم سب ایک رب کو ماننے والے ہیں۔' ایک سانس میں بولنے کے بعد اس شخص نے ذرا تحمل سے کام لیا اور پھر آگے کی بات پوری کی۔'کیا یہ سب کہیں اور ملے گا؟'

وہاں خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ وہ شخص اپنی تقریر کا اثر جاننے کے لیے وہاں موجود ایک ایک فرد کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔

'آپ کی بات سو فیصد درست ہے۔ یقیناً وہ ہماری ان منفرد اور اعلا خصوصیات کی بنا

پر ہی ہماری جانب راغب ہوا ہے۔' ایک شخص نے پہلے والے شخص کی حمایت میں دھیرے سے کہا۔

'چلیے مان لیتے ہیں کہ وہ ہماری اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر ہم میں شامل ہونا چاہتا ہے لیکن اس کی طرز زندگی تو الگ رہی ہے؟ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمارا طریقۂ کار اپنا سکے گا؟' بولنے والے نے اپنی دانست میں دور کی کوڑی پیش کی۔

'دیکھیے حضرات، ایک محاورہ ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے... صحبت میں رہے گا تو کیا کچھ نہیں سیکھ جائے گا۔ ہم لوگ یہ نہ بھولیں کہ ہم کوئی براہ راست کھجوروں کے دیس سے نہیں آئے ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد یہیں کے تھے اور دوسرے حلقے سے ہی اس میں منتقل ہوئے ہیں لیکن کیا کوئی ہمیں دیکھ کر آج یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم پہلے کچھ اور تھے؟'

شاید بولنے والے نے کچھ تلخ مثال پیش کر دی تھی۔ کئی لوگوں نے اسے اضطراب میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس شخص کے بولنے کے بعد کافی دیر تک سکوت کا عالم طاری رہا۔

رات کی عبادت کا وقت ہو چلا تھا۔

'حاضرین! ایک شخص جو خود چل کر ہمارے پاس آیا ہے، اگر ہم اس کا خیر مقدم نہیں کریں گے تو ہم گنہگار ہوں گے۔ کل وہ ہمارا دامن گیر ہوگا۔ وہ ہم سے سوال کرے گا اور ہم اپنے معبود کے سامنے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ کیا اس عدالت میں اس کے سوالوں کا کوئی جواب ہوگا ہمارے پاس؟' اس عمر دراز شخص نے بولتے ہوئے اپنے بدن میں لرزش سی محسوس کی۔

لوگ خاموش تھے اور غور و فکر میں مبتلا تھے۔

'ویسے بھی اس گاؤں میں ہم لوگ تعداد کے اعتبار سے کافی کم ہیں۔ ہماری تعداد

کچھ تو بڑھے گی۔ہم کچھ تو مستحکم ہوں گے؟' ایک نئ عمر کے شخص نے ذرا طیش میں آ کر کہا تو یک لخت موجود سبھی کی عقل وفہم کے دروازے گویا وا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں اس کی دلیل سب کو پسند آئی۔لیکن کچھ لوگوں نے اسے ناپسندیدگی سے بھی دیکھا۔انہیں اس کی بات گراں گزری تھی۔نئ عمر کا شخص ٹپٹا گیا۔اس کو گھور کر دیکھنے والوں میں سے ایک نے، جس کا ان سبھی میں شاید معتبر مقام حاصل تھا، حتمی طور پر بولا۔'ہمیں بہر حال یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ہماری نمایاں اور اعلیٰ خصوصیات کی بناپر ہم میں داخل ہو رہا ہے۔'

اس فیصلے پر سبھی کا اجماع ہوا اور سب نے ایک آواز میں کہا۔'خوش آمدید...خوش آمدید...مبارکہ...مبارکہ...'

مقام۔نوکیلے گنبد والی عبادت گاہ کا چبوترہ

ماحول میں اگربتی، چندن اور ناریل کے جلنے کی بھینی بھینی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ وہاں موجود سبھی لوگ یوں تو چپ تھے لیکن ان کے چہرے کی طنابیں کسی ہوئی تھیں۔ بتانے والے نے جو بتایا تھا اس پر یقین کرنا ویسے تو مشکل تھا لیکن یقین نہیں کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آ رہی تھی۔یقینی اور بے یقینی کے بھنور میں غوطے لگا تا جاننے والے نے پھر تسلی کرنی چاہی۔

'کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ وہی تھا؟'

'ہاں میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہی تھا۔'

'آخر وہ ان کے پاس کیوں گیا ہو گا؟'

'ہو سکتا ہے اس دن جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کی وجہ سے۔'

'ارے نہیں، یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔اس کے تو وہ عادی ہو چکے ہیں۔اس کو اس کی بھول

کی جو سزا ملی وہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں؟ وہ بھول کرتے آرہے ہیں اور انھیں سزا ملتی رہی ہے۔ یہ تو زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔' بولنے والے شخص کی آواز کے پیمانے سے اعتماد چھلک چھلک کر باہر آرہا تھا۔

'میرے خیال سے وہ ان کے پاس کام مانگنے کی غرض سے گیا ہوگا۔ آخر ایسے لوگوں کو معاش کا مسئلہ بھی تو درپیش ہوتا ہے؟ یا پھر علاج کرانے کے لیے قرض ورض لینے گیا ہوگا؟ ان لوگوں سے انھیں بنا بیاج کا قرض بھی تو مہیا ہوتا ہے۔' ایک شخص نے اپنا جواز پیش کیا۔

'میں سمجھتا ہوں...' ایک شخص ذرا سا رکا پھر بولا۔'وہ ان سے اپنا دکھڑا سنانے گیا ہوگا، مدد مانگنے گیا ہوگا؟'

'ارے نہیں۔ ان سے بھلا اسے کیا مدد ملے گی؟ اسے دکھڑا سنانا ہوتا اور مدد لینی ہوتی تو 'لال جھنڈین' کے پاس جاتا۔ جاکر اُن میں شامل ہو جاتا۔' پہلے والے شخص نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

'ان کے پاس وہ کیا جائے اور کیوں جائے؟' ایک شخص مضحکہ خیز انداز میں بولا۔' اب ان سے ان کے توقعات وابستہ ہی کہاں رہ گئے ہیں؟ ان کے خواب خواب ہی رہ گئے۔ اب تو ان خوابوں پر گرد وغبار پڑ چکے ہیں۔ جو اندھیرے میں اپنا وجود تلاش کر رہا ہو، اپنے ہونے کا جواز ڈھونڈ رہا ہو، جو خود راستے سے بھٹک گیا ہو، وہ دوسرے کو کیا راستہ دکھائے گا؟ اچھا ہی ہے، ایک دم جینا محال ہو گیا تھا۔'

'لیکن یہ سوال تو اپنی جگہ ہنوز ایستادہ ہے کہ وہ گول گنبد والوں کے پاس کیوں کر گیا تھا؟' وہاں بیٹھے سب سے بزرگ شخص نے اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

'وہ ان میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں اطلاع کے مطابق پورا کا پورا

شمالی ٹولہ ان میں شامل ہونے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔' نووارد شخص کے اس انکشاف سے وہاں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ لوگ مشتعل ہو اُٹھے اور طیش میں کھڑے ہو گئے، کچھ زور زور سے بولنے لگے۔ کچھ وقفہ تک وہاں کا ماحول افراتفری کا شکار رہا پھر معتبر دکھنے والے شخص نے کسی طور سب کو شانت کرایا۔

سکوت ایسا کہ سوئی بھی گرے تو کان کے پردے پھٹ جائیں۔ سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے؟ سبھی کے چہرے پر ایک ہی سوال پتا ہوا تھا۔

'سوچنے والی بات یہ ہے کہ آخر اس نے ان میں ایسی کیا خاص بات دیکھی جو اُن میں شامل ہونے چلا گیا؟ کیا اسے علم نہیں کہ ہم سے بہتر کوئی نہیں۔ ہم سب سے پرانے ہیں۔ ہماری ریتی رواج دنیا کی سب سے پرانی ریتی رواج ہے۔ ہمارے یہاں ہر کسی کے لیے اور ہر کام کا ایک منظم طریقہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے زندگی گزارنے اور اپنی دوسری دنیا کو سنوارنے کے لیے جو آئین بنائے ہیں اس کے مطابق ہر کسی کی حیثیت، اس کا مقام اور اس کے کام مقرر کر دیے گئے ہیں۔ کسی کے معاملے میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ یہ دنیا کی سب سے قدیم تہذیب اور سب سے بہتر نظامِ زندگی ہے۔ اتنے بہتر نظام کو چھوڑ کر وہ کس گڈھے میں گرنے جا رہا ہے۔ کیا اس کی عقل و دانش پر پردہ پڑ گیا ہے؟ ہمارا متبادل کوئی ہے کیا؟' ایک بزرگ شخص نے درمیان میں گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

'میں تو کہتا ہوں، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ ہم لوگوں کو صرف نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے کسی قدر یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم سے بہتر بھی کوئی ہے اور اس کی جب کبھی بھی خواہش ہو گی وہ ہمیں ٹھینگا دکھا سکتا ہے۔' ایک شخص نے اپنی کھیج نکالی۔

'آپ لوگ خواہ مخواہ اس پر اپنی ناراضگی ظاہر کر رہے ہیں۔ مسئلے کی اصل جڑ تو کہیں اور ہے۔ ہمارے لوگ تو بڑے معصوم ہوتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اسے ضرور گمراہ کیا گیا ہے۔ اسے ہمارے خلاف بدظن کیا گیا ہے۔' ایک نئی عمر کے شخص نے اپنی بات رکھی۔ ایک دوسرے شخص نے اس کی تائید کی۔

'بلکہ میری سمجھ میں تو یہ آ رہا ہے کہ اسے ضرور کسی نہ کسی طرح کی لالچ دی گئی ہوگی۔ یہ بڑے عیار قسم لوگ ہیں۔ ان کی ہر کوشش میں یہی مقصد پنہاں ہوتا ہے کہ... ایک دن پوری سرزمیں پر ان کا ہی پرچم لہرائے، پوری دنیا پر ان کی ہی حکومت ہو۔'

'ہاں، ہاں۔ ایسا ہی ہے... ایسا ہی ہے۔' تقریباً سبھی نے بولنے والے سے اتفاق کیا اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرانے لگے۔

مقام۔ گاؤں کا فٹ بال میدان

بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ میدان کے کنارے قطاروں میں گل موہر کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ ایک گل موہر کے نیچے دری بچھی ہوئی تھی اور فریقین آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کشیدگی دونوں اطراف حائل تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک جانب سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

'ہم لوگ اتنے دنوں سے ساتھ رہتے آ رہے ہیں...'

'ہمیں بھی اس کا پاس ہے...'

'آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا...؟'

'ہم لوگوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا...'

'کیا آپ لوگوں نے اسے گمراہ نہیں کیا... کیا آپ لوگوں نے اسے ہمارے خلاف

نہیں بھڑکایا...کیا آپ لوگوں نے اسے لالچ نہیں دی...؟'

'ہم لوگوں نے اسے قطعی گمراہ نہیں کیا...ہم نے اسے قطعی نہیں بھڑکایا...اور ہم نے اسے کوئی لالچ بھی نہیں دی...'

'کیا یہ بھی غلط ہے کہ آپ لوگ اس کے پاس گئے تھے...؟'

'بالکل غلط ہے...وہ خود چل کر ہمارے پاس آیا تھا...'

'ایسا نہیں ہوسکتا...'

'ایسا ہی ہوا ہے...'

'ایسا کیسے ہوسکتا ہے...؟'

'ایسا کیوں نہیں ہوسکتا...؟'

'اس کی تصدیق کون کرے گا...؟'

'اس کی تصدیق وہی کرے گا...'

'اگر وہ منع کردے تو...؟'

'ہمیں کوئی اعتراض نہیں...'

'اگر وہ منع نہیں کرے تو...؟'

'تو ہمارا دروازہ کھلا ہے...'

'اس کا فیصلہ آپ کو منظور ہوگا...؟'

'کیا آپ کو منظور ہوگا...؟'

'ہاں ہمیں منظور ہوگا...'

'ہمیں بھی منظور ہوگا...'

طے پایا کہ اگلی نشست میں اسے بلا کر اس کا حل نکالا جائے۔ فٹ بال کا کھیل بھی

ختم ہو گیا تھا۔ نہ کوئی جیتا نہ کوئی ہارا۔ بچے تالیاں بجا رہے تھے۔

مقام۔ سیاسی پارٹی کا دفتر

رہنما کے تشریف رکھتے ہی کارکن بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور میٹنگ کی کارروائی شروع ہو گئی۔

'جیسا کہ آپ سبھی کو علم ہے کہ انتخاب سر پر آن پہنچا ہے۔' رہنما نے بات شروع کی۔ 'اور جب سے آپ سب نے مجھے اپنا رہنما منتخب کیا ہے تب سے مخالف پارٹیوں کے درمیان کھلبلی مچی ہوئی ہے اور ان لوگوں نے اپنی تیاریاں زور وشور سے شروع کر دی ہیں۔ ہمیں بھی کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا ہے اور ہر طرح سے اپنی تیاری مکمل کرنی ہے۔ اگر ہمیں حکومت حاصل کرنی ہے تو اس انتخاب میں ہمیں اپنا دھیان ان علاقوں پر مرکوز کرنا ہوگا جہاں سے ہمیں گذشتہ انتخابات میں یا تو کم ووٹ ملے ہیں یا پھر بالکل صفر ملے ہیں۔ ایسے علاقوں کے لیے ہمیں کچھ خاص منصوبے تیار کرنے ہوں گے۔'

'ایسے علاقوں میں ہم جلسے جلوس زیادہ منعقد کریں گے اور اشتہار پر زیادہ زور دیں گے...' ایک کارکن نے جوش وولولوں سے لبریز ہو کر کہا۔

'ان علاقوں میں ہم موجودہ حکومت کی ناکامیوں کو بھی مشتہر کریں گے تا کہ لوگوں کو ہم میں امید کی نئی کرن نظر آئے...' ایک دوسرے کارکن نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

'ان علاقوں میں ہم اپنے ترقیاتی منصوبوں کو بیان کریں گے اور ترقی کی نہر بہا دینے کا وعدہ کریں گے تا کہ برسوں سے زبوں حالی کے شکار وہ لوگ دوسرے کو اپنا مسیحا بنانے کے اپنے سابقہ فیصلے کو مسترد کر دیں...'

ایک کی، دوسرے کی پھر تیسرے کارکن کی بات بھی رہنما نے بغور سنی، ذرا توقف کیا

پھر بولنا شروع کیا۔

'دوستو...آپ لوگ جن حربوں کی بات کر رہے ہیں، اب ان کا زمانہ نہیں رہا۔ جنتا بخوبی سمجھ چکی ہے کہ یہ سب محض سیاسی نعروں کے کچھ بھی نہیں۔ ان کو پتا ہے کہ ان کی ترقی، ان کے مسئلوں سے کسی کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ جو بھی آتا ہے وہ صرف انہیں چھلنے کے لیے آتا ہے...ایسی حالت میں، جب ترکش کے سارے تیر ناکام ہو جائیں، کیا بچتا ہے؟' رہنما نے گہری نظر کارکنوں پر ڈالی۔ 'تب بچتا ہے اِموشن... جذبات... عقائد... یہ ایک ایسا آزمودہ ہتھیار ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ نشانے پر لگتا ہی لگتا ہے اور اپنے ملک میں تو لوگ اِموشن کے اس قدر غلام ہیں کہ صبح کی اپنی ٹٹی سے بھی ان کا اِموشن جڑا ہوتا ہے۔ یہی کمزور رگ ہے یہاں کے عوام الناس کی۔ اسے پکڑنے کی کوشش کیجئے...' رہنما اپنی بات آگے جاری رکھتا کہ ایک شخص نے آکر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ رہنما کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ابھر آئی، اس نے آگے کہا۔

'جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں ان علاقوں پر اپنا دھیان مرکوز کرنا ہوگا جہاں کے ووٹر مخالف کے زیر اثر ہیں اور انہیں اپنا ووٹ دیتے رہے ہیں۔ جیسے کہ ٹشمن پورہ۔ تواریخ گواہ ہے، آزادی کے بعد سے اب تک ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود وہاں سے ہمیں ایک بھی ووٹ نہیں ملا ہے جب کہ وہاں اکثریت ہمارے لوگوں کی ہی ہے۔' کچھ لمحہ رک کر سانس لینے کے بعد اس نے کہا۔

'...آپ لوگ اپنے پورے جسم کو کان بنا کر میری بات سن لیں، اگر اس بار بھی وہاں کے لوگ آپ کی طرف نہیں جھکے اور آپ کو اپنا ووٹ نہیں دیا تو سمجھ لیجئے حکومت کرنے کا ہمارا خواب، خواب ہی رہ جائے گا...' کہہ چکنے کے بعد رہنما اپنے کارکنوں کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔

'وہاں تو کامیابی ملنا مشکوک ہے۔بالکل مشکوک ہے...' کارکنوں کے درمیان سرگوشی جاری ہوگئی تھی۔

' کچھ بھی مشکوک نہیں...کچھ بھی ناممکن نہیں۔آپ سب میری بات سنیں...' رہنما نے انہیں شانت کرایا، ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور پھر سرگوشیوں میں انہیں کچھ سمجھانے لگا۔ اس کی بات جوں جوں پوری ہورہی تھی، کارکنوں کے چہرے کھلتے جارہے تھے۔

'اس سے قبل کہ وہاں کا معاملہ رفع دفع ہوجائے آپ...' آخری بات ادھوری بول کر رہنما چپ ہوگیا تھا۔

' آپ اطمینان رکھیں...آپ اطمینان رکھیں...' کارکنوں کا جوش ٹھاں ٹھیں مارنے لگا تھا۔رہنما کچھ لمحوں تک ان کے جوش اور ولولوں کو محسوس کرتا رہا پھر اپنے دو مخصوص کارکنوں کی جانب مخاطب ہوکر بولا۔

'وہاں کے لیے پارٹی نے جو لائحہ عمل تیار کیا ہے اس کے متعلق آپ لوگوں کو کچھ کہنا تو نہیں ہے؟'

'نہیں، بالکل نہیں۔آپ بجا فرماتے ہیں۔ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ہم آپ کے وفادار ہیں، ہم آپ کے وفادار ہیں۔'بولتے ہوئے دونوں مخصوص کارکنوں کو محسوس ہوا گویا ان کے جسم کے عقبی حصے میں کوئی زائد عضو نمودار ہوآیا ہے اور تیزی سے ہلنے لگا ہے۔رہنما کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیل گئے تھے۔

مقام۔شمن پورہ گاؤں

وہ غائب ہوگیا تھا۔اس کی تلاش شدت کے ساتھ کی جارہی تھی لیکن وہ اپنی بیوی بچے کے ساتھ غائب ہوچکا تھا۔اس کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور گھر کے اندر اس کے

اثاثے جوں کے توں پڑے ہوئے تھے لیکن وہاں اس کی یا اس کی بیوی اور بچے کی موجودگی کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔

گاؤں کی فضا مکدر ہوگئی تھی۔ ماحول میں افواہ، شک وشبہات، غصہ، نفرت کسی وبائی مرض کی طرح پھیلنے لگی تھی۔

'بھاگ گیا سا...لا...'

ایک جماعت کا خیال تھا۔

'ڈر کی وجہ سے بھاگ گیا۔'

دوسری جماعت کا خیال تھا۔

'بھاگ گیا یا بھگا دیا گیا؟' دونوں جماعتیں سوچ رہی تھیں۔

'ضرور اُن لوگوں نے اسے بھگا دیا ہے؟' ایک جماعت نے نتیجہ اخذ کیا۔

'ضرور انھوں نے ہی اسے خوف زدہ کر کے بھگایا ہے...' دوسری جماعت نے بھی فیصلہ کن طریقے سے سوچا۔

دونوں جماعتوں میں غلط فہمی بھی خوش فہمی بھی۔ دونوں جماعتیں اسے اپنی اپنی میراث سمجھ رہی تھیں اور اس کو لے کر دونوں جماعتوں کے مابین صف آرائیاں شروع ہوگئی تھیں۔

'آپ لوگوں کو اس کی قیمت چکانی ہوگی...'

'آپ لوگوں کو بھی اس کی قیمت چکانی ہوگی...'

'ہم دکھا دیں گے...'

'ہم بھی دکھا دیں گے...'

وہ رات دونوں جماعتوں نے رتجگا کر کے گزاری۔

صبح صبح سب کی ناک تیز خوشبو سے پھڑ کنے لگی۔ گاؤں کی گلی گلی خوشبو سے معطر ہو اٹھی۔ اس نے عطر کی پوری شیشی شاید بدن پر انڈیل رکھی تھی۔ چار خانے کی لنگی، سفید کرتا اور کندھے پر چار خانے کا ہی ہرے رنگ کا صافہ۔ آنکھوں میں گہرا سرمہ لگائے وہ جدھر سے گزر رہا تھا سب کی آنکھیں برساتی ندی کی طرح چوڑی ہوئی جا رہی تھیں۔

وہ لوٹ آیا تھا۔

پورا دن گرم اور اجنبی ہوائیں گاؤں کا محاصرہ کرتی رہیں۔ رات ہوئی تو شعلہ بار ہو اٹھیں۔ مکانات دھودھو کر جلنے لگے۔ چیخ و پکار، کہرام...نوحہ...بین....

نقصان دونوں طرف ہوا۔ لوگ دونوں طرف کے مارے گئے۔ وہ اور اس کی بیوی بچے بھی مارے گئے۔ لیکن ان کا مارا جانا کس کا نقصان تھا، نقصان تھا بھی یا نہیں، اس کا جواب شاید کسی کے پاس نہ تھا۔

مقام۔ گاؤں کا قبرستان

جو زندہ بچ گئے تھے وہ مرنے والوں کو دفنا رہے تھے۔ بچوں کے...بوڑھوں کے... عورت اور مردوں کے...ایک ایک کر سارے جنازے دفنائے جاتے رہے۔ اس کا اور اس کی بیوی بچے کا جنازہ بھی اپنے دفنائے جانے کا منتظر رہا۔ وقت گزرتا رہا، گزرتا رہا، کافی گزر گیا۔ ان کے جنازے پڑے رہے۔

مسئلہ درپیش تھا...

'ان کے جنازے ہمارے قبرستان میں کیسے دفنائے جا سکتے ہیں...؟'

'کیوں، اب تو وہ ہماری جماعت کا حصہ تھے...'

'ہاں...لیکن انھوں نے تبدل اختیار کیا تھا...'

'ہم لوگوں نے بھی تو تبدل ہی اختیار کیا ہے..'

'ہماری بات کچھ اور ہے...ہم لوگ وہاں ناف سے اوپر والے تھے اور یہ.....اس لیے....'

جنازوں کے اپنے دفنائے جانے کا انتظار طویل سے طویل ہوتا گیا یہاں تک کہ ان میں تعفن پیدا ہونے لگا۔

مقام۔عالم ارواح

وہ، اس کی بیوی اور اس کا بیٹا ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہیں۔

وہ اپنے بیٹے کو دیکھ کر مسکرایا۔ بیٹا سمجھ نہ سکا، ماجرا کیا ہے۔ اس کا باپ کیوں مسکرا رہا ہے۔ وہ اس کا مسکرانے کا سبب جاننا چاہتا تھا۔

وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اس کی مسکراہٹ کی وجہ سے تذبذب میں مبتلا ہے۔

عفونت سے اس کی ناک بجبجا اٹھی۔

'میرے پاس تمہارے لیے ایک امانت ہے...'

اس نے پشتینی امانت اپنے بیٹے کو سونپ دی۔

❁❁❁

بوڑھے بھی تنگ کرتے ہیں

'شرماوِلا' میں رہنے والے ایک ایک فرد کا چہرہ سوال بنا ہوا تھا۔

اے پی شرما ملازمت سے سبک دوش ہو چکے انردھ پرساد شرما شام پانچ بجے اِوننگ واک کے لیے گھر سے نکلے تھے اور ابھی رات کے دس بجے تک واپس نہیں لوٹے تھے۔ دو بیٹوں بڑے اور چھوٹے، دو بہوؤں بڑی اور چھوٹی اور سونو نام کے ایک پوتا والے اے پی شرما کا یوں تو یہ ان کی اپنی خاص طرز زندگی کا ایک حصہ تھا لیکن تشویش والی بات یہ تھی کہ اس ہاڑ کپا دینے والی سردی میں اے پی شرما یعنی کہ ڈیڈ اپنا اوورکوٹ اور ہیٹ ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ اس کے بنا انہیں سردی لگ جائے گی، سانس کی پریشانی بڑھ جائے گی اور 'شرماوِلا' کی اینٹیں ہل جائیں گی۔

بڑے، دو بار احمد بھائی کی چائے دکان کا چکّر لگا آیا تھا۔ اکثر بیٹھا کرتے ہیں وہاں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کا اڈّا ہے۔ خوب چھنتی ہے ان کے ساتھ بڑھؤ کی۔ کتنی بار منع کیا ہے، مت بیٹھا کریں وہاں... کیسے بیٹھ لیتے ہیں، ماں کا لونڑا... بین کا لونڑا کرنے والوں کے ساتھ... پر کہاں ماننے والے۔ بس ایک ہی جواب، دخل مت دیا کرو میرے معاملوں

میں...ٹھیک ہے بھئی، نہیں دیتے دخل...کرو جو جی میں آئے....

لیکن آج تو وہاں بھی نہیں تھے۔ چھوٹے نے ان کے سبھی ملنے والوں، جو انگلیوں کی گنتی بھر تھے، کو فون لگا کر پوچھ لیا تھا۔ کہیں نہیں تھے، کسی کے پاس نہیں تھے۔

ٹی وی پر موسم کا حال بتانے والی اس لڑکی نے جو، جیسے ناک سے بولا کرتی تھی، جو بالکل پسند نہیں آتی تھی ڈیڈ کو، ان کے مطابق 'ممیاتے' ہوئے بتایا تھا، ٹمپریچر پانچ ڈگری۔ کہنے پر یقین ہی نہیں کریں گے۔ نہیں کریں گے کہ انہیں اس کا 'ممیانا' پسند نہیں۔ ار...رے ...کسی کی ممیانے جیسی آواز کیول ہونے سے حقیقت تھوڑے بدل جائے گی۔ درجۂ حرارت پانچ ڈگری ہے تو وہ پانچ ڈگری بتائے گی۔ اس کی آواز سے کیا لینا دینا؟ لینا دینا تو پانچ ڈگری کے ٹیمپریچر سے ہے۔ اب اُسے وہ ممیا کر بتائے یا ہنہنا کر بتائے۔ پچھلے پانچ سالوں کا ریکارڈ ٹوٹا ہے۔ ایسا کہرا اور سردی کہ گلی کے کتے کتیاں بھی دبکے پڑے ہیں کونے کھدروں میں۔ بھئی کیا کریں...دبکیں نہیں تو...کچھ ہو ہوا گیا تو انہیں کون لے جانے والا ڈاکٹر حکیم کے پاس۔ یہاں تو یہ ہے کہ...ہم ہیں پڑے...ایک ایک فرد...ایک ایک پیر پر کھڑا...یہ ڈاکٹر، وہ ڈاکٹر کرنے والا...سانس کے مریض کے لیے ٹھنڈک، دھول، دھواں تو ویسے بھی زہر ہے، لیکن کون سمجھائے...سمجھایا تو سونو کو جاتا ہے...بچے کو...ناتی، پوتا والے کو سمجھانا، کیا خود کو بے وقوف بنانے جیسا نہیں ہے اور اگر کوئی سمجھانے کی جرأت کر بھی لے تو چھلا بنا کر سگریٹ کا دھواں ایسے اس کے منہ پر اگلیں گے جیسے...کرلو، جو کرنا ہے....

بڑھؤ نے ایکدم سے ناک میں دم کر دیا ہے....

بڑی کئی بار جھانک آئی تھی چینل سے باہر۔ سونو کو بھیجا کئی بار مفلر ٹفلر باندھ کر گلی کے موڑ پر، آنکھیں گڑا کر دیکھنے کے لیے کہرے میں۔ اوپر سے شال بھی لپیٹا۔ چو رہا ہے ٹپ ٹپ۔ جیسے اوس نہیں، پگھلے ہوئے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔

چھوٹی، شام سے ہی جو کھڑکی سے لگی کھڑی تھی، تو ہلی نہیں تھی۔ ابھی پچھلے سال آئی تھی وہ۔ اتنے دنوں میں ہی پہچان گئی تھی ڈیڈ کی آہٹ کو۔ ہر آہٹ پر کان لگائے کھڑی تھی۔

بڑے سے رہا نہیں گیا۔ وِنڈ چیٹر کی ٹوپی باندھتا پھر نکلا بے چین من کو شانت کرنے۔ دل میں اندیشہ... سردیوں میں اینٹھ کر کہیں گرے پڑے نہ ہوں... بڑھاپے کی ہڈیاں... کہاں جھیل پائیں گی ہڈیوں میں چھید کر دینے والی ٹھنڈ... اور من میں کھیج بھی... کیا ضرورت تھی ایسی سردی میں باہر جانے کی... اور وہ بھی بنا گرم کپڑوں کے... سچ، بڑھؤ نے ایکدم سے... کیا، کوئی اس طرح بھی پریشان کرتا ہے... اور یہ اوس... چہرہ بھیگ رہا ہے، جیسے اوس کی شکل میں پھوہاریں پڑ رہی ہیں۔

روزانہ کا معمول ہے۔ مارننگ واک اور اِوننگ واک۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کی بیماریاں ہیں یہ سب۔ ریل میں تھے تو اٹارسی ممبئی کرتے رہے۔ وہ جو چکر کی بندھی پیروں میں تو آج تک بندھی ہے۔ کتنی بار کہا، تھک گئے ہیں... آرام سے رہیے... محلّے کے اور بوڑھوں کو دیکھئے... آرام کر رہے ہیں... ان سے کسی کو پریشانی نہیں ہوتی... شام کو سب پارک میں جمع ہوتے ہیں... لیکن انہیں تو دنیا کے سبھی بوڑھوں سے چڑھ ہے... کیسی حقارت سے کہتے ہیں... بلڈی اولڈ مین... ہاں بھئی، اولڈ مین تو ہیں... آپ بھی تو کوئی جوان نہیں ہو... سانس کے مریض ہیں... پانچ بجے سے جو نکلے ہیں تو اس سردی میں ابھی تک کہاں ہیں، کچھ اتا پتا نہیں ہے....

گلی کا موڑ مڑتے ہی چوراہے کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ گھنگھور کہرے کی وجہ سے زیادہ دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی، بس کچھ دور تک دھواں بھرے پائپ ہول سی لگ رہی تھی۔

چوراہے پر دھند کے پیراہن میں لپٹے ایک ٹھیلے کے پاس ڈیڈ دہی بڑے کھاتے

ہوئے نظر آگئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر تو بڑے کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی تھی۔

'ڈیڈ... یہ کیا کر رہے ہیں...؟' بے انتہا سردی اور بے انتہا خفگی... اس کے منہ سے بھک بھک بھاپ کے گولے نکلے۔

'دہی بڑے کھا رہا ہوں...' ڈیڈ پر سکون تھے۔ ٹھیلے والے سے اور مرچی ڈلوا رہے تھے۔

'اس موسم میں...؟' وہ اندر سے تقریباً اپنی پوری قوت کے ساتھ چیخ رہا تھا۔

'دہی بڑوں کا کوئی موسم ہوتا ہے...؟' ذرا رکے تھے ڈیڈ، پہلے کی طرح پرسکون لہجہ میں بولے۔ 'دراصل یہاں تم دہی بڑا اور موسم کی بات نہیں کر رہے، تم ان دونوں کے چشمہ سے میری عمر کو دیکھ رہے ہو... اکثر دیکھتے ہو... اکثر لوگ دیکھتے ہیں... برخوردار... جیون کا پہیہ عمر سے نہیں من کی طاقت سے چلتا ہے...' ڈیڈ نے لکڑی کا چمچ دونے کے کونے کونے میں گھمایا تھا۔ 'پر تم' اتنی سردی میں، اتنی رات کو، کہاں جا رہے ہو...؟'

حالات بدل گئے تھے۔ جملے کو توڑ توڑ کر ڈیڈ نے جو الٹ بانسی کی تھی اس سے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ 'کہاں جا رہا ہوں...؟' کہاں تو اسے اتنی دیر تک ان کے غائب رہنے کی وجہ پوچھنی تھی اور پوچھ کر اپنی کھیج کو شانت کرنا تھا، کہاں اب اسے اپنی صفائی سوچنی پڑ رہی تھی۔ اس مضحکہ خیز، بے بس حالات کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھا۔

'میں تو آپ کو دیکھنے نکلا تھا...'

'مجھے دیکھنے... کیا میں بچہّ ہوں... سونو ہوں... کیا میں اپنی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا... دیکھو مسٹر...'

'اوکے... اوکے...' سپردگی کا تاثر۔ 'چلیے، گھر چلتے ہیں...' زبردست صبر و استقلال کا

ثبوت دیتے ہوئے اس نے کہا۔اس کی خواہش ہورہی تھی ،زور زور سے چیخے ،چیخنے لگے۔

وہی ہوا تھا۔ڈیڈ چھینکنے لگے تھے۔چھینکنا شروع کرتے تو چھینکوں کی لڑی جھڑی لگا دیتے۔بڑی نے جلدی جلدی جوشاندہ اوٹنا،چھوٹی لے کر کمرے میں گئی۔سوچا،کمبل ومبل اوڑھ کر لیٹے ہوں گے ڈیڈ۔لیکن ڈیڈ تو...کمپیوٹر پر فیس بک کھلا ہوا تھا۔تھوڑا جھکے، مانیٹر پر آنکھیں گڑائے،ڈیڈ نیٹ سرفنگ میں مصروف تھے۔جوشاندہ کا پیالہ ماؤس کے پاس رکھتے ہوئے وہ کن انکھیوں سے دیکھنے لگی۔خوبصورت گھنے بالوں والی تھی وہ،جس کی پروفائل ڈیڈ غور سے پڑھ رہے تھے۔اس نے ہڑبڑا کر پیالہ رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

'رکو...' ڈیڈ کی رعب دار آواز گونجتے ہی اس کے پیر زمین سے چپک گئے۔کھڑی ہوکر ان کی آواز کی اگلی کڑی کا انتظار کرنے لگی۔

'برکھا اوستھی...میری نئی فرینڈ...گڑگاؤں کی ہے...عمر 31 سال...انٹیریئر ڈزائنر ہے۔جانتی ہو،کل میں نے اسے فرینڈ بننے کے لیے انوٹیشن بھیجا تھا...میرا انوٹیشن قبول کر اس نے مجھے 'ہائے' کہا ہے...' ڈیڈ مچل اٹھے تھے۔'...اور اسی کے ساتھ میرے نائنٹی نائن فرینڈ ہوگئے...'ان کا جوش اور ولولہ دیکھنے کے قابل تھا۔

ڈیڈ مانیٹر پر کچھ اور جھک گئے تھے۔'ار...رے...یہ کیا...؟' ان کا جوش مزید بڑھ گیا تھا۔

برکھا آن لائن تھی۔ڈیڈ کو چیٹ کی دعوت دے رہی تھی۔

'بیٹھو بیٹھو...چیٹ کرتے ہیں...' ڈیڈ نے چھوٹی کا ہاتھ پکڑ کر پاس میں بیٹھا لیا تھا۔

'ہائے...آپ کون ہیں؟' ادھر سے برکھا پوچھ رہی تھی۔

'میں اے پی شرما...انردھ پرساد شرما...' ڈیڈ میسیج باکس میں ٹائپ کرنے لگے۔'آپ نے میرا پروفائل دیکھا ہوگا...ریٹائرڈ ریلوے ملازم ہوں...دو بیٹے ہیں...دہلی میں کچھ کچھ

کرتے ہیں...دونوں بہویں تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں..آپ کو دھرتی پر جنت اگر دیکھنا ہے تو میں آپ کو 'شرماولا' آنے کی دعوت دیتا ہوں..'

'رومانس...؟'

ڈیڈ پھڑک اٹھے تھے۔ چھوٹی کے کان کے پاس منہ لے جا کر پھسپھسائے، 'رومانس کے بارے میں پوچھ رہی ہے...'اس قدر دھیمی آواز کہ برکھا سن نہ لے۔'بتاؤ...بتاؤ کیا لکھوں اسے...؟'

چھوٹی اکبکا گئی۔ ڈیڈ کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا کہے، اسے کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ذرا دیر انتظار کے بعد ڈیڈ خود ہی جواب ٹائپ کرنے لگے تھے۔

'میرے خیال سے رومانس کوئی خاص واقعہ یا عمل نہیں ہوتا...یہ ایک نظریہ ہے...مثبت بھی...منفی بھی...یہ آپ پر انحصار کرتا ہے کہ آپ زندگی میں مثبت ہیں یا منفی... زندگی میں ملنے والا ہر درد...ہر خوشی...ہر جیت...ہر ہار، عمر کا ہر پڑاؤ... پوری کی پوری زندگی...پیدا ہونے سے لے کر موت تک کا پورا سفر، رومانس ہے... پوری زندگی ہی رومانس ہے...اس کی وسعت کو کسی دائرے میں محدود کرنے کے حق میں میں نہیں...اسے اس کے حقیقی شکل...'

چھوٹی کو نیند آ رہی تھی۔ بار بار منہ پھاڑ کر جمائی لے رہی تھی۔ نہ جانے ڈیڈ کا یہ دوستانہ کب تک چلنے والا تھا۔ دروازہ پر آ کر چھوٹے کئی بار اشارہ کر گیا تھا، اپنا سر پیٹ گیا تھا۔ ڈیڈ بھی جو ہیں نا...خود تو اس عمر میں...آج تو بری طرح پھنس گئی تھی وہ۔ اس نے قصداً منہ کو پورا پھیلا کر جمائی لی۔'ڈیڈ...بارہ بج گئے...'

ڈیڈ کا ذہن وقت کی جانب مبذول ہوا۔'ارے ہاں' جاؤ جاؤ، سو جاؤ...' ڈیڈ نے ایسے کہا تھا جیسے اسے جانے کی اجازت دے کر اُس پر بڑا سا احسان کیا ہو۔

رات میں سردی بارش بن کر برس گئی تھی۔ صبح سب کی آنکھیں کھلیں تو تیز بھیگی ہوئی، کنکنی ہوا چل رہی تھی۔ گھر آنگن، گلی محلّہ کچ کچ ہو رہا تھا۔ ڈیڈ کے کمرے میں دیکھا گیا تو ڈیڈ نہیں تھے۔ مارننگ واک پر نکل گئے تھے۔ بڑے کا دماغ گرم ہو گیا تھا۔

'بتاؤ تو... پوری رات کھائیں کھائیں کیے ہیں... اور اتنے خراب موسم میں مارننگ واک سوجھ رہی ہے بڑھؤ کو... میں تو کہتا ہوں، آج ہمیں انہیں اچھی طرح سمجھانا ہی ہوگا... دیکھو چھوٹے... تمہیں بھی اگر چین سے رہنا ہے تو... ہمیں منہ کھولنا ہی ہوگا... ارے یار، اب تو حد ہو گئی... اس طرح بھی کوئی...'

جوتوں کی دھمک سنائی دی تھی۔ یقیناً ڈیڈ ہوں گے۔ ڈیڈ کے جوتوں کے علاوہ، ایسی دھمک کوئی اور پیدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ آٹا چالتی بڑی، لوکی کترتی چھوٹی، ڈاڑھی بناتا بڑے، استری کرتا چھوٹے اور دانت مانجھتا سونو، لمحہ بھر کے لیے سب کے ہاتھ جہاں تھے، وہیں رک گئے تھے۔ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے الجھ گئی تھیں۔ 'کھڑا کیا ہے... جا کر دیکھ نا...' بڑی نے منہ سے کم آنکھوں سے زیادہ کہا تھا سونو سے۔ وہ گیا، آیا۔ ہاں میں گردن ہلائی۔ لوکی کترنا چھوڑ چھوٹی نے برآمدہ میں جھانکا تھا۔ چینل کے باہر ڈیڈ پیر پٹک کر جوتوں میں لگی کیچڑ جھاڑ رہے تھے۔

'اوف' اتنی کیچڑ... پھر دلی میں رہنے کا کیا فائدہ... گاؤں ہی ٹھیک ہے...'

محض اتنا ہی سن پائی تھی وہ۔ کلیجہ دھک... اب گاؤں جانا پڑے گا... چینل کھول برآمدے میں آ کر ڈیڈ جوتا کھولنے لگے تھے۔ جھکا جھک سفید جوتا کیچڑ سے گدڑی بن گیا تھا۔ اس درمیان چھوٹی سے بڑی تک، بڑی سے بڑے تک، بڑے سے چھوٹے تک اور چھوٹے سے سونو تک پھس پھس کرتی لیکن تیز رفتار سے بات پہنچ گئی تھی، اب گاؤں جانا پڑے گا۔ کیوں رات میں بوندا باندی ہو گئی... کیوں ڈیڈ اس موسم میں بھی ٹہلنے نکل گئے

...کیوں ان کے جوتوں میں کیچڑ لگ گئی...کیوں...کیوں...اچانک نہ جانے کتنے سوال سبھی کے دلوں کو کچوٹنے لگے تھے۔

'بڑے...' یہ ڈیڈ کی آواز تھی۔ ہوگئی چھٹی۔ اب باندھو بوریا بستر...

'گاؤں جانا ہے ڈیڈ...؟' سامنے حاضر ہوتے ہی بڑے نے پوچھا تھا۔

'گاؤں...' ڈیڈا کھڑ گئے تھے۔ گاؤں جا کر کیا کروگے تم لوگ؟ گاؤں میں تم لوگوں کا گزارا ہوگا؟ چلے ہو گاؤں جانے...تم تو اتنا کرو کہ میونسپل کمشنر کے نام ایک درخواست لکھو...وارڈ میں اتنی گندگی ہوگئی ہے کہ...آخر ہم ٹیکس کس بات کا دیتے ہیں...؟'

سبزی چھونکتی بڑی، ڈیڈ کا جوتا صاف کرتا چھوٹے اور جوتے کی کیچڑ سے کچ کچ ہوگئی فرش پر پوچھا لگاتی چھوٹی کی ٹھہری ہوی سانسیں چلنے لگیں۔ سب نے بیک وقت ایک ساتھ راحت کی سانس کھینچی۔

ڈیڈ نے اپنے کمرے میں فولڈنگ ڈال ایک اور بستر لگانے کا حکم دیا تھا۔ گاؤں سے گجادھر چاچا آرہے تھے۔ ان کے آنے کی خبر پا کر ڈیڈ میں بے انتہا جوش بھر گیا تھا۔ یوں تو گاؤں سے اکثر کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا۔ ڈیڈ نے پورے گاؤں والوں سے کہہ رکھا تھا، جب بھی کسی کو، کسی کام سے دہلی آنا پڑے، اسے 'شرماوِلا' کو چھوڑ کر کہیں اور رکنے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپن ٹنڈر کی طرح اس کھلی دعوت کا فائدہ گاؤں والے خوب اٹھاتے تھے۔ کوئی کام کی تلاش میں، کوئی علاج کرانے کی غرض سے، کوئی قطب مینار، لال قلعہ دیکھنے...خواہ جس کسی غرض سے دہلی آتا ہو، ٹھہرتا تھا 'شرماولا' میں ہی۔ اور جتنے دن تک ٹھہرتا تھا، اس کی خاطر توجہ میں 'شرماولا' کا ایک ایک فرد لگا رہتا تھا۔ ان کے کھانے پینے سے لے کر ہگنے موتنے تک پر توجہ دینی پڑتی تھی۔

گجادھر چاچا کو لے کر ڈیڈ زیادہ حساس تھے۔ ڈیڈ کی دانت کاٹی روٹی کھانے والے

تھے۔ بچپن میں، ڈیڈ کے ساتھ اونچے اونچے، سفید چکنے پیڑوں پر چڑھ کر کیتا اور کھیتوں میں سے بھٹا چرانے والے صرف ایک وہی بچے ہوئے تھے۔ ڈیڈ آج بھی ان کیتوں کی سہرن پیدا کر دینے والی ترشی اور بھنے ہوئے بھٹوں کی نرم نرم گرمی اپنے دانتوں کی جڑوں میں محسوس کیا کرتے تھے۔ باڑھ کا پانی اترنے کے بعد ندی میں پیلا ٹینگرا اور کالا کالا کینکڑا پکڑنے میں جو پورا کا پورا دن گذرتا تھا، اس کا بکھان کرتے ہوئے ڈیڈا اتنا جذباتی ہو اٹھتے تھے کہ آنکھوں کی کوروں سے پانی رسنے لگتا تھا۔

گجادھر چاچا دہلی آرہے تھے۔ وہی گجادھر چاچا، جو کبھی ٹرین پر نہیں چڑھے تھے۔ چڑھتے ہی نہیں تھے۔ کہتے، 'دو اِنچ کی پٹری پر چلے لے ٹرینوا... ایکر کا بھروسہ...' کہیں آنا جانا ہوتا تو بس وس سے ہی، ورنہ نہیں۔ پہلی بار ڈیڈ نے انہیں ٹانگ ٹونگ کر طوفان ایکسپریس میں بیٹھایا تھا اور دلی لے کر آئے تھے۔ گجادھر چاچا پورا سفر دم روکے ہوئے تھے۔ جب سہی سلامت دلی پہنچ گئے تو ایسا تاثر ان کے چہرے پر تھا جیسے غضب ہو گیا ہو۔ لیکن چسکا بھی لگ گیا گجادھر چاچا کو۔ جب جی میں آتا، من کرتا 'تو پھنوا' پر چڑھ جاتے۔ پھر ڈیڈ اور گجادھر چاچا، دونوں جب ملتے تو لگتا دنیا انکی ٹھوکروں پر آ گئی ہو۔ پورا پورا دن قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ... نہ جانے کہاں کہاں گھمکڑی کرتے، چوکڑی بھرتے رہتے۔ آنے سے قبل گجادھر چاچا جب مطلع کرتے تو ڈیڈ کہتے 'ستوا لیتے ایہا، ایہیجا لِٹّی چوکھا لگاوے کے...'

گجادھر چاچا ستو لے کر آتے تھے اور ڈیڈ پورے گھر کو ناچ نچا کر رکھ دیتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لِٹّی چوکھا کے لیے کنڈے کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

گجادھر چاچا جب تک رہتے، ڈیڈا یکدم سے بدلے ہوئے رہتے۔ ان کا ایک ایک پل گجادھر چاچا کے نام منسوب ہوتا۔ دو دو بجے رات تک اور کبھی کبھی تو صبح ہو جایا کرتی، لیکن

گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔ گاؤں کی سڑک پکی ہوگئی ہے... مکھیا کے چناؤ میں گاؤں دو پھانک ہوگیا ہے... دلتوں نے غیر مزروعہ زمین کے پٹا کے لیے بلاک کا گھیراؤ کیا... نہ جانے کتنی باتیں، کوئی اور چھور نہیں ہوتی تھی۔ اور آخر میں بات پھر وہیں آجاتی تھی، تڑبنے میں کھجور کے پیڑوں پر لٹکتی ہوئی تاڑی کی لبنی... ادھواڑ سے اس پر نشانہ لگانا... تیز پرویّا میں تاڑی کا چھر چھرا کر، گرنا اور اسے چلّو میں بھر کر سڑ سڑ پینا...

لیکن تھے تو ڈیڈ کے لنگوٹیا یار ہی۔ بہت ساری یکسانیت رکھتے تھے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا تھا، صبح صبح مرانڈا کی دو لیٹری بوتل میں پانی بھر کر بس میں بیٹھا کر ان کو دور لے جانا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ دن بھر طبیعت مچلاتی رہتی تھی۔ دراصل گجادھر چاچا ٹائلٹ میں 'فریش' نہیں ہو پاتے تھے۔ انہیں بس کے ذریعہ دور کھلے میں 'جھاڑا' کے لیے لے جانا پڑتا تھا۔ وہ کھلے میں ہی صبح کے معمول سے فارغ ہو پاتے تھے۔ ظاہری بات تھی، اس نیکی کے لیے اکثر چھوٹے ہی مہیا ہوا کرتا تھا۔ خود کو ٹھیل ٹھال کر جاتا تھا، جھنجھناتا تھا، 'ایک کیا کم تھے جو یہ دوسرے بھی...'

گجادھر چاچا آئے تو گھر میں ہلچل بڑھ گئی۔ 'کا ہو چھوٹکا ببوا... کا ہو بڑکا ببوا... کا حال با تو ہر لوگن کے...' ان کی زبان سن چھوٹی پورے منہ میں ساڑی کا پلّو ٹھونس ہنسی روکنے کی کوشش کرتی۔ سو نقل اتارتا تو بڑی جھڑکتی۔ بڑے بھی جھلاتا۔ ڈیڈ جو ہیں نا... سوچنا چاہیے، گھر میں ایک بچہ ہے...

سچائی یہ تھی کہ گھر میں اس وقت دو اور بچے تھے۔ رات کے بارہ بجے لوڈو کھیل رہے تھے۔ ڈیڈ نے پاسا پھینکا... چھکا... ایک... دو... تین... چار... پانچ... اووَر ہئی چھ... مار دیئی... چل گھر میں گھس جا... گوٹی پٹ جانے سے گجادھر چاچا کا منہ لٹک گیا تھا جب کہ ڈیڈ زور زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے، 'اے... اے... گجوا... منھ دیکھ اپنا... کیسن لٹک گیئل

باہو...'

اب باری گجادھر چاچا کی تھی۔ پاسا پھینکا تو چار آیا۔ ایک... دو... تین... اوور ہئی مرنی چار... اتفاق سے ڈیڈ کی گوٹی بھی پٹ گئی۔ گجادھر چاچا تو جیسے اچھلنے کودنے لگے۔' آ ہو بڑکا بوا... آ ہو چھوٹکا بوا... تنی شیشا لے آ وہو... بابو کے منھ دِکھاد...'

بغل والے کمرے میں بڑے پھرکی کی طرح ناچ رہا تھا،' یہ گھر ہے یا چڑیا گھر...؟ خود تو سوتے نہیں، دوسروں کا آرام بھی حرام کیے ہوئے ہیں...'

نہیں رہا گیا اس سے۔ ڈیڈ کے کمرے میں پہنچا۔

'ڈیڈ...'

دونوں حلق پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔' اچھا ہوا تم آ گئے بڑے...' نہیں تھم رہی ہنسی کو تھامنے کی محض کوشش سی کرتے ہوئے ڈیڈ نے کہا،'...دو کپ چائے کے لیے بڑی سے کہہ دو... اور تم، ابھی تک سوئے نہیں...؟ تمہیں صبح کام پر نہیں جانا کیا؟' پھر ہنسی کا ابال۔ بڑے پھین کی طرح بہتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، سارا غصہ بڑی پر نکلا،' انہیں چائے کیوں نہیں دے آتی...'

بڑے کا منہ دیکھتے رہ جانے کے علاوہ بڑی کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک ہفتہ رہنے کے بعد گجادھر چاچا گاؤں لوٹ گئے تھے۔ پر ڈیڈ کے اندر نہ جانے کتنی توانائی بھر گئے تھے۔ اب انہیں موسم کی نرمی گرمی کی رتّی برابر بھی پرواہ نہیں رہ گئی تھی۔ ساری بندشوں، رکاوٹوں کو تہس نہس کر جس طرح بے لگام دریا بہتا ہے، اسی طرح ڈیڈ بہہ رہے تھے۔

اس دن بڑے کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ سگریٹ کی بو آ رہی تھی۔ اس نے نتھنوں کو سکوڑا، پھیلایا۔ سگریٹ کی بو ہی تھی۔ ڈیڈ کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اسے سمجھتے دیر نہیں لگی، ڈیڈ

سگریٹ پی رہے ہیں...دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر وہ ڈیڈ کے کمرے میں پہنچا۔

'ڈیڈ...' کمرے میں دھواں اور اس کی کسیلی گندھ بھری ہوئی تھی۔

ڈیڈ نے ضد بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

'ہم لوگ تنگ آ گئے ہیں ڈیڈ...آخر کیا چاہتے ہیں آپ...؟'

'تم لوگ کیا چاہتے ہو...؟' ڈیڈ کی الٹ بانسی۔لیکن بڑے مضطرب نہیں ہوا۔

'محلّے میں اور بھی بوڑھے ہیں...'

'ہاں سچ مچ...وہ بوڑھے ہیں...'

'ڈیڈ آپ...'

'ٹھیک ہے...'

اس رات سانس کی بیماری نے زور پکڑ لیا تھا۔ڈیڈ پوری رات نہیں سو سکے۔پوری رات ایک ایک فرد، ایک ایک پیر پر کھڑا رہا۔بڑی تیل گرم کر کر کے مالش کرتی رہی، چھوٹی اِنہیلر کی پچکاری دیتی رہی، بڑے پیٹھ دباتا رہا، چھوٹے چھاتی سہلاتا رہا، سانس لینے میں کافی دشواری...سونو گہری سانسیں چھوڑتا رہا... پلنگ سے نیچے پیر لٹکائے، دونوں ہاتھوں کو بستر پر ٹکائے، اکھڑی اکھڑی سانسوں کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے ڈیڈ...رات کے آخری پہر میں ڈیڈ کی آنکھ لگ گئی، پھر نہیں کھلی۔

اے پی شرما...انردھ پرساد شرما یعنی ڈیڈ نہیں رہے۔نہیں رہے تو 'شرما ولا' میں بہت ساری حرکتیں بھی نہیں رہیں۔ڈیڈ کے سبب ایک ایک کی، جو جسمانی اور ذہنی مصروفیت بنی رہتی تھی، اس سے ایک ایک کو نجات پانے جیسا احساس ہونے لگا۔ایک ٹھہراؤ...سکون جیسا کچھ محسوس ہونے لگا۔سر پر سے کوئی وزنی سی چیز ہٹ جانے سا لگنے لگا۔ذہن کو آرام کا سا گمان ہونے لگا۔پرسکون، آرام دہ صبح اور اسی طرح کی رات۔بڑے اور بڑی، چھوٹے اور

چھوٹی اپنے اپنے کاموں میں، اپنی اپنی مصروفیت میں...

اس دن...اس وقت... بڑی کچن سے نکلی، چھوٹی اپنے کمرے سے... بڑے چھت پر سے بھاگا، چھوٹے برآمدہ سے...

سب ایک ساتھ ڈیڈ کے کمرے میں تھے۔

ڈیڈ کی آواز سنائی دی تھی۔

بڑے، میرا ہیٹ کہاں ہے؟

چھوٹی، ایک کپ چائے دینا۔

بڑی، جوشاندہ کا کیا ہوا؟

چھوٹے، میرا جوتا صاف ہوا کہ نہیں؟

ڈیڈ کا بستر ...ڈیڈ جس پر بیٹھے ہوتے تھے، خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا، سب کی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بڑے دھم سے ڈیڈ کے بستر پر بیٹھ گیا۔ ہتھیلیوں سے چہرہ ڈھک کر پھپھک پڑا۔

'بہت تنگ کرتے ہیں بڑھو...'

میں، وہ اور جہانوی

الارم کی گھنٹی بجتی ہے اور میری نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ صبح کے ٹھیک پانچ بجے ہیں۔ ہلکی سردیوں کے دن۔ کمرے کا ماحول ہلکا گرم اور ہلکا نشیلا۔ بستر چھوڑنے کی رتی برابر خواہش نہیں ہو رہی ہے۔ صبح کا بستر کچھ زیادہ ہی راس آتا ہے بدن کو۔ اس کے ہاتھوں کی نرم اور سبک تھپکیاں میرے جاگے ہوئے بدن کا جتن کرتی ہیں۔ جسم کے پور پور میں اُداس رات کا خمار بھرا ہوا ہے۔ جیسے میری پلکوں پر کوئی اپنی ہتھیلی کے چھور سے پنکھے رکھ رہا ہو۔ کھلنے کا نام نہیں لے رہیں۔ ہٹھیلے بچے کی طرح کروٹ بدل کر سیدھی لیٹ جاتی ہوں۔ چادر میں لپٹے بدن کو اینٹھتی ہوں۔ درد، مایوسی اور تھکان سے بھری اندر کی گانٹھیں پٹ پٹ کھلنے لگتی ہیں۔ صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ۔ بارہ بجے تک مشین بنی میں ترومہتا، جب بستر پر گرتی ہوں تو نیند میں بھی سب کچھ اوپر تلے ہوتا محسوس کرتی ہوں۔

کھلتی بند ہوتی آنکھوں کو زور لگا کر کھلا رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ دماغ میں جیسے خلا سا بھرا ہے۔ گردن گھماتی ہوں، دیکھتی ہوں، باپ بیٹی گہری نیند میں ہیں۔ رات میں ٹی وی پر 'پرفیکٹ برائڈ' پروگرام دیکھتے دیکھتے جو سوئے ہیں تو الارم کی گھنٹی بھی انہیں نہیں جگا سکی

ہے۔ ویسے بھی جس چیز کا، جس کسی سے سیدھا تعلق ہوتا ہے، وہ اسے ہی متاثر کرتی ہے۔ گھڑی کے الارم کا تعلق مجھ سے ہے، اس لیے صرف میں ہی متاثر ہوتی ہوں۔ اس کی سخت آواز صرف مجھے ہی جگاتی ہے۔

آرو پیارا لگ رہا ہے۔ سوتے ہوئے وہ اکثر پرکشش لگتا ہے اور ہمیشہ ہی کھینچتا ہے اپنی طرف۔ اسے دیکھتے ہوئے لمبی سانس کھینچتی ہوں، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے لمبی سانس کھینچتی ہوں۔ خود کو دیکھتے ہوئے، خود کے بارے میں سوچتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں کھینچتی ہوں۔ جو تاثر پیدا ہو رہا ہے، وہ تأسف کا نہیں ہے۔ نہ اپنے لیے، نہ اس کے لیے۔ ہمدردی کا ہے۔ اپنے لیے بھی، اس کے لیے بھی۔

دونوں کی نیچے تک سرک آئی چادر کو ٹھیک کر کے بستر سے نیچے آجاتی ہوں۔ پورے کھلے منہ والی جمائی لیتی ہوں اور کچن کی طرف بڑھ جاتی ہوں۔

ساس پین میں چائے کھول رہی ہے۔ پورا کھولاتی ہوں، رنگ گاڑھا اور سواد تیکھا ہونے تک۔ پیالے میں چائے انڈیل کر باتھ روم میں گھس جاتی ہوں۔ برش کرنے کے بعد فوراً میرے ہونٹوں کو گرم پیالے کی تپش محسوس ہونی چاہیے۔ ذرا سی بھی دیر ہوئی، پورا دن سُست ہو جاتا ہے میرا۔

چائے کا پہلا گھونٹ، پوری رات کی غنودگی اور جمود کو تحلیل کر دیتا ہے۔ رگوں میں حرارت دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ خون کی گردش تیز ہوتے ہی دل و دماغ فعال ہونے لگتے ہیں... اور ساتھ ہی میں بھی حرکت میں آجاتی ہوں۔

آرو کو آٹھ بجے آفس کے لیے نکلنا ہوتا ہے۔ میں نو بجے نکلتی ہوں۔ جہانوی کا اسکول بھی نو بجے سے ہے۔ اسے اسکول چھوڑتے ہوئے میں آفس چلی جاتی ہوں۔ اس سے پہلے سب کے لیے بریک فاسٹ اور سب کے لیے لنچ۔ کیا چھوٹا، کیا بڑا۔ باہر کا کھانا

سب کے لیے منع ہے۔ باہر کا کھانا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا۔

میں نے سبزی چڑھا دی ہے۔ آلو اور مٹر کی۔ آرو کو اچھی لگتی ہے۔ جہانوی بھی کھا لیتی ہے۔ بس تھوڑی تیکھی کم ہونی چاہیے۔ ناشتے میں بریڈ پکوڑا، بریڈ بٹر یا آلو کے پراٹھے۔ کچھ میٹھا، گاجر کا حلوہ یا کھیر وغیرہ ہو تو مزہ آجاتا ہے باپ بیٹی کو، اور شاید مجھے بھی۔ اس طرح کی جھنجھٹ والی چیزیں رات میں ہی بنا کر فریج میں ڈال دیتی ہوں۔ صبح میں وقت اتنا کم ملتا ہے کہ سبزی وغیرہ بھی رات میں ہی کاٹ چھیل کے رکھ لیتی ہوں۔

آرو سات بجے سو کر اٹھتا ہے۔ جب تک وہ تیار ہوتا ہے، میں اس کا بریک فاسٹ اور لنچ باکس تیار کر دیتی ہوں۔ اس کے آفس جانے کے بعد اسکول کے لیے جہانوی کو تیار کرنے میں لگ جاتی ہوں۔ جہانوی کو تیار کرنا اور اسے ناشتہ کرانا اپنے آپ میں ایک بڑا کام ہوتا ہے۔ اسے کچھ کھلانا تو اتنا مشکل کام ہے کہ...آلو پراٹھا بنا ہو تو کسی اور چیز کے بنانے پر اصرار کرے گی۔ پوہا بناؤ تو کارن فلیکس کے لیے مچل اٹھے گی۔

نو بجے بوا آجاتی ہیں۔ شام تک گھر میں رہتی ہیں۔ اس درمیان دو بجے جہانوی کو اسکول سے لے آتی ہیں۔ لاکھ کوشش کرتی ہوں، وقت پر سب کچھ نپٹا لوں پر رات کی مایوسی ...صبح میں افراتفری مچ ہی جاتی ہے۔ اپنے لیے تو کچھ کر ہی نہیں پاتی۔ بس جلدی جلدی بال وال سمیٹے، چہرے پر کچھ لیپا پوتی کی اور دوڑ پڑے۔ آفس میں سندھیا کئی بار ٹوک چکی ہے۔ ''یار ترو، کچھ اپنا بھی کیئر ویئر کیا کر۔ بستر سے اٹھ کر سیدھی آفس آجاتی ہو۔ کچھ بھی ہو... یہاں پبلک ڈلنگس ہوتی ہے یار...'' شکر ہے، آنند جی کبھی ٹوکا ٹاکی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں، ''عورت ہر روپ میں اچھی لگتی ہے۔ بس اسے دیکھنے والی نظر ہونی چاہیے...'' لیکن آرو... خود کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی ہوں میں....

شام کو آفس سے آتے ہی میں چھت پر آگئی ہوں۔ شاید، یہی کچھ پل میرے

ہوتے ہیں۔ شاید ان ہی کچھ ساعتوں کو میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔ جب میرے آس پاس کوئی نہیں ہوتا، جب میں کسی کے پاس نہیں ہوتی۔ میں صرف اپنے اندر ہوتی ہوں۔ اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوتی ہوں، اپنے کو سن رہی ہوتی ہوں، محسوس کر رہی ہوتی ہوں۔

مغرب کی جانب آسمان کا رنگ سندوریا ہو رہا ہے۔ پورے دن کے سفر سے تھکا تھکا سورج...ڈوبتا سورج، طویل وعریض فلک کے اگلے حصے پر اس طرح آویزاں ہے جیسے کسی چوڑی پیشانی والی بنگالن عورت نے چھوٹی سی سرخ بندی ماتھے پر چپکا لی ہو۔

میرے اندر کچھ کھلنے لگا۔ کئی کئی کھڑکیاں، کئی کئی دروازے۔ میں ہر کھڑکی، ہر دروازہ سے باہر نکلنے لگی ہوں۔ اڑنے لگی ہوں، لامتناہی افق پر اڑ رہی ہوں، اڑتی ہی جا رہی ہوں۔

بوا چائے دے گئی ہیں۔

آسمان جہاں جھکا ہے، ناریل پیڑوں کی جھرمٹ میں، وہاں سے وہ آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا ہے۔ میں ایک اور ہی منظر کو اپنی طرف جست لگا کر آتا دیکھتی ہوں۔ سات سال قبل ایسی ہی ایک شام...اودھ کی شام، جب میں کالج ٹرپ پر تھی، آرو سے ملاقات ہوئی تھی۔

چائے کا پہلا گھونٹ۔ میں آسودہ ہو رہی ہوں۔ سورج کا یہ آخری سفر میرے اندر مسافرت کا سنسار رچ رہا ہے۔ آسودگی کا یہ احساس مجھے حرارت اور توانائی سے بھر رہا ہے۔

پہلی ہی ملاقات میں شاید دل نے ایک دوسرے کو قبول کر لیا تھا۔ آرو کا کوئی تھا نہیں، اسے کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میری اماں تھی، پتاجی تھے۔ مجھے صرف اماں سے فیصلہ کن لہجہ میں کہنا پڑا تھا، ”نا...نو...اگر...مگر...کا ٹریڈیشنل سانگ مجھے نہیں سننا۔“

پتاجی تو ویسے بھی کچھ نہیں بولتے تھے۔ اماں کو کچھ بولنا تھا، پر بولیں صرف اتنا ہی،

وہی اپنا پرانا تکیہ کلام...ار...رے...کاٹھ کی ہانڈی....۔

ہم نے شادی کر لی تھی۔

فضا شانت ہوتی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں جیسے سب کچھ ٹھہر جائے گا۔ منزل کی طرف بڑھ رہے سورج کے بوجھل قدم اب دکھائی دینے لگے ہیں۔

ڈوبتا سورج اور اس وقت کی خاموشی مجھے ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔ بچپن سے ہی، ایک عادت سی بن گئی ہے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھنا۔ آٹھ کلاس تک میں گاؤں میں تھی۔ عمر رہی ہوگی، بارہ، تیرہ۔ اپنے گاؤں آنے والے راستے میں کھرنجا بچھی سڑک ہوا کرتی تھی جس کی دونوں طرف دور دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جن میں برسات کے دنوں میں دھان اور سردیوں میں سرسوں لہراتی تھی۔ درمیان میں سڑک اور کھیتوں سے لگی بیری کی ایک بغیا پڑتی تھی۔ کمیش کے ساتھ بغیا میں گھس کر گلہری اور سگوں کے جھوٹے بیر کھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ گلہری اور سگے انہی بیروں کو کترا کرتے تھے جو میٹھے ہوتے تھے۔ لیکن جو چیز سب سے زیادہ مجھے مدہوش کرتی تھی، وہ تھا میرے گاؤں کے ماتھے پر دمکتا اور ڈوبتا سورج۔ اسکول سے چھوٹنے کے بعد کھرنجا بچھی ہوئی اس لمبی سڑک کی دُوری طے کرتے ہوئے اکثر شام کجرا جایا کرتی تھی اور مٹ میلے، سرمئی دھند لکے کے بیچ سورج ٹھیک میرے گاؤں کے اندر سماتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

سندھیا اپنے نام کی طرح سوچتی ہے یا پھر اماں کی طرح کہتی ہے، ڈوبتا سورج منفی سوچ کی علامت ہے۔ ان سب باتوں کو میں اس لیے نہیں قبول کر سکتی کیوں کہ منفی مثبت میں مجھے یقین نہیں ہوتا۔ ایسی چیزوں کو تسلیم کرنے میں مجھے ہمیشہ تردد ہوتا اور اگر سندھیا درست بھی ہے، تو بھی...میرے ساتھ کا معاملہ تو بالکل اس کے برعکس ہے۔

بچپن کا وہ ڈوبتا سورج 'صرف ایک سورج نہیں تھا۔ گہری خاموشی اور سناٹوں کے

بیچ اس ڈوبتے سورج نے میری سوچ، میرے خیالوں کو پر دیے، اڑان دی۔ اس نے اس حسِ باطنی کو جھکجھورا جسے میں جانتی تک نہیں تھی اور اس نے میرے ادراک کو جلا بخشی۔ میرے اندر کویتا، کہانی، سنگیت، رنگ نہ جانے کیا کیا پیدا کیے۔ جیسے اس ڈوبتے سورج نے مجھ سے میرا تعارف کرایا، میری پہچان کرائی۔ میں نے دیکھا، میں جتنی باہر تھی، اس سے کہیں زیادہ اپنے اندر تھی۔

جس دن اسکول نہیں جانا ہوتا یا چھٹیاں ہوتیں، میں کمیش کو پکڑ کھرنجا پچھی اس سڑک پر نکل جاتی۔ گہری خاموشی میں ڈوبتے سورج کو دیکھتی۔ اماں کو میرا بدلا ہوا رویہ، میری بولی بانی اچھی نہ لگتی۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی تو بہت تھیں پر بول پاتی تھیں صرف اتنا ہی..ار...رے...کاٹھ کی ہانڈی....

آگے کی پڑھائی شہر میں ہوئی۔ پتا جی کا شہر میں ٹھیکہ داری کا کام چل نکلا۔ انہوں نے گاؤں کی کھیتی باڑی بیچ باچ کر شہر میں مکان بنوالیا۔ اونچے اونچے پکے مکانوں کے پیچھے، سورج یہاں بھی ڈوبتا تھا۔

بوا گرم شال رکھ گئی ہیں بدن پر۔ شہر گاؤں سے کتنا پیچھے ہے، اس کا اندازہ سندھیا سے ملنے کے بعد ہوا۔ آفس کا لنچ اسی کی سنگت میں ہوتا۔

''کچھ چیزوں، کچھ قدروں کو ہم خود سے الگ نہیں کر سکتے ترومہتا...''

''کیوں نہیں کر سکتے؟ میں یہی جاننا چاہتی ہوں۔ یہی پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم خود کچھ قدروں سے رہائی پانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہیں نوچ کر پھینک نہیں پاتے...''

''شاید تم یہی سوچ سکتی ہو، جو ٹھیک بھی ہے...''

''سندھیا...سندھیا...''

ناریل کے پیڑوں کی جھرمٹ کے پیچھے سارا منظر شانت ہونے لگا ہے۔ سب کچھ ہلکا سرخ، چمکیلے بادامی رنگوں جیسا پھیل گیا ہے۔

آرو اچھا انسان ہے۔ گرین انرجی کے علاقے میں کام کرنے والی ایک کمپنی میں کاربن کو کم کرنے والے ریسرچ ورک سے جڑا ہے۔ بیک گراؤنڈ انوارمنٹ سائنس ہونے کی وجہ سے کسی بھی چیز کا باریک تجزیہ کرنے والا اور ایک مدلل شخص ہے۔

شادی کے دو سال بعد جہانوی ہوئی تھی۔

دل و دماغ کو ولولوں سے بھر دینے والا لمحہ۔ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے، پہلے ایک چوتھائی، پھر آدھا اور پھر اس کے بعد پورا کا پورا سورج غائب ہو گیا ہے۔ ایک عجیب سا، گہرا سکوت۔ کوئی ہلچل نہیں۔ کوئی شور، کوئی حرکت نہیں۔ سب کچھ ایک دم ٹھہرا ہوا۔ میرے اندر بھی سب کچھ شانت، جیسے جوار اٹھنے کے بعد سمندر۔ آسودگی کا عروج، جیسے اب اس کے بعد کچھ بھی نہیں... صرف خلا... خلا... بے رنگ... بے حرکت...

ہمارے جذبات ہمیشہ التفات کے آرزومند رہتے ہیں اور نظر انداز کیے جانے سے مجروح ہوتے ہیں۔ اماں سوتیلی ماں نہیں سگی ماں تھیں مگر کمیش کو تھن سے تازہ نکلا گرم سا دودھ دیتی تھیں اور مجھے پانی ملایا ہوا۔ کیوں؟ کیوں کہ بھیا جگ اُجیارا تھا۔ نام و نسب کو روشن رکھنے والا۔

جذبوں کو متواتر نظر انداز کیا جائے تو وہ احتجاج میں شعلہ رو ہو جاتے ہیں۔ پریمی سے، وہ بھی غیر برادری والے پریمی سے شادی بھی شاید ایسے ہی ہتک آمیز حالات کا نتیجہ تھی۔ پریم کو پانا زندگی کا بڑا حاصل ہے لیکن اس کو شاداب رکھنا اس سے بھی بڑا حاصل ہوتا ہے۔ محبت اپنے تقاضے کچھ الگ طرح سے تراشتی ہے۔

ابھی کچھ دیر میں یہاں چھت پر رہوں گی۔ ہلکا دھندلکا چھانے تک یا پھر آرو کے

آفس سے آنے تک۔ اس بیچ ہو سکتا ہے، بوا سے ایک پیالا اور چائے کے لیے کہوں یا پھر وہ خود ہی دے جائیں۔

آرو کی چھت پر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں سورج ناریل کے پیڑوں کی جھرمٹ کے پیچھے ڈوبتا ہے۔ جس طرح گاؤں میں ڈوبتا تھا، جس طرح ہمارے شہر والے نئے مکان میں ڈوبتا تھا، اس سے کہیں زیادہ دلکشی اور وقار کے ساتھ آرو کی چھت پر ڈوبتا تھا۔

یہ روز کا معمول ہے۔ آفس سے آنے کے بعد میں سیدھی چھت پر آجاتی ہوں۔ اس وقت جہانوی ٹیوشن پڑھ رہی ہوتی ہے۔ آرو سات بجے تک آفس سے لوٹتا ہے۔ پوری رات اپنے آپ سے اور اگلا پورا دن اندھکار بھری مایوسی سے لڑتے گزرتا ہے، اس کے لیے اس مختصر وقفے میں خود کو تیار کرنا ہوتا ہے مجھے۔ بوا یہیں چائے دے جاتی ہیں۔ کبھی کبھی چائے کے ساتھ گرم گرم پکوڑے یا بھجیہ بھی۔ چائے اور پکوڑے کے ساتھ ڈوبتے سورج کو نہارنا... کوئی تصور نہیں کر سکتا، میں کس جہان کی سیر پر نکل جاتی ہوں۔

رات کے سوا گیارہ ہونے والے ہیں۔ جہانوی سو چکی ہے۔ آرو جاگ رہا ہے۔ ٹی وی دیکھ رہا ہے۔ آرو کی شرٹ اور جہانوی کا اسکول ڈریس پریس کرنے کے بعد مجھے بھی فرصت مل گئی ہے۔ تھکان سے اب کھڑا بھی ہو پانا مشکل ہو رہا ہے۔ کچن اور باتھ روم کا دروازہ بند کر کے گر گئی ہوں بستر پر۔

بغل میں جہانوی ہے، اس کے بعد آرو۔ ابھی جہاں جہانوی ہے، پہلے وہاں آرو ہوا کرتا تھا۔ جہانوی کے ہونے کے بعد تک آرو کی جگہ نہیں بدلی تھی۔ اس کی ایک طرف میں، دوسری طرف جہانوی ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی ایک بانہہ پر میرا سر اور دوسری بانہہ پر جہانوی کا سر ہوتا تھا۔ اس کی کروٹ لے کر سونے کی عادت تقریباً چھوٹ گئی تھی۔ اسے یوں

بھی کہا جا سکتا ہے کہ آرو کی پوری دنیا اس کی بانہوں میں ہوتی تھی۔ اور میری...تو میری ہی کیا، ایسی راتیں کسی بھی عورت کے لیے زندگی کی عظیم راتیں ہوتی ہیں...

تھکان ہونے کے باوجود نیند نہیں آ رہی۔ اٹھتی ہوں، لائٹ آف کر نائٹ بلب جلا دیتی ہوں۔ ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی ہے کمرے میں۔

آرو چوڑے سینے اور لمبی بانہوں والا مرد ہے۔ میں اس کے سینے تک آ پاتی ہوں۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی واضح طور پر سنائی دیتی ہے کہ ایک ایک کر کے گن لوں۔ لیکن جب اس کی بانہوں کا دائرہ تنگ ہوتا ہے تو مچھلی کی طرح چھٹپٹانے لگتی ہوں۔ میرا مچھلی کی طرح چھٹپٹانا، اس کے لیے سنسار کا سب سے بڑا سکھ ہوتا ہے۔ قہقہہ لگا کر ایسے ہنستا ہے... ہنستا تھا جیسے...

ایک دن اس نے کہا تھا، 'تم موٹی ہو گئی ہو...' اس کے کہنے پر خود کو دیکھا تو دنگ رہ گئی تھی۔ جہانوی کے ہونے کے بعد غیر متوقع طور پر مجھ میں تبدیلی آ گئی تھی۔ آگے سے پیٹ، پیچھے سے کولہوں کی پیمائش بڑھ گئی تھی۔ سچ، اپنی ہی نظر میں بھدّی لگ رہی تھی میں۔ دو سالوں تک جہانوی کو فیڈِنگ کرانے کے سبب ڈھیلی بھی ہو گئی تھی...

لوگ کہتے ہیں کہ محبت بے لوث ہوتی ہے۔ اس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ محبت وہ جانور ہے، جو جسم کی رسی کے بنا بندھ ہی نہیں سکتا۔ جیسے، میرا جسم اب آرو کو، اس کی محبت کو باندھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا تھا اور مایوسی سے بھرتا جا رہا تھا۔ پھر ایک دن، 'جہانوی آئسولیٹ ہوتی ہے کنارے...' کہہ کر اس نے جہانوی کو بیچ میں کر دیا تھا اور خود کنارے ہو گیا تھا۔

چلو، کوئی بات نہیں... بچے کو ماں باپ دونوں کی قربت ملنی چاہیے...سوچ کر خود سے ہمدردی دکھائی تھی میں نے۔ اندر ماں تھی اس لیے بیوی کو زیادہ راگ الاپ کا موقع

نہیں مل سکا...

ٹی وی دیکھتے دیکھتے آرو سو گیا ہے۔ دیکھ رہی ہوں اسے۔ کتنی معصومیت ہے اس کے چہرہ پر۔ خاص کر اوپر کی جانب اُلٹا ہوا اس کا اوپری ہونٹ بڑا اقا تلانہ ہے۔

جسم جب بولتا ہے تو گونگا بنا دیتا ہے، من جب بولتا ہے تو زبان دراز کر دیتا ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ یاد ہی نہیں، کتنی ہی راتیں بیت گئی تھیں بدن کے کپڑے اتار کر ہمیں ہوسناک ہوئے۔ شاید میری ہی خواہش نہیں جاگی... پر ایا سکھ...

کتنی کوشش تو کی میں نے۔ سنترے کے چھلکے سکھا سکھا کر چھاتیوں پر اس کے پاؤڈر کا لیپ لگایا تا کہ کساؤ آجائے اور دلکشی بھر جائے... کتنی فاسٹنگ ڈائٹنگ کی کہ تھل تھلا پن دور ہو... پر میرے لیے سب بے کار... نہیں، میرے لیے نہیں، آرو کے لیے۔

وہ اُداس رہنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑا ردّ عمل دینے لگا تھا اور...

میں نے آرو سے کہا تھا، 'تم چاہو تو کسی سے عشق کر سکتے ہو، تمہاری لائف میں کچھ اور چاہیے... کچھ اچھا... تازہ... کچھ تمہارے حساب سے...

وہ ہنس کر رہ گیا تھا۔ کبھی کبھی کسی کی ہنسی بھی بے معنی لگتی ہے۔ آرو بھی ایسے ہی ہنسا تھا۔ لگا تھا، جیسے صرف ہنسنے کے لیے ہنسا ہو۔

سندھیا نے سخت احتجاج کیا تھا۔ 'آخر تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟ آخر ایسا کیسے ہو سکتا ہے تمہارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہی ہو...؟'

سچ مچ مجھے نہیں پتا تھا، میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں صرف اتنا سوچ پا رہی تھی کہ جس کا جو حق ہے... نہیں، اسے بھی میں ٹھیک طرح سے نہیں سوچ پا رہی تھی، بالکل ہی نہیں سوچ پا رہی تھی۔ جب سوچ پانے میں انسان مجبور ہو جاتا ہے تو غیر متوقع طور پر اس کے سامنے کئی کئی راستے نمودار ہونے لگتے ہیں۔

آرو کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا ہے۔اس کی دائیں بانہہ کھلی ہوئی ہے۔ وہی بانہہ جو میری پناہ گاہ تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ جہانوی کو کھِسکا کر اپنی جگہ پر کرتی ہوں۔

''سو گئے...؟'' اسے ہلاتی ہوں اس کی بغل میں آ کر۔اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود پر جھکے میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے پیار کرنے کے لیے کسی جواز کی تلاش کر رہا ہے وہ...شاید... یا پھر سچ مچ...

عورت مرد کو اسی وقت پڑھتی ہے، جب وہ خود کتاب کی طرح کھلی ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کھوج رہا ہے وہ مجھ میں۔ چھاتیوں کو ایسے کچل مسل رہا ہے جیسے نچوڑ کر نکال لے گا، اپنا من چاہا۔ اسے اپنے اندر سما لینے کے لیے میں نے بھی کھول دیا ہے خود کو پورا کا پورا۔ اس کا جسم سانسوں کی پھنکار سے زاویے بدل رہا ہے۔

قدرت نے عورت کو جس روپ میں رچا ہے اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سپردگی کو دیر سے اور فاصلے کو جلدی بھانپ لیتی ہے۔ آرو مجھ میں کہیں ہے ہی نہیں۔ جیسے میں کسی پرائے سے پرایا سکھ لے رہی ہوں۔ جسم تو گونگا ہو گیا تھا، پر من کی زبان دراز ہو گئی ہے۔

میری آنکھیں کھلی ہیں۔ دیر تک کھلی رہیں۔ الارم کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔ صبح کے پانچ بج گئے ہیں۔

مختلف مثبت منفی واقعات پر مبنی دن اور رات، رات اور دن کا سلسلہ جاری ہے...

ایک دن اسکول جاتے وقت جہانوی کہہ رہی ہے۔

''ممی، اب آپ اپنا لنچ باکس کیوں نہیں لے جاتیں، باہر کا کھانا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوتا...''

پہلا گناہ

ناظرہ بی کے کوٹھے پر جشن کا ماحول ہے۔

عموماً کوٹھوں پر اس طرح کے جشن کے دو مواقع ہوتے ہیں۔ ایک جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے، دوسرے جب وہ لڑکی سن بلوغت کو پہنچ کر پہلی بار کپڑے کا استعمال کرتی ہے۔ کوٹھوں کی تہذیب میں یہ دونوں مواقع بڑی پاسداری اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

آج ناظرہ بی کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی ثریا جان پہلی بار اپنے فطری بہاؤ سے پاک ہوئی ہے۔ یہ کسی مژدۂ جانفزا سے کم نہیں۔ ناظرہ بی کے ساتھ ساتھ اس کی تینوں لڑکیاں مہک، فلک اور عنبر خوشی اور ولولوں سے بھر اُٹھی ہیں۔ اس موقع پر شام کو چراغاں ہونا ہے۔ پورے کوٹھے کو جھاڑ فانوس سے آراستہ کیا گیا ہے۔ محرابوں اور کھڑکیوں پر لچھے دار چمکیلی پنیتوں کی لڑیاں ڈالی گئی ہیں۔ صحن میں ڈھولک کی تھاپ پر لڑکیاں گانا بجانا کر رہی ہیں، رقص کر رہی ہیں۔

آج شام ثریا جان کی نتھ اترے گی۔ آج سے وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کی طرح رنڈیوں کی جماعت میں باضابطہ شامل ہو جائے گی۔ وہ کوئی خوش بخت ہی ہوگا جو شام کو اُس

وقت کوٹھے پر آئے گا جب ناظرہ بی ثریا جان کی نظریں اتار چکی ہوگی۔ اسے شگن کا میٹھا پلاؤ کھلا چکی ہوگی۔ اسے اپنا مخصوص درس دے چکی ہوگی۔ جب کسی لڑکی کو آج کے دن کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس میں یہ رسومات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ناظرہ بی کی اپنی مرتب کردہ رسمیں ہیں۔ لڑکی کو پہلے خوشبودار پانی سے نہلایا جاتا ہے۔ بعدازاں اس کا بناؤ سنگار کیا جاتا ہے۔ ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد ناظرہ بی اس کی نظریں اتارتی ہے، اس کی بلائیں لیتی ہے، اس کی کامیاب زندگی کی دعائیں دیتی ہے اور اسے میٹھا پلاؤ کھلاتی ہے۔ اس کے بعد سب سے اہم رسم ہوتی ہے، درس دینے کی۔ ناظرہ بی لڑکی کو دنیاداری سمجھاتی ہے، زمانے کی اونچ نیچ بتاتی ہے، پیشے کی باریکیاں ذہن نشیں کراتی ہے جس میں خاص طور پر یہ تنبیہ شامل ہوتی ہے کہ 'لگام ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رہے۔'

ان سب مراحل کے پورا ہونے کے درمیان جو شخص وہاں پہنچتا ہے، اسے لڑکی کے کمرے میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ناظرہ بی کو اپنی چاروں لڑکیوں پر ناز ہے۔ یہ لڑکیاں دریافت نہیں اس کی اپنی کاوش ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کسی کو کسی سے کم تر نہیں کہا جا سکتا۔ بے پناہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مردوں کو زیر کر دینے میں ماہر۔ ناظرہ بی کی لڑائی اب صرف ناظرہ بی کی لڑائی نہیں رہ گئی تھی۔ بیٹیوں نے اسے جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک ذرا ثریا جان کے معاملہ میں وہ مطمئن نہیں ہو پاتی۔ مشکوک رہا کرتی ہے کہ اس کے مزاج کی ندرت اس کی سمجھ سے باہر ہے لیکن آج... آج ناظرہ بی کو لاحق تمام وسوسوں، اوہاموں سے نجات مل جائے گی۔ شش و پنج دور ہو جائے گا۔ خدشہ مٹ جائے گا۔ ذہن و دل پر جو ایک نامعلوم سا بوجھ مسلّط رہتا ہے، اس سے گلو خلاصی حاصل ہو جائے گی۔

صحن کے تخت پر گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی، پیتل کی دستی والے سروتا جو اُسے بے حد

پسند ہے اور جو ہمیشہ اس کے پاس رہتا ہے، سے چھالیہ کترتی ناظرہ بی کی آنکھوں میں قدرے آسودگی اور اطمینان کے تاثرات ہیں۔ آج وہ اپنے آخری فرض سے سبک دوش ہونے جا رہی ہے۔ اس سے زیادہ فخر کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ اپنے جیتے جی اپنی چاروں لڑکیوں کا گھر بسا ہوا دیکھے۔

ناظرہ بی نے گہری سانس خارج کی۔ اللہ اللہ کر کے ثریا جان کی نتھ اتر جائے اور وہ روزہ نماز کرے۔

ناظرہ بی نے اس کوٹھے کو کوٹھا بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتی، مرد بھی نامراد کیسا احمق ہوتا ہے۔ اپنے ہی کمزور ہتھیار سے قتل ہو جاتا ہے اور اسے علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری انانیت اُس کے اندر گھس جاتی ہے۔ ناظرہ بی کو یاد آتا ہے جب وہ بھا گلپور کے دنگا کے بعد یہاں لائی گئی تھی۔ اس وقت یہ ٹالیوں کی چھپر اور گندے پردوں والا ایک غلیظ چکلا تھا جہاں محض دو لڑکیاں ہوا کرتی تھیں جن کی چھاتیاں کدو کی طرح ان کے پیٹ پیٹ تک لٹک آئی تھیں اور گال گلابی رنگ کے پاوڈر تھوپنے کے باوجود ادھڑے ہوئے پلستر سے جان پڑتے تھے۔ چکلے کی ایک مالکن تھی امینہ بائی۔ عمر کوئی پچاس کے اوپر۔ دمے کی مریض تھی۔ ہر دم انہیلر کی پچکاری منہ میں مارتی رہتی۔ اور ایک تھے شبو میاں جو اس چکلے کی مالکن کی عمر کی بہ نسبت تھے تو کم سن لیکن اس کے نام نہاد خاوند ہوتے تھے۔ ایک تو آم کی کھٹائی سی سوکھی، پلپلی ان لڑکیوں میں خاطر خواہ دم نہ تھا، دوسرے مالکن کی دمے کی بیماری۔ کون آتا ایڈز کے ساتھ دمہ مستعار لینے۔ لیکن ناظرہ بی کے آتے ہی چکلے کے مردہ جسم میں جان آ گئی تھی۔ حسین تو تھی ہی بلا کی، جسمانی ساخت بھی ایسی کہ درجنوں مسافر گزر جائیں اور اس کا کچھ نہ بگڑے۔

جسمانی طور پر کچھ بگڑا بھی نہ تھا لیکن روح... روح پاش پاش ہو گئی تھی اس کی۔

بھاگلپور کے دنگے نے اس کا کیا کچھ نہیں لوٹا تھا۔ گھر بار، اپنے بیگانے، سب کچھ۔ جس گاؤں کی تھی وہاں تو لاشوں پر رونے والا کوئی نہ تھا۔ ایک وہی بچ گئی تھی جانے کیسے۔ ایک وہی ہر کسی کے کٹے، جلے، ٹکڑوں پر روتی پھر رہی تھی۔ لاشوں کو ٹھکانے لگانے جب پولیس آئی تو اسے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اسے اپنے زندہ بچ جانے کی پاداش میں کئی راتیں تھانہ میں گزارنی پڑیں۔ راتیں کیا تھیں، رت جگا تھا۔ ایک آتا، ایک جاتا۔ باری باری... بار بار... جیسے نامرادوں نے کبھی گنگا نہایا ہی نہ ہو۔ یہ تو اسی کا جسم جسیم تھا کہ سالم رہا۔ دوسرے کی تو بوٹی بوٹی یکجا کرنی پڑتی۔ لیکن روح ثابت نہ بچ سکی تھی۔ اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے تھے جب اسے امینہ بائی کے اس چکلا گھر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ امینہ بائی کو اپنے بے نور اور بے وقعت ہو چکے چکلا کے لیے ایک برق صفت جسم کی ضرورت تھی جو اُسے چکا چوند کر دے اور جو اُسے ناظرہ بی کی شکل میں حاصل ہو گیا تھا۔

ایک علاقائی اصطلاح ہے کہ جب رنڈی میں نام درج ہو ہی گیا تو... ناظرہ بی رنڈی بنی اور پکی رنڈی بنی۔ اس نے چکلے کے باہر ایک تختی آویزاں کرائی اور جس پر لکھوایا...

'کوڑے دان کا استعمال کریں۔'

اس کی اس تنبیہ نے مردوں کے تجسس کو جلا بخش دی۔ اس میں کچھ تو خاص ہے جو دیگر رنڈیوں میں نہیں ہوتا۔ ناظرہ بی کی شکل میں نئی لذت سے ہمکنار ہونے کی جستجو نے مردوں کی شہوانی خواہشات کو بھڑکا کر رکھ دیا۔

جوں جوں اُس کے حسن کی شہرت عام ہوئی اور جوں جوں اس کے جسمانی راز لوگوں پر آشکار ہوئے وہ شہرۂ آفاق کا ستارہ بنتی چلی گئی۔ رفتہ رفتہ علاقے کے دیگر چکلا گھروں میں مردنی چھانے لگی اور اس کے چکلا میں جم غفیر ہونے لگی۔ لیکن یہاں یہ امر واضح

ہو جائے کہ مردوں کی نظر التفات کا مرکز یہ چکلا صرف اس لیے نہیں بنا تھا کہ ناظرہ بی حسین تھی اور اس کی جسمانی ساخت غضب کی تھی بلکہ اس کی اصل وجہ تھی اس کے اپنے جسم کے استعمال کا منفرد طریقہ۔

وہاں لذت آمیز عمل کے تمام مراحل روایتی طریقہ کار سے کسی قدر الگ طے کیے جاتے تھے۔ سواری ناظرہ بی کرتی تھی اور لگام اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔ ان اوقات میں وہ بالکل ویسے ہی عمل پیرا ہوتی تھی جیسا کہ مرد۔ ان کے چہرے، سینے اور بازوؤں پر ویسے ہی نشان ثبت ہوتے تھے جیسا کہ ان اعمال سے گزرنے کے بعد عورتوں کے۔ دراصل ناظرہ بی کی مقبولیت میں اس کے اسی وحشیانہ، جارحانہ اور حملہ آور رویہ کا بنیادی دخل تھا۔

شروعات کے دنوں میں جب کوئی مرد الجھن کا شکار بن جاتا تو ناظرہ بی بڑے دل فریب اداؤں کے ساتھ کہتی۔

'آ جا میرے راجہ... خربوز چھری پر گرے یا چھری خربوز پر، کٹنا تو خربوز کو ہی ہوتا ہے...'

اپنی ازلی ذہنیت کے سبب تمام معاملوں کی طرح شہوانی عمل کے دوران بھی مرد اپنے تشخص کو بچائے رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی انانیت کا نفساتی پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی آسودگی اور تسکین کو ہی اولیت دینا چاہتا ہے لیکن اپنے سبقت لے جانے والے خصائل کے باوجود اس کے اندرون میں کہیں نہ کہیں یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ بستر پر وہ عورت سے ایسے عمل کی توقع بھی رکھتا ہے جس پر عام طور پر عورتیں عمل پیرا نہیں ہوتیں۔ یہاں اس کو قدرے احتمال کے ساتھ یہ تبدیلی خوش گوار معلوم پڑتی تھی۔ یہاں وہ اپنی شکست کو بھی سرخم تسلیم کرنے سے نہیں چوکتا تھا کہ اس شکست میں لذت اور آسودگی کا بے کراں سمندر پوشیدہ ہوتا تھا۔

ناظرہ بی...ناظرہ بی تواس کا نمائندہ تھی۔اس کے ان غیر مروج اعمال میں انھیں اپنے داخل میں موجود اسی مبہم توقع کی تعبیر نظر آتی تھی۔لیکن یہ بات صرف ناظرہ بی کے شعور میں پنہاں ہوتی تھی کہ اس دوران اپنے ہاتھوں میں لگام اور مردوں کا حال پست دیکھ کر اس کی اَنا کا پندار کس قدر انگڑائیاں لے رہا ہوتا تھا۔

لڑکیوں نے گانا بجانا بند کر دیا ہے۔غسل خانے میں ثریا جان کو گلاب کے پانی سے نہلایا جا رہا ہے۔لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ کی آواز ناظرہ بی کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔وہ محبت بھری نظروں سے غسل خانے کی جانب دیکھتی ہے اور اضطراب میں سروتا چلانے لگتی ہے۔اس کے باطن میں بے چینی سے بھری ہوک اٹھتی ہے،کیا ثریا جان...؟

'یہ شبو میاں بھی نہ جانے کہاں مر کھپ گئے۔گھنٹہ بھر پہلے سے گئے ہوئے ہیں بڑی الا ئچی لانے کو۔کب پلاؤ تیار ہوگا،کب رسمیں ہوں گی؟'ناظرہ بی بڑبڑائی۔دراصل اپنی بے چینی کو پس پردہ کرنے اور اس مہمل خیال سے اجتناب برتنے کی یہ محض اس کی ایک کوشش تھی۔

شبو میاں آتے ہیں۔بڑے ادب سے بڑی الا ئچی کی پڑیا ناظرہ بی کے ہاتھوں میں تھماتے ہیں۔

'آپ بھی شبو میاں...؟'بات ادھوری رہ جاتی ہے۔پڑیا کھول کر دیکھتے ہی ناظرہ بی کے ترشے ہوئے ابرو تن جاتے ہیں۔

'ارے شبو میاں...آپ بھی سٹھیا گئے ہیں۔آپ سے بڑی الا ئچی منگوایا تھا،یہ کیا اٹھا لائے آپ؟ الا ئچی کے دانے؟ اجی آپ کو بڑی الا ئچی اور الا ئچی کی تمیز ہے کہ نہیں میاں؟'

'اجی ناظرہ بی...اللہ آپ کی خیر کرے،آپ نے ہی تو کہا تھا بڑی الا ئچی لانے کو...

تو لے آئے بڑی بڑی الائچیاں۔اب اس سے بڑی تو نہیں مل رہیں۔کیوں رانی، اس میں کیا قباحت ہوگئی؟ ماشاءاللہ صحت مند دانے تو ہیں۔' جب کبھی وہ مستی میں ہوتے ہیں ناظرہ بی کو رانی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔

ثریا نہا چکی ہے۔ان کی بحث وتکرار کو سن کر لڑکیاں بھی جمع ہوگئی ہیں۔

'ارے میاں... بڑی الائچی، بڑے بڑے الائچی کے دانوں کو نہیں کہتے۔ بڑی الائچی ایک الگ ہی مصالحہ ہوتی ہے۔ جائیے، اسے واپس کر آئیے اور بڑی الائچی لے آئیے۔ بڑی الائچی کہیے گا... بڑی الائچی...' ناظرہ بی نے بڑی الائچی پر زور دے کر انھیں مفصل طور پر سمجھایا۔شبو میاں جھکی کمر کو ہاتھوں سے پکڑے ناظرہ بی کی 'بڑی الائچی' کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔

'بتاؤ تو ذرا... الائچی کے دانے اٹھا لائے۔ان کا کیا کرنا ہمیں؟ ان کی تو صورت سے ہی کراہت ہوتی ہے ہمیں۔' ناظرہ بی نے لڑکیوں کی سمت دیکھ کر کہا۔

'کراہت کیوں ہونے لگی؟' لڑکیوں کو لگا، ان کو کوئی مصالحہ مل گیا ہے۔'اس الائچی کی بھی کوئی کہانی ہے کیا اماں؟'

'اب چھوڑو بھی تم لوگ...' ناظرہ بی چھٹ چھٹ چھالیہ کترنے لگتی ہے۔

'اب ایسے تو نہیں چھٹیں گی اماں۔ بتائیے بتائیے...' پلک نے پلکیں جھپکائیں۔

'اب بتا بھی دیجئے...' اس نے ناظرہ بی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

'ارے اب کیا بتائیں، اس نامراد الائچی کی کہانی؟ اللہ مغفرت فرمائے ابا مرحوم غفور میاں کی۔ جب میں آٹھ سال کی تھی، بڑے ارمان سے مدرسے بھیجا دو چار حروف پڑھ لکھ لینے کو۔ وہاں کا مولبی... مولبی ہی بولتے تھے ہم سب۔ ہر دم دانتوں تلے الائچی کچلتا رہتا تھا اور منہ سے کڑوی باس چھوڑتا رہتا تھا۔ نامراد پڑھاتا کم تھا، ہماری جانگیں زیادہ

سہلایا کرتا تھا۔ چھٹی ہونے پر سارے کے سارے اپنے گھر کو جاتے، ایک ہمیں ہی روک لیتا تھا خاص سبق رٹانے کو۔ اب بتاؤ ذرا تم لوگ، ہم کیا طوطا تھے جو اکیلے میں اس کا سبق رٹتے۔ اس کا منشا تو کچھ اور ہی ہوا کرتا تھا جو مجھ نامراد کو اس وقت سمجھ میں نہ آتا تھا۔

تھوڑی دیر الف اور بے... اب، تے اور بے... تب رٹاتا پھر کہتا، چلو اب کھیلتے ہیں۔ پہلے وہ مجھے اپنی پیٹھ پر چڑھاتا، کہتا: میں اللہ میاں کا گھوڑا ہوں اور تو میری سواری۔ پھر میں اللہ میاں کا گھوڑا... گھوڑی... پتا نہیں، بنتی اور وہ میری سواری۔ آٹھ سال کی عمر، کھیل کود کی ہی تو ہوتی ہے۔ اس کی چارخانے کی لنگی کے نیچے کھونٹی جیسی کوئی سخت چیز تن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور میرے پھولے پھولے چوتڑ میں چبھتی رہتی تھی۔ تب اور اچھا لگتا تھا، پورے بدن میں سہرن سی ہوتی تھی۔ دراصل اس نامراد مولبی کی حرکت سے میرے اندر احساس جاگا کہ لڑکی الگ ہوتی ہے اور لڑکا الگ۔ آخر میں اس کی لنگی گیلی ہو جاتی، جسے اس وقت میں اس کی مُوت نکل آنا سمجھتی تھی۔ وہ غسل خانے میں بھاگ کر سما جاتا تھا۔ لیکن جاتے جاتے قمیص کی بغلی سے الا یچی نکال کر دینا نہیں بھولتا تھا۔ پتا نہیں، نامراد کو الایچی سے ایسی کون سی انسیت تھی، خود بھی کھاتا اور دوسرے کو بھی کھلاتا۔

ادھر ابا دیر تک میرے نہیں لوٹنے پر فکر مند ہوتے۔ ایک دن مدرسہ پہنچ گئے۔ میرے اوپر مولبی کی سواری دیکھ بید کی چھڑی توڑ ڈالی اس نامراد پر۔ گاؤں کے دوسرے جن بھی جمع ہو گئے۔ لات اور گھونسوں کی ایسی برسات ہوئی کہ مولبی کی صورت جلی پچکی روٹی بن گئی۔ سرخ سیاہ چکتوں والی شکل لے کر ایسا بھاگا کہ پھر وہ دن اور آج کا دن، نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد تو ابا نے گھر میں ہی بٹھلا دیا اور استانی لگا دی پڑھانے کو۔ گھر سے باہر تو تب ہی نکلی جب خرم میاں، اللہ ان کو جنت میں محلا دو محلا گھر عطا کرے، بیاہ کر اپنے گھر لے آئے...'

شبو میاں بڑی الایچی لے آئے۔ اس بار وہ بڑی الایچی ہی لائے ہیں۔

'چلولڑکیوں، اب جاؤ...ثریا جان کو بھی تیار کردو۔'

'لیکن اماں، وہ ابا...' لڑکیاں ناظرہ بی سے آگے سننا چاہ رہی ہیں۔

'ارے بھاگو بھی...کتنی بار کہا، بے چارے شریف خرم میاں تم حرام زادیوں کے ابا نہ ہوئے کبھی...'

لڑکیاں کھل کھلاتی ہوئی ثریا جان کے کمرے میں بھاگ گئیں۔

ناظرہ بی کے چکلا گھر آنے کے ایک سال کے اندر ہی اس کی مالکن امینہ بائی کھانستے کھانستے مرگئی تھی اور بعد کے دنوں میں دونوں لڑکیاں بھی کہیں گمنامی کے اندھیرے غار میں دفن ہوگئی تھیں۔ رہ گئے تھے صرف شبو میاں جو آج بھی اپنی جھکی کمر کے ساتھ کوٹھے پر اس کونا سے اس کونا کرتے رہتے ہیں۔ ایک مثل مشہور ہے، رنڈی کے گھر مانڈے اور عاشقوں کے گھر کڑاکے، ناظرہ بی کی جوانی نے دولت کی بارش کردی۔ ایسی برکت اس نے کسی کمائی میں نہ دیکھی تھی۔ ٹالیوں کی کھپریل والا چکلا گھر جلدی ہی آٹھ کمروں اور ایک بڑے صحن والا کوٹھا بن کر تیار ہو گیا تھا۔

اب ناظرہ بی اس کوٹھے کی مالکن تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا لیکن کوٹھے کے بیرونی حصے میں آویزاں تختی وہی پرانی تھی۔ ناظرہ بی کو شدید طور پر اس بات کا احساس تھا کہ سنگھرش لمبا ہے، جس کا سامان اسے پہلے سے ہی کرنا تھا۔ اس خیال کو ترغیب دیتے ہوئے اس نے ایک کے بعد دیگرے کئی بچے پیدا کیے۔ چار کی چار لڑکیاں۔ کوٹھوں پر لڑکیوں کی پیدائش خوش آئند مستقبل کا ضامن ہوتی ہے، یہ چاروں ناظرہ بی کے کوٹھے کا ستون بن گئی تھیں۔

یوں تو کوٹھوں پر پیدا ہونے والوں کے حقیقی باپ کی نشان دہی تردد بھرا کام ہے لیکن اپنی لڑکیوں کی طبیعت کا نادرپن دیکھ کر ناظرہ بی کو ایک اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ اس کی کس لڑکی میں کس نوع کی جبلت کارفرما ہے۔ ان چاروں کے عادات واطوار، سوچ وعمل میں کوئی

مماثلت نہیں۔ جب کبھی بھی وہ ان کی ذات کا محاصرہ کرتی، سب کی ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت پاتی۔

سب سے بڑی والی مہک، اس کے طریق وعمل میں کسی حد تک غاصبانہ سوچ کا دخل ہوتا تھا۔ شام کو جب سب بن ٹھن کر بالکنی پر کھڑی ہوتی ہیں، مردوں کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے وہ انواع واقسام کے ہتھکنڈے آزمانے سے باز نہیں آتی۔ اپنی بہنوں کو مات دینے اور ان کے مستقل گاہکوں کو بھی اپنی جانب کر لینے کا ہر حربہ وہ خوب استعمال کرنا جانتی ہے۔ مستقل مزاجی تو اُسے چھو کر بھی نہیں گزری ہے۔ کہے گی کچھ کرے گی کچھ۔ اتنا ہی نہیں، مردوں سے اس کی دکان چلتی ہے لیکن ایک بار اس کے لٹکوں جھٹکوں سے مرعوب ہو کر مرد اُس کے حسن کے جال میں پھنس جائے پھر تو وہ انہیں ایسے نچاتی ہے جیسے مداری والا بندریاں۔ وہ ان کے جسم سے خون کا ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتی ہے۔ بظاہر اپنے مردوں کو وہ یہ باور کرانے سے نہیں چوکتی کہ اس کی بیوی، بہن اور ماں سب سے زیادہ اس کی خیر خواہ ایک وہی ہے اور ان کے سارے دکھوں کا مداوا اس کی زلفوں کے پیچ وخم ہیں۔ لیکن ان سب کے پس پردہ وہ صرف اور صرف اپنا الّو سیدھا کر رہی ہوتی ہے۔ بڑی بے شرمی سے کہتی ہے؛ 'اللہ نے انہیں ہمارے استعمال کے لیے ہی تو بنایا ہے اماں، چند میٹھے بول بول کر اُن کا پورا ہندوستان لوٹا جا سکتا ہے...'

ناظرہ بی ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جن دنوں مہک پیدا ہوئی تھی ان دنوں.... بہت کوشش کے بعد اس کے سامنے ایک گنجلک سا عکس ابھرتا ہے۔ بختاور حسین.... سیاسی اقتدار کا ایک علاقائی نمائندہ۔ جو اُس کے کوٹھے پر آتا تو تھا رنڈیوں کی ازسرنو بساہٹ کا پروگرام لے کر لیکن اسے رنڈی ہی بنے رہنے کی تلقین کر کے جاتا تھا۔

اس کے بعد والی فلک، مردوں کے تئیں اس کا رویہ منصفانہ کبھی نہیں رہا۔ وہ تو ایک

رنڈی ہے، اسے تو ہر مرد کے تئیں ایماندار اور وضع دار ہونا چاہیے لیکن وہ ان میں بھی امتیاز برتنے میں ماہر ہے۔ کوئی مال دار آسامی ہوا تو وہ اس کی گود میں بیٹھ جائے گی، اسے سہلائے گی۔ اس کے برعکس کوئی پھٹا حال آ گیا تو اس کے ساتھ ایسے پیش آئے گی جیسے اس کا وجود ہی ایک گناہ ہو۔ وہ بے چارہ اس کے جلوۂ حسن کے آگے لاچار، بے بس بنا رہتا ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بالکنی پر کھڑی ہو کر اپنے حسن و جمال کے رعب سے اکثر و بیشتر ایسے ایسوں کو بھی اپنی زلف گرہ گیر میں مقید کر لیتی ہے جن کا کوٹھے اور کوٹھے والیوں سے دور دور کا واسطہ نہیں ہوتا اور جو بے چارے محض اس گلی سے گزرنے کے قصوروار ہوتے ہیں۔ اس کی اپنی ایک اونچی قیمت مقرر ہے باوجود اس کے مردوں کے کپڑے کھونٹی سے ٹنگتے ہی وہ ان کی طرح ان کی جیب کو بھی برہنہ کر دیتی ہے۔ اوروں کو زندگی میں ضابطے کی پابندی کی نصیحت کرنے والی خود اُس کا مطلق پاس نہیں رکھتی۔

ناظرہ بی غور کرتی ہے تو اسے گھنی اور لمبی مونچھوں والا تھانے کے بابو کا چہرہ یاد آتا ہے جو ناظرہ بی کی کمائی میں سے اپنی حصے داری طے کرنے ہفتے کے دن آیا کرتا تھا اور رات بھی وصول کر کے لے جایا کرتا تھا۔

تیسری عنبر، اس کی تو پوچھیے مت۔ جب بھی کوئی مرد اس کے پاس آتا ہے، سب سے پہلے تو وہ اسے جنت اور دوزخ کا فرق سمجھاتی ہے۔ نجات کے لیے اچھے اعمال اور مذہبی ارکان کی اہمیت پر نصیحت کرتی ہے۔ کہتی ہے مذہب ہی آخری سچ ہے بقیہ سب فریب ہے۔ وعظ بیان کرنے کے بعد ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے کہ نیک اعمال، جنت، دوزخ اور نجات کا سارا فلسفہ اندھیرے کمرے کے کسی کونے میں منہ چھپا کر دبک جاتا ہے۔

ناظرہ بی کو یاد آتا ہے، بابا او جسوی رام نے ان دنوں 'معاشرتی مذہبی فلاح و بہبود'

کے عنوان سے کوٹھوں پر جا جا کر معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی آبادیوں کے درمیان وعظ بیان کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انکی تشریف آوری متعدد بار اس کے کوٹھے پر بھی ہوئی تھی۔ ان کی آواز میں مقناطیسی کشش ہوتی تھی۔ ناظرہ بی پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتی لیکن اسے اندازہ ہے کہ ان کی سحر بیانی کا اس پر خاصا اثر ہوا تھا، اتنا کہ عنبر ٹھہر گئی تھی۔

سب سے آخر والی ثریا جان، اس کے متعلق ناظرہ بی کو مبہم ہی سہی لیکن نہ کوئی صورت یاد آتی ہے نہ ہی کوئی قیاس گزرتا ہے۔ اس نے اکثر اپنے حافظہ پر زور دے کر اس شکل وصورت کو یاد کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مادہ ثریا جان کی شہ رگ میں دوڑ رہا تھا لیکن حد درجہ کوشش کے باوجود وہ ناکام رہی تھی۔ اسے صرف اتنا یاد آتا ہے کہ ان دنوں ملک کے حالات بڑے نازک تھے۔ چہار جانب افراتفری، سراسیمگی اور عدم تحفظ کا بول بالا تھا۔ دکانوں میں آگ بک رہی تھی اور سڑکوں پر خون بے قیمت بہہ رہا تھا۔ کیا بچی، کیا جوان اور کیا بوڑھی۔ عزت و ناموس روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہی تھی۔ گلی کوچوں، چوک چوراہوں پر حیوان، درندے، بھیڑیے رقص کر رہے تھے۔ لاغر، بے بس، بے حس اور کسی قدر مصلحت پسند نظام تماشا بین بنا ہوا تھا۔ سب کچھ اس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس کا وجود جیسے درہم برہم ہو کر بکھر چکا تھا۔

دوسری جانب عوام الناس میں شدید غم و غصے کی لہر تھی۔ صبر وضبط اپنی حد تجاوز کر چکا تھا۔ احتجاج کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور تبدیلی کی بہار بہہ رہی تھی، ایسے میں ثریا جان نے اس کی جان کے اندر کروٹ لی تھی۔ اب ایسے متغیر ماحول میں ناظرہ بی کے پاس کون آیا، گیا اس کی تفریق ممکن نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی ثریا جان کے مزاج کے انوکھے پن کو سمجھ نہ پائی اور ہر گھڑی اس کے متعلق بے اطمینانی کا شکار رہتی ہے۔

لڑکیوں نے ثریا جان کو دلہن کی طرح سجا دیا ہے۔ دلہن تو ہے ہی۔ رنڈیاں ایسے ہی دلہن بنتی ہیں۔ سرخ رنگ کے ساٹن کے غرارے اور قمیص میں سر سے پاؤں تک سجی دلہن کو بھی مات دے رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خفیف سی الجھن کے تاثرات ہیں۔ تھوڑا خوف، تھوڑی دہشت، تھوڑا تجسس۔ لڑکیاں اسے چھیڑ رہی ہیں۔ ڈرا رہی ہیں ذرا ذرا۔ ذرا ذرا حوصلہ دے رہی ہیں۔ لڑکیوں نے بھی بناؤ سنگار کر لیا ہے۔ اِترا رہی ہیں ادھر سے ادھر۔ ان کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری ہے جس کا نشانہ گاہے بہ گاہے ناظرہ بی بھی بن رہی ہے۔

'ہائے اماں.. آپ جب دلہن بنی ہوں گی، قیامت ڈھا رہی ہوں گی؟'

'اررر ے... میں تم لوگوں کی طرح دلہن تھوڑے بنی تھی۔ میں تو سچ مچ کی دلہن بنی تھی۔ خرم میاں باضابطہ شیروانی اور سہرہ میں گھوڑی پر سوار ہو کر آئے تھے مجھے لیوا جانے۔ رات میں گھونگھٹ کھولا تو غش کھا گئے۔ دودھ کی جگہ پانی پلانا پڑا۔ لیکن کہا جاتا ہے نا کہ نعمت نصیب والے کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ رات میں گاؤں کی پہرہ داری کا کام تھا ان کا۔ پوری رات جاگتے رہو... جاگتے رہو... کی ہانک لگا کر گاؤں کی رکھوالی کرتے تھے اور ادھر اُن کے اپنے ہی گھر میں ان کے چچازاد بھائی صدن میاں نے سیندھ مار دی۔ وہ دوسروں کے مال کی چوکیداری کرتے رہے، ادھر صدن میاں ان کا مال لوٹتا رہا۔ رات کے جاگے پورا دن سوتے رہتے۔ کبھی کچھ کہنا چاہا تو نیند میں بولتے: 'خاندان کی عزت کا سوال ہے۔' اپنی عزت دے کر خاندان کی عزت بچاتی رہی میں۔

شام ہو چکی ہے۔

کوٹھے پر چراغاں کر دیا گیا ہے۔ رنگین لڑیوں والی بتیاں جگمگا اٹھی ہیں۔ لڑکیوں کے ناچ گانا، چھیڑ چھاڑ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ہنسی ٹھٹھولی بڑھ گئی ہے۔ رسم کی تیاریاں تکمیل کے آخری مرحلے میں ہیں۔ چاندی کی نقاشی دار طشتری میں چاندی کے ورق سے مزین

شگن کا میٹھا پلاؤ لطیف خوشبو بکھیر رہا ہے۔ ذرا دیر بعد ناظرہ بی ثریا کے کمرے میں جائے گی اور اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ میٹھا کرائے گی۔

دریں اثنا ایک نئی بات وقوع پذیر ہوتی ہے۔ شبو میاں اپنی جھکی کمر کے ساتھ صحن میں وارد ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراہ ایک پولیس والا بھی اندر آتا ہے۔

'ناظرہ بی، یہ بندہ پرور کوٹھے کی تلاشی لینے آئے ہیں...'

'شبو میاں، کیا انہیں پتا نہیں، کوٹھوں پر کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہوتا... یہ سب تو شریفوں کے چونچلے ہیں...' ناظرہ بی نے اپنی پرانی اداؤں کے ساتھ کہا۔ 'اگر ان کی خواہش ہو تو ذرا انتظار کر لیں، رسم پوری ہوتے ہی ثریا جان کی نتھ انہیں کے ہاتھوں اتر جائے گی...' اس نے چھالیہ پر سروتا کو دباتے ہوئے کہا۔

'ناظرہ بی اُن کا کہنا ہے کہ شریفوں کے محلے میں کسی نے کسی بچی کے ساتھ... اور وہ بدمعاش بھاگ کر اسی جانب آیا ہے۔'

یہ سن کر ناظرہ بی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکان پھیل گئی۔ اسی مسکان کے ساتھ اس نے کہا۔ 'لے لو تلاشی بابو جی...'

پولیس والے نے کوٹھے کے ایک ایک کمرے کی خوب اچھی طرح تلاشی لی۔ جانے لگا تو ناظرہ بی کی آواز اس کی پشت سے ٹکرائی۔

'اتنی بے رخی اچھی نہیں بابو جی... ہم بدنام لوگوں کی بھی ذرا قدر کر لو... تمہارا غم غلط ہو جائے گا کچھ...' ناظرہ بی نے زور سے قہقہہ لگایا۔

لڑکیاں ثریا جان کے کمرے میں جمع ہو گئی ہیں۔ ثریا جان دلہن کی طرح سمٹی پلنگ پر بیٹھی ہے۔ اترنے والی نتھ اس کی ستواں ناک میں دمک رہی ہے۔ ناظرہ بی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ پلنگ پر اس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے۔ اسے بھرپور نظر سے دیکھتی ہے۔

اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ چاندی کی طشتری سے چاندی کے ورق میں لپٹا اسے میٹھا پلاؤ کھلاتی ہے۔ایک ہزار ایک روپے سے اس کی نظریں اتارتی ہے۔ بلائیں اتار کر انگلیاں چٹکاتی ہے۔ بعد ازاں شروع ہوتا ہے درس کا سلسلہ۔ کچھ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ درس کی رسم بظاہر تو نئی لڑکی کے لیے ہوتی ہے لیکن اس کی تجدید پرانی ساری لڑکیوں کو بھی کرنی ہوتی ہے۔ساری لڑکیاں پورے انہماک کے ساتھ درس سماعت کر رہی ہیں۔

'...بس یہ کہ لگام ہاتھ میں رہے۔' ناظرہ بی کا درس ختم ہوا۔ثریا جان کی پیشانی چوم کر وہ کمرے سے باہر آجاتی ہے۔

رسم پوری ہو چکی ہے۔آنے والے کا انتظار ہونے لگا ہے۔لڑکیاں بھاگ بھاگ کر بالکنی پر جا رہی ہیں۔

وہ آتا ہے۔شاید کوٹھے پر پہلی بار آیا ہے۔اکبکایا ہوا ہے۔اوسان خطا سے ہیں۔ عمر کوئی پچیس برس۔ نام فیروز۔ پوری رات رہے گا۔لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اسے ثریا کے کمرے میں لے جاتی ہیں۔اسے اندر بھیج کر باہر سے دروازہ بھیڑ دیتی ہیں۔

ناظرہ بی دل ہی دل میں مقدس کلمات کا ورد کر رہی ہے۔آخری فرض پورا ہو رہا ہے۔آخری خواب کو تعبیر مل رہی ہے۔ثریا جان رنڈی بن رہی ہے۔اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔ناظرہ بی خوش ہے۔وہ مسرور ہے۔وہ نازاں ہے۔وہ مخدوش ہے....

دفعتاً ثریا جان کے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔فیروز خون سے تر بہ تر جانگیا میں باہر نکلتا ہے۔ہاتھوں سے اپنے اگلے حصے کو پکڑے چیختا چلاّتا باہر بھاگ جاتا ہے۔

ناظرہ بی ہکا بکا دیکھتی ہے۔

دروازے پر ثریا جان کھڑی ہے۔

'تھوکنے کے لیے آخر چوک چوراہوں پر کوڑے دان کس لیے ہے۔ جُو جی کا پانی

گرانے کے لیے اتنا ہی بے تاب تھا تو ہمارے پاس چلا آتا، اس بچی کے ساتھ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی..."

اس کے ہاتھ میں ناظرہ بی کے پیتل کی دستی والا سروتا ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے...

ٹپ...ٹپ...ٹپ....

صغیر رحمانی کی دیگر تصانیف

اردو

1۔	واپسی سے پہلے	(افسانے)	2002ء
2۔	تخم خوں	(ناول)	2016ء
3۔	داڑھی	(افسانے)	2016ء

ہندی

4۔	پرانے گھر کا چاند	(افسانے)	2000ء
5۔	اشیش	(ناول)	2001ء
6۔	جہاد	(افسانے)	2011ء